ع جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اِسلام اور سیاست

مذہب اور سیاست

شریعت و سیاست

مروّجہ سیاست کے شرعی احکام

اسلام میں جمہوریت کا تصوّر

غیر اسلامی حکومت کے شرعی احکام

اسلامی حکومت کا بنیادی اصول شوریٰ

اسلامی مملکت میں حکومت الٰہیہ

ووٹ کی اسلامی حیثیت

ووٹر کی شرعی حیثیت

عورت کی سربراہی

مجموعۂ افادات

حکیم الامت مجدد الملت

حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ

مع رسالہ: حکیم الامت کے سیاسی افکار

از شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہٗ

اِدارہ تالیفاتِ اشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان

(061-4540513-4519240

اسلام اور سیاست

مجموعہ افادات

حکیم الامت مجدد الملت

حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ

و دیگر اکابرین

مع رسالہ

حکیم الامت کے سیاسی افکار

از

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ

ترتیب جدید

محمد اسحٰق ملتانی

مدیر ماہنامہ "محاسن اسلام" ملتان

ادارۂ تالیفات اشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان فون: 4540513-4519240

اسلام اور سیاست

تاریخ اشاعت............ربیع الاوّل ۱۴۲۷ھ
ناشر..............ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان
طباعت..............سلامت اقبال پریس ملتان

قارئین سے گذارش

ادراہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تا کہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاک اللہ

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ....چوک فوارہ....ملتان   مکتبہ رشیدیہ........راجہ بازار........راولپنڈی
ادارہ اسلامیات........انارکلی........لاہور   یونیورسٹی بک ایجنسی....خیبر بازار........پشاور
مکتبہ سید احمد شہید........اردو بازار....لاہور   ادارۃ الانور........نیو ٹاؤن........کراچی نمبر 5
مکتبہ رحمانیہ........اُردو بازار .... لاہور   مکتبہ المنظور الاسلامیہ....جامعہ حسینیہ....علی پور
مکتبہ المنظور الاسلامیہ........بلاک زیڈ........مدینہ ٹاؤن........بنک موڑ........فیصل آباد

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K   119-121- HALLIWELL ROAD
(ISLAMIC BOOKS CENTERE   BOLTON BL1 3NE. (U.K.)

عرض ناشر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم اما بعد!

غیر منقسم ہندوپاک میں انگریزی دورحکومت میں مسلمانوں پر جس طرح علمی وعملی زوال آیا وہ اپنے اندر ایک الگ کربناک داستان لئے ہوئے ہے۔ اس دور میں کچھ ایسی فضا ہموار کی گئی کہ عوام الناس کا تعلق اہل علم حضرات سے دھیرے دھیرے کٹتا گیا۔ اور عوام الناس کی فکری اور تعمیری ذہن پر اسلامی رنگ کے بجائے مغربی سیاہ بادل چھانے لگے۔ جس سے مسلمانوں میں ایسا زبردست فکری انحطاط آیا کہ خود مسلمانوں نے دائرہ اسلام جو کہ معہد سے لے کر لحد تک ساری زندگی پر محیط تھا سمیٹ کر صرف نماز، روزہ تک محدود کرلیا۔ اور وہ شعائر جو مسلمانوں کی دین وتشخص کا نشان تھے بتدریج دھندلے ہوتے چلے گئے۔ جب اس فکری انحطاط کی وجہ سے اسلام کو محدود کردیا گیا تو حکومتی نظام ایسے لوگوں کی وراثت سمجھا جانے لگا جن کو دور دور تک اسلام کی سوجھ بوجھ بھی نہ تھی۔ اور خود مسلمانوں کی اکثریت اس بارہ میں لاعلم تھی کہ اسلام نے حکومتی نظام کے لئے ہمیں کیا لائحہ عمل دیا ہے؟ اس بے فکری ولاعلمی کی بدولت مسلمانوں کی رغبت جمہوریت' سوشلزم اور کیمونزم وغیرہ جیسے لادینی نظام ہائے حکومت کی طرف ہوگئی۔ بالآخر مسلمان بے دست وپا ہوکر جمہوریت کے شکنجے میں اس طرح جکڑے گئے کہ تقسیم کے بعد بھی فرنگی کا دیا ہوا نظام رائج رہا اور اب یہ اتنا راسخ ہوچکا ہے کہ مسلمانوں کیلئے اس کے منفی پہلوؤں کو جانتے ہوئے بھی اس سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل ہورہا ہے۔

موجودہ دور میں ایک دردمند دل رکھنے والے مسلمان کو کیا کرنا چاہئے؟ اور وہ اپنی بساط کی حد تک اپنے حلقہ میں اسلام کے نفاذ کیلئے کیا عملی اقدام کرسکتا ہے؟ اور وہ افراط وتفریط سے بچتے

ہوئے اس لادینی ماحول میں نفاذ اسلام کی جدوجہد میں کس قدر حصہ ڈال سکتا ہے؟ اس جیسے بے شمار سوالات جو ایک مسلمان کے دل میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یا ایک جماعت کو اپنے منشور و دستور کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کس طرح کے لائحہ عمل کی ضرورت ہے؟ یہ اور اس جیسے متعدد ابھرتے ہوئے سوالات کے شافی جواب کیلئے اس کتاب کا مطالعہ سرمہ بصیرت کا کام دے گا۔

اللہ پاک نے حضرت حکیم الامت تھانویؒ سے شریعت و تصوف کا جو عظیم المرتبت اور کثیر النفع کام لیا وہ اہل علم سے مخفی نہیں۔ چونکہ حضرت اقدس کو تفسیر قرآن اور تصوف سے خصوصی شغف تھا اس لئے سیاست و حکومتی نظام پر حضرت نے مستقل قلم نہیں اٹھایا۔ لیکن آپ کی تصانیف، جملہ مواعظ، خطبات و ملفوظات میں اسلام و سیاست کے موضوع پر ایسے شفاف اصول دیکھنے میں آتے ہیں جن پر عمل کر کے مسلمان واقعی مسلمان بن سکتا ہے۔

اللہ پاک جناب مفتی محمد زید صاحب مدظلہ کو جزائے خیر عطا فرمائیں جنہوں نے محنت شاقہ سے حضرت کی تصانیف سے مواد اکٹھا کر کے اس موضوع پر چند کتب ترتیب دیں۔ زیر نظر کتاب ''اسلام اور سیاست'' میں بھی انہی منتخب و مرتب کتب سے عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق نافع مضامین کو ترتیب جدید کے ساتھ طبع کیا گیا ہے۔ اس جدید ترتیب میں جناب برادر مکرم محمد راشد صاحب نے کافی معاونت و مشاورت فرمائی جو کہ یقیناً ان کے لئے باعث ثواب اور ذخیرہ آخرت ثابت ہوگی۔

کتاب کی نافعیت و افادیت کو اجاگر کرنے کے لئے ''حکیم الامت کے سیاسی افکار'' (از مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ) ووٹ کی شرعی حیثیت، غیر اسلامی حکومت کے احکام اور عورت کی سربراہی جیسے اہم علمی مضامین کو بھی مختصر مگر جامع انداز میں شامل کتاب کر لیا گیا ہے۔ تاکہ سیاست کے چیدہ چیدہ مسائل کے بارہ میں مسلمانوں کو صحیح اسلامی تعلیمات کا علم ہو جائے اور اس موضوع پر تشنگی نہ رہے۔

امید واثق ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں میں صحیح اسلامی سوچ پیدا کرنے میں اکسیر کا کام کرے گی اور مسلمانوں کو ان کی راہ عمل کے تعین میں مفید ثابت ہوگی۔

اللہ پاک ہم سب کو اکابر علماء حق کے مسلک اعتدال پر ثابت قدم رکھے۔ آمین۔

والسلام   احقر محمد اسحاق   ربیع الاول ۱۴۲۷ھ

اجمالی فہرست

فہرست مضامین

☆.....☆.....☆.....☆

حکیم الامت کے سیاسی افکار

از حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی

حکیم الامت، مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ سے اللہ تعالیٰ نے دین کے ہر شعبے میں جو عظیم خدمات لیں ان کی نظیر ماضی کی کئی صدیوں میں ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ مسلمانوں کی دینی ضرورت کا شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہو جس پر حضرت حکیم الامت قدس سرہ کا کوئی مفصل یا مختصر کام موجود نہ ہو۔ حضرت کی تصانیف، مواعظ اور ملفوظات اپنے دور کی دینی ضروریات پر مشتمل ہیں، اور زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں دین کی تعلیمات کو انہوں نے کسی نہ کسی شکل سے واضح کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔

اس وقت میرے پیش نظر حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے سیاسی افکار کی تشریح و توضیح ہے۔ اگرچہ حضرت کی شخصیت کسی بھی حیثیت سے کوئی سیاسی شخصیت نہیں تھی اور نہ سیاست آپ کا خصوصی موضوع تھا، لہٰذا آپ کی کوئی تصنیف خالصتاً سیاست کے موضوع پر موجود نہیں ہے، لیکن چونکہ اسلام کے احکام دین کے دوسرے شعبوں کی طرح سیاست سے بھی متعلق ہیں اس لئے اسلامی احکام کی تشریح و وضاحت کے ضمن میں حضرت نے اسلام کے سیاسی احکام پر بھی اپنی تصانیف اور مواعظ و ملفوظات میں مختصر مگر جامع بحثیں فرمائی ہیں جن میں اسلامی احکام کی توضیح کے ساتھ ساتھ عہد حاضر کے دوسرے سیاسی نظاموں اور سیاست کے میدان میں پائی

جانے والی فکری اور عملی گمراہیوں پر بھی بھرپور تبصرے شامل ہیں۔اس مقالے میں انہی بحثوں کا ایک ایسا مطالعہ مقصود ہے جس کے ذریعے حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے بیان کے مطابق سیاست کے بارے میں اسلامی تعلیمات کا ایک واضح تصور ابھر کر سامنے آسکے۔

آج کی ذہنیت

آج کی دنیا میں جو سیاسی نظام عملاً قائم ہیں، ان کے پیش کئے ہوئے تصورات لوگوں کے دل و دماغ پر اس طرح چھائے ہوئے ہیں کہ ان کے اثرات سے اپنی سوچ کو آزاد کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ان سیاسی نظاموں نے کچھ چیزوں کو اچھا اور کچھ کو برا قرار دے کر اپنے ان نظریات کا پروپیگنڈہ اتنی شدت کے ساتھ کیا ہے کہ لوگ اس کے خلاف کچھ کہنے یا کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔اول تو اس لئے کہ پروپیگنڈے کی مہیب طاقتوں نے ذہن ہی ایسے بنا دیئے ہیں کہ انہوں نے ان نظریات کو ایک مسلم سچائی کے طور پر قبول کر لیا ہے، اور دوسرے اس لئے کہ اگر کوئی شخص عقلی طور پر ان نظریات سے اختلاف بھی رکھتا ہو تو ان کے خلاف کچھ بولنا دنیا بھر کی ملامت اور طعن وتشنیع کو دعوت دینے کے مترادف ہے، لہٰذا وہ خاموشی ہی میں عافیت سمجھتا ہے۔

اس بناء پر جب آج کی دنیا میں اسلام کی سیاسی تعلیمات کی تشریح کی جاتی ہے تو اچھے اچھے لوگ (جن میں بہت سے علماء بھی داخل ہیں) اپنے ذہن کو زمانے کے ان فیشن ایبل تصورات سے آزاد نہیں کر پاتے، اور اس کے نتیجے میں جب وہ اسلام کے مطلوب سیاسی ڈھانچے کی تفصیلات بیان کرتے ہیں تو ان تصورات کو مستعار لے کر اس ڈھانچے میں فٹ کرنا ضروری خیال کرتے ہیں اور اس طرح اس نازک موضوع پر التباس اور خلط مبحث کی اتنی تہیں چڑھتی چلی گئی ہیں کہ حقیقت حال چھپ کر رہ گئی ہے۔

حکیم الامت کا تجدیدی کارنامہ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ سے اللہ تعالیٰ نے چودہویں صدی میں دین کی تجدید کا عظیم الشان کام لیا، اور یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جس پر قرآن وسنت اور ماخذ شریعت کا پختہ رنگ اس طرح چڑھا ہوا ہو کہ کوئی دوسرا رنگ اس پر نہ چڑھ

سکے۔ ایسا شخص زمانے کو جانتا ضرور ہے، لیکن قبول وہی کرتا ہے جو اس پختہ رنگ کے مطابق ہو۔ وہ اپنی آنکھیں پوری طرح کھلی رکھتا ہے، لیکن گردوپیش میں ہونے والے پروپیگنڈے کے شوروشغب سے مرعوب نہیں ہوتا۔ اور اگر بالفرض ساری دنیا کسی ایک سمت میں چلی جائے تب بھی وہ اللہ تعالیٰ کو توفیق خاص سے اسی بات پر ڈٹا رہتا ہے جو ماخذ شریعت کی رو سے سچی اور کھری بات ہو، اور اس کے اظہار میں کوئی مرعوبیت یا شرم یا مخلوق کا خوف اس کے آڑے نہیں آتا۔

سیاست کے معاملے میں بھی حکیم الامت قدس سرہ نے دین کی صراط مستقیم پر اسی ثابت قدمی کا مظاہرہ فرمایا، اور اس دور میں جب بہت سے باطل نظریات کی آمیزش نے سیاست کے بارے میں اسلامی تعلیمات کو دھندلا کر دیا تھا، حضرت نے اللہ تعالیٰ کی توفیق خاص سے ان تعلیمات کو اپنی صحیح شکل وصورت میں پیش کیا اور پروپیگنڈے کے کسی شوروشغب سے مرعوب نہیں ہوئے۔

چونکہ آج کل کی سیاست (جس میں وہ سیاست بھی داخل ہے جس کا مقصد اسلام کا نفاذ بتایا جاتا ہے) ایک خاص رخ پر چل رہی ہے، اور اس میں بعض باتوں کو اصول موضوعہ کے طور پر اس طرح مسلم سمجھ لیا گیا ہے کہ ان کے خلاف کا تصور ہی ذہنوں میں نہیں آتا، اس لئے حضرت کے یہ سیاسی افکار ان سیاسی ذہنوں کو یقیناً اچنبھے محسوس ہوں گے جو بنیادی طور پر مغربی انداز سیاست سے متاثر ہیں۔ لیکن حضرت کے یہ افکار آپ کے ذاتی افکار نہیں ہیں، بلکہ ان کی بنیاد قرآن وسنت اور خلافت راشدہ کے طرز عمل پر ہے اور ان کے پیچھے نقلی اور عقلی دلائل کی مضبوط طاقت ہے، اس لئے ان کا مطالعہ اور ان پر ٹھنڈے دل اور غیر جانبدار ذہن سے غور کرنا ضروری ہے تاکہ حقیقت حال واضح ہو سکے۔

حضرت کے سیاسی افکار کو تین حصوں میں منقسم کر کے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ اسلام میں سیاست کا مقام۔

۲۔ اسلام کا نظام حکومت اور حکومت کے فرائض۔

۳۔ اسلام میں سیاسی جدوجہد کا طریق کار۔

2 اسلام میں سیاست کا مقام

سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ دین میں سیاست کا مقام کیا ہے؟ اور دین میں ایک صحیح سیاسی نظام کے قیام کی اہمیت کس درجے میں ہے؟ عیسائیت کا یہ باطل نظریہ بہت مشہور ہے کہ ''قیصر کا حق قیصر کو دو'' اور کلیسا کا حق کلیسا کو'' جس کا حاصل یہ ہے کہ مذہب کا سیاست میں کوئی عمل دخل نہیں ہے، اور مذہب وسیاست دونوں کا دائرۂ عمل مختلف ہے، دونوں کو اپنے اپنے دائرے میں ایک دوسرے کی مداخلت کے بغیر کام کرنا چاہئے، دین وسیاست کی تفریق کا یہی نظریہ عہد حاضر میں ترقی کر کے ''سیکولرازم'' کی شکل اختیار کر گیا جو آج کے نظام ہائے سیاست میں مقبول ترین نظریہ سمجھا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اسلام میں اس نظریے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اسلام کی تعلیمات چونکہ ہر شعبہ زندگی سے متعلق ہیں جن میں سیاست بھی داخل ہے، اس لئے اسلام میں سیاست کو دین ومذہب سے بے تعلق رکھنے کا کوئی جواز موجود نہیں ہے۔

چنانچہ عہد حاضر میں بہت سے مسلمانوں نے عیسائیت اور سیکولرازم کے اس باطل نظریے کی پرزور تردید کی، اور یہ ثابت کیا کہ سیاست کو دین سے الگ نہیں کیا جا سکتا، بقول اقبال مرحوم۔

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

لیکن سیکولرازم اور دین وسیاست کی تفریق کے اس نظریے کی پرزور تردید کرتے ہوئے بہت سے مسلمان مفکرین اور اہل قلم سے ایک نہایت باریک غلطی واقع ہو گئی جو دیکھنے میں بڑی باریک اور معمولی تھی، لیکن اس کے اثرات بہت دوررس تھے۔ اس باریک غلطی کو ہم مختصر لفظوں میں بیان کرنا چاہیں تو اسے اس طرح تعبیر کر سکتے ہیں کہ انہوں نے ''سیکولرازم'' کی تردید کے جوش میں سیاست کو اسلامی بنانے کے بجائے اسلام کو سیاسی بنا دیا، کہنا یوں تھا کہ ''سیاست'' کو دین سے الگ نہ ہونا چاہئے لیکن کہا یوں کہ دین کو سیاست سے الگ نہیں ہونا چاہئے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اسلام کے بہت سے احکام سیاست وحکومت سے متعلق ضرور ہیں اور ایمان کا تقاضا بھی یہ ہے کہ ہر مسلمان اسلام کے دوسرے احکام کی طرح ان احکام پر بھی بقدر استطاعت عمل کرنے اور کرانے کی کوشش کرے، حاکم کا فرض ہے کہ وہ اسلامی احکام کو

نافذ کرے، اور انہی احکام کے مطابق حکومت کرے، اور عوام کا فرض ہے کہ وہ شرعی احکام کے مطابق ایسی حکومت کے قیام کی کوشش اور اگر وہ قائم ہو جائے تو اس کی اطاعت کریں۔

بعض مفکرین کی لغزش اور اسکے منفی نتائج

لیکن عہد حاضر کے بعض مفکرین اور مصنفین جنہوں نے سیکولرازم کی تردید میں کام کیا، تردید کے جوش میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ انہوں نے سیاست اور حکومت کو اسلام کا مقصود اصلی، اس کا حقیقی نصب العین اور بعثت انبیاء کا مطمح نظر بلکہ انسان کی تخلیق کا اصل ہدف قرار دے دیا، اور اسلام کے دوسرے احکام مثلاً عبادات وغیرہ کو نہ صرف ثانوی حیثیت دے دی، بلکہ انہیں اسی مقصود اصلی، یعنی سیاست کے حصول کا ایک ذریعہ اور اس کی تربیت کا ایک طریقہ قرار دیا۔

اس انتہا پسندی کا پہلا زبردست نقصان تو یہ ہوا کہ اس کے نتیجے میں دین کی مجموعی تصویر اور اس کی ترجیحات کی ترتیب (Order of Ptiroiry) الٹ کر رہ گئی، جو چیز وسیلہ تھی وہ مقصد بن کر ہمہ وقت دل و دماغ پر چھا گئی، اور جو مقصد تھا وہ ایک غیر اہم وسیلہ بن کر پس منظر میں چلا گیا، چنانچہ اس طرز فکر کے تحت ذہن کچھ اس طرح کا بن گیا کہ ایک مسلمان کا اصل مقصد زندگی سیاست اور حکومت کی اصلاح ہونا چاہئے کام وہی کام ہے جو اس راستے میں انجام دیا جائے، قربانی وہی قربانی ہے جو اس راہ میں پیش کی جائے، اور مثالی انسان وہی ہے جس نے اس کام کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر دن رات اس کے لئے وقف کر رکھے ہوں۔ اور دین کے دوسرے شعبوں مثلاً طاعات وعبادات، زہد وتقویٰ، تزکیہ نفس اور خشیت وانابت وغیرہ کی نہ صرف یہ کہ کوئی خاص اہمیت باقی نہ رہی، بلکہ جو شخص ان کاموں میں مشغول ہو اس کے بارے میں یہ تصور قائم کر دیا گیا کہ گویا وہ مبادی میں الجھا ہوا ہے اور دین کے بنیادی مقاصد سے دور ہے۔

دوسرا نقصان یہ ہوا کہ جب اسلام کا مقصد اصلی سیاست وحکومت قرار پایا، اور عبادات وغیرہ کے احکام کی حیثیت محض وسیلے کی ہو گئی، تو یہ ایک بدیہی بات ہے کہ کبھی کبھی وسائل کو مقصد پر قربان بھی کرنا پڑتا ہے، اور مقصد کے حصول کے لئے اگر کبھی کسی وسیلے میں

کچھ اونچ نیچ یا کمی بیشی بھی ہو جائے تو وہ گوارا کر لی جاتی ہے۔ لہٰذا مذکورہ انتہا پسندی کے نتیجے میں شعوری یا غیر شعوری طور پر اس بات کی بڑی گنجائش پیدا ہوگئی کہ سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے عبادات وغیرہ کے احکام میں کوئی کمی کوتاہی بھی ہو جائے تو وہ قابل ملامت نہیں، کیونکہ وہ ایک بڑے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہوئی ہے۔

ایک مثال سے وضاحت

سیاست کوئی دین کا ایک شعبہ نہیں، بلکہ دین کا مقصود اصلی قرار دینے کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے تجارت و معیشت بھی دین کا ایک شعبہ ہے، اس حیثیت سے دین کے بہت سے احکام تجارت و معیشت سے بھی متعلق ہیں بلکہ کسب حلال کے بہت سے فضائل بھی احادیث میں وارد ہوئے ہیں، اب اگر ان فضائل کے پیش نظر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ دین کا اصل مقصد ہی تجارت و معیشت اور کسب حلال ہے تو یہ بات اتنی غلط ہوگی کہ اس پر دلائل قائم کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔

بعینہ اسی طرح سیاست اس معنی میں دین کا ایک شعبہ ضرور ہے کہ دین کے بہت سے احکام اس سے متعلق ہیں، اور اس کے بہت سے فضائل بھی قرآن و حدیث میں وارد ہوئے ہیں لیکن ان فضائل کی بنیاد پر اس کو دین کا مقصود اصلی قرار دینا ایسی ہی غلطی ہے جیسے تجارت و معیشت کو دین کا اصل نصب العین قرار دینا۔

زاویہ فکر کی تبدیلی

لیکن چودہویں صدی ہجری کے آغاز میں جب سے مسلمانوں میں مغربی استعمار سے آزاد ہونے کی تحریکات شروع ہوئیں، اس وقت سے وہ انتہا پسندانہ طرز فکر عام ہوتا گیا جس میں سیاست کو ''خلافت فی الارض'' اور ''حکومت الٰہیہ'' وغیرہ کے عنوانات سے دین کا بنیادی مقصد قرار دے دیا گیا۔ طرز فکر کی اس غلطی نے مسلمانوں میں اتنی آہستگی سے اپنی جگہ بنائی کہ اچھے اچھے لوگوں کو یہ احساس نہ ہو سکا کہ ان کے فکر و عمل کا کانٹا تبدیل ہو گیا ہے۔ ''سیاسی استقلال'' کی ضرورت و اہمیت اس درجہ ذہنوں پر چھائی ہوئی تھی کہ اس باریک مگر دور رس غلطی پر غور کر کے ''دین میں سیاست'' کا صحیح مقام متعین کرنے کی فرصت

ہی نہ تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تصور بعض حضرات نے شعوری طور پر اختیار کیا اور بعض نے غیر شعوری طور پر اور تحریکات کے اجتماعی عمل نے اس پر ایسی مہر ثبت کردی کہ اچھے اچھے اہل علم کو بھی کانٹے کی اس تبدیلی کا احساس نہ ہوسکا۔

شرعی نقطہ نظر

اس ماحول میں احقر کے علم کے مطابق حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ وہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے اس باریک غلطی کو دوٹوک لفظوں میں واضح فرمایا اور قرآن و سنت کے دلائل سے ثابت کیا کہ دین میں سیاست کا صحیح مقام کیا ہے؟ حضرتؒ فرماتے ہیں۔حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ

ترجمہ:۔’’وہ لوگ جن کو اگر ہم زمین کی حکومت عطا کریں تو وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دیں، اور سب کاموں کا انجام اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔‘‘

اس سے واضح ہے دیانات مقصود بالذات ہیں، اور سیاسیات و جہاد مقصود اصلی نہیں، بلکہ اقامت دیانت کا وسیلہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ دیانت اور احکام دیانت تو انبیاء علیہم السلام کو مشترک طور پر سب کو دیئے گئے اور سیاسیات و جہاد سب کو نہیں دیا گیا، بلکہ جہاں ضرورت و مصلحت سمجھی گئی، دی گئی ورنہ نہیں۔وسائل کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ ضرورت ہی کے لئے دیئے جاتے ہیں۔

شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ دوسری آیات میں تو اس کے خلاف مضمون موجود ہے۔جس سے دیانت کا وسیلہ ہونا اور تمکین فی الارض اور سیاست کا مقصود ہونا سمجھ میں آرہا ہے اور وہ یہ ہے۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ

ترجمہ:۔ ’’تم میں جولوگ ایمان لاویں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی اور جس دین کو ان کے لئے پسند کیا ہے اس کو ان کے لئے قوت دے گا۔‘‘

یہاں ایمان وعمل صالح کو شرط قرار دیا جارہا ہے تمکین فی الارض کی، جس سے تمکین وسیاست کا مقصود اصلی ہونا لازم آتا ہے۔ سو جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں ایمان اور عمل صالح پر تمکین وشوکت کا وعدہ کیا گیا ہے اور بطور خاصیت کے شوکت کا دین پر مرتب ہونا ذکر فرمایا گیا ہے، پس دین پر سیاست وقوت موعود ہوئی لیکن موعود کا مقصود ہونا ضروری نہیں، ورنہ آیت کریمہ۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ

ترجمہ:۔ ’’اور اگر یہ لوگ توراۃ کی اور انجیل کی اور جو کتاب ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی (یعنی قرآن) اس کی پوری پابندی کرتے تو یہ لوگ اوپر سے اور نیچے سے خوب فراغت سے کھاتے۔‘‘

جس میں اقامت توراۃ وانجیل وقرآن، یعنی عمل بالقرآن پر وسعت رزق کا وعدہ کیا گیا ہے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ دین سے یہ مقصود ہے؟ بلکہ دین پر موعود ہے کہ دیندار بھوکا ننگا نہیں رہ سکتا، پس موعود کا مقصود ہونا ضروری نہیں۔ یہاں بھی ایمان وعمل صالح پر شوکت وقوت اور سیاست وغیرہ موعود ہیں جو بطور خاصیت اس پر مرتب ہوں گی نہ کہ مقصود جو اس کی غایت کہلائے۔

بہر حال! واضح ہوا کہ سیاست ودیانت میں سیاست وسیلہ ہے اور دیانت مقصود اصلی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سیاست کسی درجے میں بھی مطلوب نہیں، بلکہ اس کا درجہ بتلانا مقصود ہے کہ وہ خود مقصود اصلی نہیں اور دیانت خود مقصود اصلی ہے۔

(اشرف السوانح جلد۴ (خاتمہ السوانح) (مطبوعہ ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان)

دین کا مقصد اصلی

حقیقت یہ ہے کہ حضرت حکیم الامت نے ایک صفحے کی اس مختصر مگر انتہائی پر مغز اور

جامع تقریر میں اللہ تعالیٰ کی توفیق خاص سے موضوع کو اس قدر واضح فرما دیا ہے کہ اس میں کوئی اشتباہ باقی نہیں رہا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نہ وہ سیکولر نظریہ درست ہے کہ سیاست و حکومت میں دین کا کوئی عمل دخل نہیں ہونا چاہئے، اور نہ یہ خیال صحیح ہے کہ دین کا اصلی مقصد سیاست و حکومت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دین کا اصل مقصد بندے کا اپنے اللہ سے تعلق قائم کرنا ہے۔ جس کا مظاہرہ عبادات و طاعات کے ذریعے ہوتا ہے۔ سیاست و حکومت بھی اسی مقصد کی تحصیل کا ایک ذریعہ ہے جو نہ بجائے خود مقصد ہے اور نہ اقامت دین کا مقصد اس پر موقوف ہے، بلکہ وہ حصول مقاصد کے وسائل میں سے ایک وسیلہ ہے۔ لہٰذا اسلام میں وہی سیاست و حکومت مطلوب ہے جو اس مقصد میں ممد و معاون ہو، اس کے برعکس جو سیاست اس مقصد کو پورا کرنے کے بجائے دین کے اصل مقاصد میں کتر بیونت کر کے انہیں مجروح کرے، وہ اسلامی سیاست نہیں ہے، خواہ اس کا نام ''اسلامی'' رکھ دیا گیا ہے۔

(۲) اسلام کا نظام حکومت

جمہوریت کی قلابازیاں

قرون وسطیٰ میں یورپ کے اندر جو شخصی حکومتیں عام طور سے رائج رہی ہیں وہ مطلق العنان بادشاہتیں تھیں، جن میں بادشاہ کی زبان قانون کی حیثیت رکھتی تھی اور اس پر کوئی قانون قدغن عائد نہیں ہوتی تھی، اس مطلق العنان حکمرانی کے نتیجے میں ظلم و ستم اور ناانصافیوں کا بازار گرم رہا، اس لئے اس کے خلاف یورپ میں شدید ردعمل ہوا۔ ''شخصی حکومت'' کو بذات خود نہایت معیوب سمجھا جانے لگا اور اس کی جگہ ''جمہوریت'' کو ایک مثالی طرز حکومت کے طور پر پیش کیا گیا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ شخصی حکومتیں ختم ہو گئیں، اور ان کی جگہ جمہوری نظام حکومت وجود میں آیا، بیشتر ملکوں میں جمہوریت قائم کی گئی، یہاں تک کہ جمہوریت کو ایک ایسا فیشن ایبل نظام حکومت سمجھا جانے لگا جو سیاست میں عدل و انصاف اور حق و صداقت کا ضامن ہے۔ چنانچہ گذشتہ (ہجری) صدی سے لے کر اب تک جتنی سیاسی تحریکیں اٹھی ہیں، ان کے ذہن میں ''جمہوریت'' کی حیثیت معاذ اللہ ایک ایسے ''کلمہ

طیبہ'' کی ہوگئی ہے جس کے بغیر آج کے دور میں سیاست کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا بھر پہ چھائے ہوئے اس پروپیگنڈے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عہد حاضر میں جو سیاسی جماعتیں اسلام کا نام لے کر اٹھی ہیں، ان کی اکثریت بھی نہ صرف یہ کہ جمہوریت کو ایک مسلم اصول قرار دے کر آگے بڑھی ہے، بلکہ انہوں نے بھی اپنے مقاصد میں جمہوریت کے قیام کو سرفہرست رکھا ہے اور خود اپنی جماعت کو بھی جمہوری ڈھانچے پر تعمیر کیا ہے۔ چنانچہ اسی ضمن میں یہ دعوے بھی بکثرت کئے گئے ہیں کہ جمہوریت اسلام کے عین مطابق ہے بلکہ اسلام نے جمہوریت ہی کی تعلیم دی ہے، کسی نے بہت احتیاط کی تو یہ کہہ دیا کہ جمہوریت کے جو اجزاء اسلام کے خلاف ہیں، ہم ان کے قائل نہیں ہیں، لہٰذا ہماری جمہوریت ''اسلامی جمہوریت'' ہے۔

یہ تصورات ہمارے دور میں اس قدر مشہور ہوگئے ہیں کہ ان کے خلاف کچھ سوچنا کہنا دنیا بھر کی لعنت وملامت کو اپنے سر لینے کے مترادف ہے اور اگر ایسے ماحول میں کوئی شخص جمہوری حکومت کے بجائے شخصی حکومت کی حمایت کرے تو ایسا شخص تو آج کی سیاسی فضا میں تقریباً کلمہ کفر کہنے کا مرتکب سمجھا جانے لگا ہے۔

لیکن جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین اور خالص دین کی دعوت وتجدید کے لئے منتخب فرمایا ہو، وہ زمانے پر چھائے ہوئے تصورات اور خوشنما نعروں سے مرعوب ومتاثر نہیں ہوتا، بلکہ ہر حال میں حق کو حق اور باطل کو باطل قرار دیتا ہے۔ چنانچہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے کبھی ایک لمحے کے لئے بھی یہ تسلیم نہیں فرمایا کہ اسلام نے جمہوریت کی تعلیم دی ہے یا جمہوریت اسلام کے عین مطابق ہے۔ اس کے بجائے انہوں نے اپنے متعدد مواعظ وملفوظات اور تصانیف میں جمہوریت پر نہایت جاندار تنقیدیں کی ہیں، اور اپنے دینی نقطہ نظر سے اس کی خرابیوں کو واضح فرمایا ہے۔

عام طور سے جمہوریت کے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں صرف اتنا خیال رہا کہ مطلق العنان بادشاہت کے مقابلے میں یہ نظام عوام کو آزادی اظہار رائے عطا کرتا ہے اور حکمرانوں پر ایسی پابندیاں عائد کرتا ہے جن کے ذریعے وہ بے مہار نہ ہوسکیں۔ اور چونکہ اسلام نے ''مشاورات'' کا حکم دیا ہے، اس لئے ''جمہوریت'' کو ''مشاورت'' کے ہم معنی سمجھ کر لوگوں

نے یہ کہنا شروع کردیا جمہوریت عین اسلام ہے۔ حالانکہ بات اتنی سادہ نہیں ہے، درحقیقت ''جمہوری نظام حکومت'' کے پیچھے ایک مستقبل فلسفہ ہے جو دین کے ساتھ ایک قدم بھی نہیں چل سکتا، اور جس کے لئے سیکولرازم پر ایمان لانا تقریباً لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔

جمہوریت کے حقیقت واضح کرنے کے لئے یہ جملہ مشہور ہے کہ:

It is the government of the people
by thr people for the people.

جمہوریت عوام کی حکومت کا نام ہے جو عوام کے ذریعے اور عوام کے فائدے کے لئے قائم ہوتی ہے۔

لہٰذا ''جمہوریت'' کا سب سے پہلا رکن اعظم یہ ہے کہ اس میں عوام کو حاکم اعلیٰ تصور کیا جاتا ہے، اور عوام کا ہر فیصلہ جو کثرت رائے کی بنیاد پر ہوا ہو وہ واجب التعمیل اور ناقابل تنسیخ سمجھا جاتا ہے۔ کثرت رائے کے اس فیصلہ پر کوئی قدغن اور کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔ اگر دستور حکومت عوامی نمائندوں کے اختیار قانون سازی پر کوئی پابندی بھی عائد کردے۔ (مثلاً یہ کہ وہ کوئی قانون قرآن وسنت کے یا بنیادی حقوق کے خلاف نہیں بنائے گی) تو یہ پابندی اس لئے واجب التعمیل نہیں ہوتی کہ یہ عوام سے بالاتر کسی اتھارٹی نے عائد کی ہے یا یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جسے ہر حال میں ماننا ضروری ہے، بلکہ صرف اس لئے واجب التعمیل سمجھی جاتی ہے کہ یہ پابندی خود کثرت رائے نے عائد کی ہے۔ لہٰذا اگر کثرت رائے کسی وقت چاہے تو اسے منسوخ بھی کرسکتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ جمہوریت نے کثرت رائے کو (معاذ اللہ) خدائی کا مقام دیا ہوا ہے کہ اس کا کوئی فیصلہ رد نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ اسی بنیاد پر مغربی ممالک میں بد سے بدتر قوانین کثرت رائے کے زور پر مسلسل نافذ کئے جاتے رہے ہیں، اور آج تک نافذ کئے جارہے ہیں، زنا جیسی بدکاری سے لے کر ہم جنسی جیسے گھناؤنے عمل تک کو اسی بنیاد پر سند جواز عطا کی گئی ہے، اور اس طرز فکر نے دنیا کو اخلاقی تباہی کے آخری سرے تک پہنچادیا ہے۔

جمہوری فلسفہ پر حکیم الامت کا تبصرہ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے کثرت رائے کے اس جمہوری فلسفے پر جا بجا تبصرے فرما کر اس کی کمزوری کو واضح کیا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ

ترجمہ:۔ اور اگر آپ زمین والوں کی اکثریت کی اطاعت کریں گے تو وہ آپ کو اللہ کے راستے سے گمراہ کر دیں گے۔"

کثرت رائے کو معیار حق قرار دینے کے خلاف اس سے زیادہ واشگاف اعلان اور کیا ہوسکتا ہے؟ لیکن زمانے پر چھائے ہوئے نظریات سے مرعوب ہو کر مسلمانوں میں بھی یہ خیال تقویت پا گیا کہ جس طرف کثرت رائے ہوگی، وہ بات ضرور حق ہوگی۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے اپنی تالیفات اور مواعظ و ملفوظات میں بہت سے مقامات پر اس پھیلی ہوئی غلطی کی تردید فرمائی ہے، ایک وعظ میں فرماتے ہیں۔

"آج کل یہ عجیب مسئلہ نکلا ہے کہ جس طرف کثرت رائے ہو وہ بات حق ہوئی ہے، صاحبو! یہ ایک حد تک صحیح ہے، مگر یہ بھی معلوم ہے کہ رائے سے کس کی رائے مراد ہے؟ کیا ان عوام کالانعام کی؟ اگر انہیں کی رائے مراد ہے تو کیا وجہ کہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کی رائے پر عمل نہیں کیا، ساری قوم ایک طرف رہی اور حضرت ہود علیہ السلام ایک طرف۔ آخر کیوں انہوں نے توحید کو چھوڑ کر بت پرستی اختیار نہ کی؟ کیوں تفریق قوم کا الزام سر لیا؟ اسی لئے کہ وہ قوم بہت جاہل تھی اس کی رائے جاہلانہ رائے تھی۔ (فضائل العلم والخشیۃ ۳۰ و معارف حکیم الامت ۲۱۷)

مطلب یہ ہے کہ عوام کی کثرت رائے کبھی معیار حق نہیں ہوسکتی کیونکہ عوام میں اکثریت عموماً بے علم یا کم علم لوگوں کی ہوتی ہے۔ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں۔

"مولانا محمد حسین الہ آبادی نے سید احمد خان سے کہا تھا کہ آپ لوگ جو کثرت رائے پر فیصلہ کرتے ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ حماقت کی رائے پر فیصلہ کرتے ہو کیونکہ قانون

فطرت یہ ہے کہ دنیا میں عقلاء کم ہیں اور بے وقوف زیادہ، تو اس قاعدے کی بنا پر کثرت رائے کا فیصلہ بیوقوفی کا فیصلہ ہوگا۔" (تقلیل الاغلاط مع الانام و معارف حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ ۶۲۶)

ایک اور موقع پر ارشاد فرماتے ہیں۔

(غزوہ احد) میں ان پچاس آدمیوں میں جو پہاڑ کی گھاٹی پر متعین تھے، اختلاف ہوا بعض نے کہا کہ ہمارے بھائیوں کو فتح حاصل ہوگئی ہے اب ہم کو گھاٹی پر رہنے کی ضرورت نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس غرض کے لئے ہم کو یہاں متعین کیا تھا وہ غرض حاصل ہو چکی ہے اس لئے حکم قرار بھی ختم ہو گیا اب یہاں سے ہٹنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصود کی مخالفت نہ ہوگی اور ہم نے اب تک جنگ میں حصہ نہیں لیا تو کچھ ہم کو بھی کرنا چاہئے ہمارے بھائی کفار کا تعاقب کر رہے ہیں، ہم کو مال غنیمت جمع کر لینا چاہئے، بعض نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرما دیا تھا کہ بدوں میری اجازت کے یہاں سے نہ ہٹنا اس لئے ہم کو بدون آپ کی اجازت کے ہرگز نہ ہٹنا چاہئے۔ مگر پہلی رائے والوں نے نہ مانا اور چالیس آدمی گھاٹی سے ہٹ کر مال غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہو گئے۔ یہ ان سے اجتہادی غلطی ہوئی، اور گھاٹی پر صرف دس آدمی اور ایک افسر ان کے رہ گئے (اس واقعہ میں کثرت رائے غلطی پر تھی اور قلت رائے صواب پر تھی جو لوگ کثرت رائے کو علامت حق سمجھتے ہیں وہ اس سے سبق حاصل کریں۔) (ذم النسیان ص ۱۲، معارف حکیم الامت ص ۶۱۸)

اسی وعظ میں آگے چل کر حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے کثرت رائے کی لازمی حقانیت کے خلاف حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے اس طرز عمل کی مثال بھی دی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب بعض قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تو آپ نے ان کے خلاف جہاد کا ارادہ فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سمیت بیشتر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی رائے یہ تھی کہ ان لوگوں کے ساتھ جہاد نہ کیا جائے لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی رائے پر قائم رہے اور اسی کے مطابق فیصلہ بھی ہوا اور بعد میں سب لوگوں نے یہ اعتراف کیا کہ صائب رائے یہی تھی۔

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے کثرت رائے کو معیار حق قرار دینے کے نظریے

پر شرعی اور عقلی دونوں قسم کے دلائل سے تنقید فرمائی ہے، اور سادہ سادہ لفظوں میں ایسے حقائق بیان فرمادیئے ہیں کہ جب بھی کوئی شخص ٹھنڈے دل سے غور کرے گا اسی نتیجے تک پہنچے گا چنانچہ جدید علم سیاست کے بعض حقیقت پسند ماہرین نے بھی ''جمہوریت'' کے ان نقائص کو تسلیم کیا ہے۔ ایک مشہور ماہر سیاست ایڈمنڈ بورک (Burke) لکھتا ہے۔

''اکثریت کے فیصلہ کو تسلیم کرنا کوئی فطرت کا قانون نہیں ہے، کم تعداد بعض اوقات زیادہ مضبوط طاقت بھی ہوسکتی ہے اور اکثریت کی حرص و ہوس کے مقابلے میں اس کے اندر زیادہ معقولیت بھی ہوسکتی ہے لہٰذا یہ مقولہ کہ ''اکثریت کے فیصلہ کو قانون بننا چاہئے'' اس میں افادیت اور پالیسی کی بھی اتنی ہی کمی ہے، جتنی حقانیت کی۔''

حکیم الامت قدس سرہ ایک اور وعظ میں فرماتے ہیں۔

''اول تو کثرت رائے میں احمقوں کو جمع کیا جاتا ہے ان کی کثرت تو حماقت ہی کی طرف ہوگی، پھر ان سے بھی پہلے اپنی رائے منوالی جاتی ہے اس سبق کی طرح پڑھادیا جاتا ہے کہ ہم یوں کہیں گے، تم یوں کہہ دینا، جیسے وکیل گواہوں کو پڑھایا کرتے ہیں اب ہو کثرت کیا خاک ہوئی۔

بعض جمہوریت پرست لوگوں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اس تبصرے کو ایک سطحی تبصرہ قرار دینے کی کوشش کی ہے، اور بعض لوگوں نے یہ بھی کہا کہ یہ ایک ایسے بزرگ کا تبصرہ ہے جن کا میدان علم سیاست نہیں تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت کی نگاہ اپنی گوشہ نشینی کے باوجود زمانے کی دکھتی ہوئی رگوں پر ہوتی تھی۔ ان کا اصل ماخذ قرآن وسنت تھے اور وحی کی اسی روشنی نے انہیں وہ نور فراست عطا فرمادیا تھا، جس کے ذریعے وہ ان مسائل کو انتہائی سادگی سے بیان فرما گئے ہیں، جن کو لوگوں نے ایک مستقل فلسفہ بنا رکھا ہے چنانچہ یہ تبصرہ بھی اسی فراست ایمانی کا نتیجہ تھا۔ علم سیاست بے شک آپ کا اصل میدان نہیں تھا، لیکن جو سچائی وحی کے نور سے معلوم ہوئی ہو، اسے رسمی علوم کی حاجت نہیں ہوتی۔ لیکن اس علمی سیاست کے وہ ماہرین بھی جنہوں نے پروپیگنڈے سے ذرا آزاد ہو کر سوچنے کی کوشش کی ہے وہ بھی بالآخر اسی نتیجے تک پہنچے ہیں۔ ڈاکٹر اے۔ اپادورائے برصغیر میں اپنی سیاسی تصانیف کی وجہ سے خاصے مشہور ہیں۔ وہ ''جمہوریت'' کے تعارف اور اس کی کامیاب کی شرائط پر بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ۔

''جمہوریت کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہ شرائط (جن کے وجود پر جمہوریت کی کامیابی موقوف ہے) شاذ ونادر ہی پوری ہوئی ہیں۔ عملی اعتبار سے جمہوریت دراصل جہالت کی حکمرانی کا نام ہے۔ اس کی ساری توجہ کمیت اور تعداد (Quantity) پر رہتی ہے۔ کیفیت (Quality) پر نہیں۔

اس میں ووٹ گنے جاتے ہیں، انہیں تولا نہیں جاتا۔ شہریوں کی بہت بڑی تعداد اب بھی حکومت کو اپنے بنیادی وظائف زندگی میں سے نہیں سمجھتی، چنانچہ اس کو حکومت سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی، وہ کام کرتی اور کھیلتی رہتی ہے، اپنے پیشہ وارانہ اور فنی کاموں کو انجام دیتی رہتی ہے ہل چلاتی، بیج بوتی، فصلیں کاٹتی اور انہیں بیچتی رہتی ہے، اور یہ بھول جاتی ہے کہ وہ دراصل ملک کی حاکم ہے۔ جمہوریت میں یہ حقیقی خطرہ موجود ہے کہ شہریوں کی ایسی ذہنی تربیت نہیں ہو پاتی، جس کے ذریعہ وہ ان مسائل کے حقیقی مفہوم کا ادراک کرسکیں جو انتخابات کے موقع پر ان کے سامنے فیصلے کے لئے آتے ہیں، لہٰذا وہ طبقاتی جذبات اور نعروں سے گمراہ ہوسکتے ہیں، سر ہنری مین تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جمہوریت کبھی بھی اکثریت کی حکمرانی کی نمائندگی نہیں کرسکتی کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ عوام تو محض اپنے لیڈروں کی آراء کو تسلیم کرتے ہیں۔

مغرب کے مشہور مورخ اور فلسفی کارلائل کا یہ اقتباس علم سیاست میں کافی شہرت پا گیا ہے کہ۔

Surely of all "rights of man"

this right of the ignorant man to be guided by the wiser to be gently or forcibly held in the true vourse by him is the indisputablste. Nature hereself ordains it from the first society struggles lowards perfection by enforcing and accmoplishing it more and more.... in Rome and Attens as elsewhere if you look practical we shall find that it was not by loud voting and debating of many but by wise inright and ordering of a few that the word war done. So is it ever so will it ever be".

''انسانی حقوق'' میں یقینی طور پر جاہل افراد کا یہ حق سب سے زیادہ غیر متنازعہ ہے کہ عقل مند افراد کی رہنمائی کریں، اور انہیں نرمی سے یا طاقت کے ذریعہ سیدھے راستے پر رکھیں۔ فطرت کا شروع سے یہی حکم ہے، اسی حکم کو نافذ کرکے اور اس کی زیادہ سے زیادہ تکمیل کرکے ہی سوسائٹی کمال تک پہنچنے کی جدوجہد کرتی ہے...... اگر ہم عملی نقطۂ نظر سے

دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ روم اور ایتھنز میں دوسرے مقامات کی طرح بلند آواز سے رائے شماری کرنے اور بہت سے لوگوں کے بحث مباحثہ کے ذریعے نہیں بلکہ گنے چنے افراد سے کام چلتا تھا۔ یہ بات ہمیشہ سے سچ رہی ہے۔لہٰذا آئندہ بھی یہی بات سچ رہے گی۔"

شخصی حکومت

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے جمہوریت پر تنقید فرماتے ہوئے کئی مقامات پر اس کے مقابلے میں "شخصی حکومت" کی حمایت کا کلمہ کفر کی طرح نشانہ ملامت سمجھی جاتی ہے۔لیکن اس کے بنیادی سبب دو ہیں۔ایک یہ کہ جمہوریت کی حمایت میں پروپیگنڈا اس قدر زور شور کے ساتھ کیا گیا کہ کسی مخالف نظام حکومت پر سنجیدگی کے ساتھ سوچنے پر ہی ذہن آمادہ نہیں ہوتے۔اور دوسری وجہ یہ ہے کہ "شخصی حکومت" کا نام آتے ہی ذہن ان مطلق العنان بادشاہوں کی طرف چلا جاتا ہے جن کی زبان قانون کی حیثیت رکھتی تھی اور ان پر کوئی بالاتر پابندی عائد نہ تھی،یا پھر اس نام سے ان فاشی حکمرانوں کا تصور آجاتا ہے جن کے نزدیک حکومت کی بنیاد محض زور زبردستی پر تھی۔ حالانکہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ "شخصی حکومت" سے وہ "مثالی اسلامی حکمران" مراد لیتے ہیں جسے امیر المومنین یا خلیفہ وقت کہا جاتا ہے۔

اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل یہ ہے کہ دنیا میں جو غیر اسلامی شخصی حکومتیں رائج رہی ہیں۔ان کی خرابیوں اور مفاسد کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱)......ان "شخصی حکومتوں" کی بنیاد بادشاہتوں میں عموماً خاندانی وراثت پر تھی اور فاشزم کے فلسفے میں صرف "قوت" پر جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو قومی ہو،وہ کمزور پر حکومت کا حق لے کر آیا ہے۔لہٰذا ان شخصی حکومتوں کے قیام میں سنجیدہ غور وفکر اور مناسب انتخاب کا کوئی قابل ذکر کردار نہیں تھا۔

(۲)......ان شخصی حکمرانوں کے لئے کوئی ایسی لازمی صفات اہلیت نہیں تھیں جن کے بغیر وہ حکمرانی کے منصب تک نہ پہنچ سکتے ہوں۔

(۳)......یہ شخصی حکومتیں عموماً ایسا آسمانی قوانین کی پابند نہیں تھیں جو ان کے فیصلوں کو

لگی بندھی حدود میں محدود رکھ سکیں۔ لہٰذا قانون ساز وہ خود تھے اور مطلق العنان ہونے کی بنا پر ان کی زبان قانون بن گئی تھی۔

(۴)...... ان حکومتوں میں کوئی ایسا لازمی ادارہ موجود نہیں تھا جو ان کے اقدامات، ان کے صادر کئے ہوئے احکام، اور ان کے بنائے ہوئے قوانین کو کسی لگے بندھے معیار پر پرکھ سکتا اور ان کی طرف سے آسمانی قانون کے خلاف ورزی، اپنی حدود اختیار سے تجاوز، یا کسی ظلم وستم کی صورت میں ان کے اقدامات کی تلافی کر سکتا۔

یہ تھے وہ اسباب جن کی بنا پر شخصی حکومتوں میں لوگوں کے حقوق پامال ہوئے اور انسان انسان کا غلام بن گیا۔ ورنہ اگر یہ خرابیاں موجود نہ ہوں تو بیشتر ماہرین سیاست اس بات پر متفق ہیں کہ شخصی حکومت میں بذات خود کوئی خرابی نہیں۔ وہ جمہوریت کے مقابلے میں کہیں زیادہ کامیاب اور عوام کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے، یہاں تک کہ روسو نے بھی یہ اعتراف کیا کہ:

''حکومت کا بہترین اور سب سے فطری انتظام یہ ہے کہ عقل مند ترین انسان کو کثرت پر حکومت کرنی چاہئے بشرطیکہ اس بات کی ضمانت مل جائے کہ وہ اس کثرت کے مفاد کے لئے حکومت کریں گے، نہ کہ اپنے مفاد کے لئے۔''

کارلائل لکھتا ہے کہ۔

''کسی بھی ملک میں وہاں کے قابل ترین آدمی کو دریافت کرلو، پھر اسے اٹھا کر اطاعت کے اعلیٰ ترین مقام پر رکھ دو، اور اس کی عزت کرو، اس طرح تم اس ملک کے لئے ایک مکمل حکومت دریافت کرلو گے، پھر بیلٹ بکس ہے، یا پارلیمنٹ میں ہونے والی فصاحت و بلاغت یا رائے شماری یا دستور سازی یا کسی بھی قسم کی کوئی اور مشینری اس حکومت میں کوئی بہتر اضافہ نہیں کر سکے گی۔ یہ ایک مکمل ریاست ہوگی اور وہ ملک ایک مثالی ملک ہوگا۔''

حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ جس ''شخصی حکومت'' کو اسلام کا تقاضا قرار دے رہے ہیں۔ وہ شخصی حکومت کی مذکورہ بالا خرابیوں سے خالی ہے۔ وہ اس معنی میں بے شک ''شخصی حکومت'' ہے کہ اس میں جمہوری انداز کی پارلیمنٹ مختار کل نہیں ہے، اور اختیارات حکومت بڑی حد تک ''خلیفہ'' یا ''امیر المومنین'' کی ذات میں مرکوز ہیں، لیکن سب

سے پہلی بات یہ ہے کہ اس ''خلیفہ'' یا ''امیر المومنین'' کا تعین وراثت یا قوت کی بنیاد پر نہیں ہوتا۔ بلکہ اہل حل وعقد کے انتخاب کے ذریعے ہوتا ہے اور اس انتخاب کے لئے ''خلیفہ'' میں کچھ معیاری اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے۔ جن کے بغیر اہل حل وعقد کے لئے کسی شخص کا انتخاب جائز نہیں۔ ان اوصاف میں علمی قابلیت کے علاوہ کردار کی اعلیٰ ترین پختگی اور رائے کی اصابت بھی داخل ہے۔ آج کل کی جمہوریتوں میں سربراہ کے انتخاب کے لئے عموماً نہ کوئی قابلیت شرط ہوتی ہے، نہ کردار وعمل کی کوئی خوبی۔ لیکن ''خلیفہ'' کے لئے اسلام میں نہایت کڑی شرائط تجویز فرمائی گئی ہیں اور اہل حل وعقد کا یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ ان شرائط کا مکمل اطمینان حاصل کرنے کے بعد خلیفہ کا انتخاب کریں۔

پھر یہ خلیفہ بھی، جو اعلیٰ ترین علمی اور عملی اوصاف کا حامل ہے، مطلق العنان قانون ساز نہیں ہوتا، بلکہ قرآن وسنت اور اجماع امت کا پابند ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی حکومت قانون وضع نہیں کرتی، بلکہ ایک ایسے آسمانی قانون کی بنیاد پر وجود میں آتی اور اسی کو نافذ کرتی ہے جو کائنات کی اعلیٰ ترین اتھارٹی کا بنایا ہوا ہے، اور قرآن وسنت کی صورت میں محفوظ ہے۔ ہاں قرآن وسنت کے دائرے میں رہتے ہوئے انتظامی قوانین اور احکام جاری کرنا حکومت کے اختیار میں ہوتا ہے۔ لیکن اس کے لئے بھی اس پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ اس قسم کے اقدامات کے لئے اہل شوریٰ سے مشورہ لے، اس مشورے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ لازمی طور پر کثرت رائے کی پابندی کرے، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسئلے کے تمام پہلو سامنے آجائیں اور ان کو مدنظر رکھنے کے بعد وہ اپنی بہترین قابلیت اور اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر خود فیصلہ کرے۔

اس کے علاوہ سربراہ حکومت کا ہر اقدام، اس کا ہر حکم اور اس کا بنایا ہوا ہر قانون چونکہ قرآن وسنت کے تابع ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کسی وقت یہ سربراہ قرآن وسنت کے احکام سے تجاوز کرے یا عدل وانصاف کے خلاف کوئی کام کرے تو قاضی کی عدالت سے اس کے خلاف چارہ کار حاصل کرنا ہر ادنیٰ شہری کا ناقابل تنسیخ حق ہوتا ہے۔

اس نظام حکومت کی تمام تفصیلات کو بیان کرنا اس مقالے کی حدود سے باہر ہے، لیکن

یہاں بتلانا صرف یہ تھا کہ حکیم الامت قدس سرہ نے اسلام میں جس ''شخصی حکومت'' کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اس میں قدیم بادشاہتوں اور جدید فاشی حکمرانوں اور ڈکٹیٹروں کی خرابی کے بنیادی اسباب موجود نہیں ہیں۔

حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے جمہوریت اور شخصی حکومت پر اپنے متعدد مواعظ اور ملفوظات میں تبصرہ فرمایا ہے۔ جن میں سے غالباً سب سے جامع اور مفصل بحث اس وعظ میں فرمائی ہے جو ''تقلیل الاختلاط مع الانام'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کے چند مختصر اقتباسات ذیل میں پیش خدمت ہیں۔

''حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ جمہوری سلطنت کے حامی ہیں، وہ بھی شخصیت ہی کے حامی ہیں، مگر شخص کبھی حقیقی ہوتا ہے کبھی حکمی، فلسفہ کا مسئلہ ہے کہ مجموعہ بھی شخص واحد ہے۔ مگر وہ واحد حکمی ہے، حقیقی نہیں، تو یہ لوگ جس پارلیمنٹ کے فیصلوں کا اتباع کرتے ہیں۔ اس میں گو بظاہر بہت سے آدمی ہوتے ہیں، مگر مجموعہ مل کر پھر شخص واحد ہے، کیونکہ جو قانون پاس ہوتا ہے، وہ سب کی رائے سے مل کر پاس ہوتا ہے۔ پارلیمنٹ میں بھی ہر شخص آزاد نہیں کہ جو رائے دے دے وہی پاس ہو جایا کرے، اگر ایسا بھی ہوتا، جب بھی کسی قدر آدمی کا دعویٰ صحیح ہوتا۔ مگر وہاں تو پارلیمنٹ کے بھی ہر شخص کی انفرادی رائے معتبر نہیں۔ بلکہ اجتماعی رائے معتبر ہے اور اجتماعی رائے پھر شخصی رائے ہے کیونکہ مجموعہ مل کر واحد حکمی ہو جاتا ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ ہم شخص واحد حقیقی کے حامی ہیں، اور تم شخص واحد حکمی کے حامی ہو۔ جمہوریت کے حامی تو تم بھی نہ رہے، جمہوریت اور آزادی کامل تو جب ہوتی ہے جب ہر شخص اپنے فعل میں آزاد ہوتا، کوئی کسی کا تابع نہ ہوتا، نہ ایک بادشاہ کا، نہ پارلیمنٹ کے دس ممبروں کا اور یہ کیا آزادی ہے کہ تم نے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کو پارلیمنٹ کے دس ممبروں کی رائے کا تابع بنا دیا، ہم تو ایک ہی کا غلام بناتے تھے، تم نے دس کا غلام بنا دیا۔ تمہیں فیصلہ کرلو کہ ایک کا غلام ہونا اچھا ہے یا دس بیس کا غلام ہونا؟ ظاہر ہے کہ جس شخص پر ایک کی حکومت ہو، وہ اس سے بہتر ہے جس پر دس بیس کی حکومت ہو، یہ حاصل ہے جمہوری سلطنت کا کہ رعایا کی غلامی سے تو اسے بھی انکار نہیں، مگر وہ یہ کہتی ہے کہ تم دس بیس کی غلامی کرو، اور ہم یہ کہتے ہیں کہ صرف ایک کی غلامی کرو۔''

آگے ارشاد فرماتے ہیں۔

''نظام عالم بدوں اس کے قائم نہیں ہوسکتا کہ مخلوق میں بعض تابع ہوں، بعض متبوع ہوں۔ آزادی مطلق سے فساد برپا ہوتے ہیں۔ اس لئے یہاں آ کر ان کو اپنے دعویٰ آزادی سے ہٹنا پڑتا ہے اور شریعت کو کبھی اپنے دعویٰ سے ہٹنا نہیں پڑتا۔ کیونکہ وہ تو پہلے ہی سے تابعیت و متبوعیت کی حامی ہے۔ وہ تو آزادی کا سبق سکھاتی ہی نہیں، اول ہی دن سے نبی کے اتباع کا حکم دیتی ہے جس سے تمام مخلوق کو ایک کا تابع کر دیا۔ بلکہ اگر کسی وقت خدا تعالیٰ نے ایک زمانے میں دو نبی بھی ایک قوم کی طرف ارسال کئے ہیں تو ان میں بھی ایک تابع تھے۔ دوسرے متبوع تھے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام ایک زمانے میں دو نبی تھے۔ جو بنی اسرائیل اور قوم قبط کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ مگر ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام متبوع تھے۔ حضرت ہارون علیہ السلام تابع تھے، مگر دونوں برابر درجہ میں نہ تھے، اور یہ تابعیت محض ضابطہ کی تابعیت نہ تھی بلکہ واقعی تابعیت تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت ہارون علیہ السلام پر پوری حکومت رکھتے تھے وہ ان کی مخالفت نہ کر سکتے تھے۔''

مزید ارشاد فرماتے ہیں۔

غرض اسلام میں جمہوری سلطنت کوئی چیز نہیں، اسلام میں محض شخصی حکومت کی تعلیم ہے اور جن مفاسد کی وجہ سے جمہوری سلطنت قائم کی گئی ہے وہ سلطنت شخصی میں تو محتمل ہی ہیں اور جمہوریت میں متیقن ہیں، شخصی سلطنت میں یہ خرابیاں بیان کی جاتی ہیں کہ اس میں ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ جو چاہے کرے، حالانکہ ممکن ہے کہ کسی وقت اس کی رائے غلط ہو، اس لئے ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام نہ چھوڑنا چاہئے، بلکہ ایک جماعت کی رائے سے کام ہونا چاہئے۔ میں کہتا ہوں کہ جس طرح شخصی سلطنت کے بادشاہ کی رائے میں کبھی غلطی کا احتمال ہے اسی طرح جماعت کی رائے میں بھی غلطی کا احتمال ہے، کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ ایک شخص کی رائے ہمیشہ غلط ہوا کرے اور دس کی رائے ہمیشہ صحیح ہوا کرے، بلکہ ایسا بھی بکثرت ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کا ذہن وہاں پہنچتا ہے جہاں ہزاروں آدمیوں کا ذہن نہیں پہنچتا، ایجادات عالم میں رات دن اس کا مشاہدہ ہوتا ہے، کیونکہ

جتنی ایجادات ہیں وہ اکثر ایک شخص کی عقل کا نتیجہ ہیں، کسی نے کچھ سمجھا کسی نے کچھ سمجھا ایک نے تار برقی کو ایجاد کیا، ایک نے ریل کا ایجاد کیا، تو موجد اکثر ایک شخص ہوتا ہے اور اس کا ذہن وہاں پہنچتا ہے جہاں صد ہا ہزار ہا مخلوق کا ذہن نہیں پہنچتا۔ علوم میں بھی یہ امر مشاہد ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کسی مضمون کو اس طرح صحیح حل کرتا ہے کہ تمام شراح و محشین کی تقریریں اس کے سامنے غلط ہو جاتی ہیں تو جماعت کی رائے کا غلط ہونا بھی محتمل ہے اب بتلائیے اگر کسی وقت بادشاہ کی رائے صحیح ہوئی اور پارلیمنٹ کی رائے غلط ہوئی تو عمل کس پر ہوگا؟ جمہوری سلطنت میں کثرت رائے سے فیصلہ ہوتا ہے بادشاہ اپنی رائے سے فیصلہ نہیں کرسکتا، بلکہ کثرت رائے سے مغلوب ہو کر غلط رائے کی موافقت پر مجبور ہوتا ہے اور شخصی سلطنت میں بادشاہ اپنی رائے پر ہر وقت عمل کرسکتا ہے اور جمہوریت میں اگر کثرت رائے غلطی پر ہوئی تو صحیح رائے پر عمل کرنے کی کوئی صورت نہیں، سب مجبور ہیں غلط رائے کی موافقت پر، اور یہ کتنا بڑا ظلم ہے، اس لئے یہ قاعدہ کلی غلط ہے کہ کثرت رائے پر فیصلہ کیا جائے بلکہ قاعدہ یہ ہونا چاہئے کہ صحیح رائے پر عمل کیا جائے خواہ وہ ایک شخص ہی کی رائے ہو۔''

مزید آگے ارشاد فرماتے ہیں:

''دوسرے جو لوگ کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھتے ہیں، وہ بادشاہ کو تنہا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں دیتے، وہ پہلے ہی سے اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارا بادشاہ ایسا ضعیف الرائے ہے کہ اس کی تنہا رائے قابل اعتبار نہیں اور وہ نااہل ہے، تو واقعی جو لوگ اپنے بادشاہ کو ایسا سمجھتے ہیں، ہم ان سے گفتگو نہیں کرتے ان کو جمہوریت مبارک ہو، ایسا نااہل بادشاہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کو شخصی سلطنت کا بادشاہ بنا دیا جائے۔ اسلام میں جو شخصی سلطنت کی تعلیم ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ اے اہل حل وعقد! اے جماعت عقلاء! بادشاہ ایسے شخص کو بناؤ جو اتنا صائب الرائے ہو کہ اگر کبھی اس کی رائے سارے عالم کے بھی خلاف ہو تو یہ احتمال ہو سکے کہ شاید اسی کی رائے صحیح ہو، اور جس کی رائے میں اتنی درایت نہ ہو، اس کو ہرگز بادشاہ نہ بناؤ۔ اب بتلاؤ کہ جس کی رائے اتنی زریں ہو کہ سارے عالم کے مقابلے میں بھی اس کی رائے کے صائب ہونے کا احتمال ہو وہ حکومت شخصی کے قابل ہے یا نہیں؟ یقیناً قابل

ہے بشرطیکہ اہل حل وعقد انتخاب میں خیانت نہ کریں۔''

بس ہم شخصی سلطنت کے اس لئے حامی ہیں کہ ہم بادشاہ کو زریں العقل، صائب الرائے سمجھتے ہیں اور تم کثرت رائے کے اس لئے حامی ہو کہ تم اپنے بادشاہ کو ضعیف الرائے اور نااہل سمجھتے ہو، تو ایسے شخص کو بادشاہ بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ جس کے لئے ضم ضمیمہ کی ضرورت ہو، بلکہ پہلے ہی سے بادشاہ ایسے شخص کو بناؤ جو ضم ضمیمہ کا محتاج نہ ہو، مستقبل الرائے ہو اور اگر تم بھی اپنے بادشاہ کو مستقل الرائے، صائب العقل، زریں سمجھتے ہو تو پھر کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھنا، اور کامل العقل کو ناقصین کی رائے کا تابع بنانا ظلم ہے جس کا حماقت ہونا بدیہی ہے۔

بعض لوگوں کو یہ حماقت سوجھی کہ وہ جمہوری سلطنت کو اسلام میں ٹھونسنا چاہتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام میں جمہوریت ہی کی تعلیم ہے اور استدلال میں یہ آیت پیش کرتے ہیں کہ ''وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ '' مگر یہ بالکل غلط ہے ان لوگوں نے مشورہ کی دفعات ہی کو دفع کر دیا اور اسلام میں مشورہ کا جو درجہ ہے اس کو بالکل نہیں سمجھا، اسلام میں مشورہ کا درجہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا تھا کہ اے بریرہ تم اپنے شوہر سے رجوع کرلو۔ قصہ یہ ہے کہ حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پہلے باندی تھیں اور اسی حالت میں ان کا نکاح ایک شخص جن کا نام مغیث تھا، ان کے آقا نے کر دیا تھا جب وہ آزاد ہوئیں تو قانون اسلام کے مطابق ان کو یہ اختیار دے دیا کہ جو نکاح حالت غلامی میں ہوا تھا۔ اگر چاہیں اس کو باقی رکھیں، اگر چاہیں فسخ کر دیں، اصطلاح شریعت میں اس کو اختیار عتق کہتے ہیں اس اختیار کی بنا پر حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے نکاح سابق کو فسخ کر دیا۔ لیکن ان کے شوہر کو ان سے بہت محبت تھی، وہ صدمہ فراق میں مدینہ کے گلی کوچوں میں روتے پھرتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر رحم آیا اور حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے بریرہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا اچھا ہو کہ اگر تم اپنے شوہر سے رجوع کرلو تو وہ دریافت فرماتی ہیں۔ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ آپ کا حکم ہے؟ یا مشورہ کی ایک فرد ہے؟ اگر حکم ہے تو بسر وچشم منظور ہے۔ گو مجھ کو تکلیف ہی

ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حکم نہیں صرف مشورہ ہے حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے صاف عرض کر دیا اگر مشورہ ہے تو میں اس کو قبول نہیں کرتی۔ لیجئے! اسلام میں یہ درجہ ہے مشورہ کا کہ اگر نبی اور خلیفہ بدرجہ اولیٰ رعایا کے کسی آدمی کو کوئی مشورہ دیں تو اس کو حق ہے کہ مشورہ پر عمل نہ کرے اور یہ محض ضابطہ کا حق نہیں بلکہ واقعی حق ہے چنانچہ حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورے پر عمل نہ کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ذرا بھی ناراض نہ ہوئے اور نہ حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو کچھ گناہ ہوا نہ ان پر کچھ عتاب ہوا۔ سو جب امت اور رعایا اپنے نبی یا بادشاہ کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے اسلام میں مجبور نہیں تو نبی یا خلیفہ رعایا کے مشورہ سے کیوں کر مجبور ہو جائے گا کہ رعایا جو مشورہ دیں اسی کے موافق عمل کرے اس کے خلاف کبھی نہ کرے۔

پس "وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ" سے صرف یہ ثابت ہوا کہ حکام رعایا سے مشورہ کر لیا کریں۔ یہ کہاں ثابت ہوا کہ ان کے مشورہ پر عمل بھی ضرور کیا کریں اور اگر کثرت رائے بادشاہ کے خلاف ہو جائے تو وہ کثیرین کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہے اور جب تک ثابت نہ ہو اس وقت تک "وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ" سے جمہوریت ہرگز ثابت نہیں ہو سکتی۔ جب اسلام میں ایک معمولی آدمی بھی بادشاہ کے مشورہ پر مجبور نہیں ہوتا تو تم بادشاہ کو رعایا کے مشورہ پر کیونکر مجبور کرتے ہو؟ آخر اس کی کوئی دلیل بھی ہے، یا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے اور ہمارے پاس حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے دلیل موجود ہے کہ کسی کے مشورے پر عمل کرنا ضروری نہیں، خواہ نبی ہی کا مشورہ کیوں نہ ہو۔ اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اگر حکام رعایا سے مشورہ لیں تو وہ ان کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے ہرگز مجبور نہیں ہیں بلکہ عمل خود اپنی رائے پر کریں خواہ وہ دنیا بھر کے مشورہ کے خلاف کیوں نہ ہو چنانچہ اس آیت میں آگے ارشاد ہے: فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ کہ مشورہ کے بعد جب آپ ارادہ کسی بات کا کریں تو خدا پر بھروسہ کر کے اس پر عمل کریں، یہاں "إِذَا عَزَمْتَ" صیغہ واحد ہے معلوم ہوا کہ عزم میں حضور مستقل تھے۔ اسی طرح آپ کا نائب یعنی سلطان بھی عزم میں مستقل ہے۔ اگر عزم کا مدار کثرت رائے پر ہوتا تو اذا عزمت نہ فرماتے بلکہ اس

کے بجائے اذا عزم اکثر کم فتو کلوا علی اللہ فرماتے، پس جس آیت سے یہ لوگ جمہوریت پر استدلال کرتے ہیں، اس کا اخیر جزو خود ان کے دعویٰ کی تردید کر رہا ہے۔ مگر ان کی حالت یہ ہے کہ ''حفظت شیئا و غابت عنک اشیاء'' کہ ایک جزو کو دیکھتے ہیں اور دوسرے جزو سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں دوسرے اس آیت میں صرف حکام کو یہ کہا گیا ہے کہ وہ رعایا سے مشورہ کر لیا کریں۔ رعایا کو تو یہ حق نہیں دیا گیا کہ از خود استحقاقاً حکام کو مشورہ دیا کرو۔ چاہے وہ مشورہ لیں یا نہ لیں، اہل مشورہ ان کو مشورہ سننے پر مجبور کر سکیں۔ چنانچہ شریعت میں ''اشیروا الحکام و ھو حقکم علیھم'' کہیں نہیں کہا گیا جب رعایا کو از خود مشورہ دینے کا کوئی حق بدرجہ لزوم نہیں اور پھر اسلام میں جمہوریت کہاں ہوئی کیونکہ جمہوریت میں تو پارلیمنٹ کو از خود رائے دینے کا حق ہوتا ہے چاہے بادشاہ ان سے رائے لے یا نہ لے۔'' (تقلیل الاختلاط مع الانام ص ۴۸ و اشرف الجواب ص ۳۰۱ تا ۳۱۰ مطبوعہ ملتان و معارف حکیم الامت ص ۶۲۰ تا ۶۳۰)

حکمرانی ایک ذمہ داری ہے نہ کہ حق

پھر غیر اسلامی شخصی حکومتوں میں اور اسلام کی شخصی حکومت میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ غیر اسلامی معاشروں میں ''شخصی حکومت'' ایک ''حق'' (Prinilege) یا ایک فائدہ (Advantage) سمجھ لیا گیا ہے اسی لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ حق کس کو ملے؟ اور کس کو نہ ملے؟ اور اسی لئے لوگ از خود اس کے حصول کے لئے دوڑ دھوپ کرتے ہیں اس کے برعکس اسلام میں یہ ایک ''امانت'' یا ایک ''ذمہ داری'' ہے جو حکمران کے لئے اسباب عیش فراہم کرنے کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ کندھے پر دنیا و آخرت کا ایک زبردست بوجھ سوار کرنے کے مترادف ہے لہٰذا یہ از خود کوشش کر کے حاصل کرنے کی چیز نہیں ہے بلکہ ایسی چیز ہے جس سے انسان اپنی استطاعت کی حد تک جتنا بھاگ سکے اتنا ہی بہتر ہے۔ اسلام میں اس شخص کو ''حکومت'' کے لئے نااہل قرار دیا گیا ہے جو خود اس کا طلب گار ہو چنانچہ اسلامی سیاست میں ''امیدواری'' (Candidature) کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔

حکومت کے فرائض

لہٰذا جس شخص کو بھی یہ ذمہ داری سونپی جائے اسے اس نقطہ نظر کے ساتھ اسے سنبھالنا ہے کہ ''حکومت'' بذات خود مقصود نہیں جس سے ہر حال میں چمٹے رہنا ضروری ہو، بلکہ اصل مقصود اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے، لہٰذا اگر کبھی حکومت اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی میں تعارض ہوگا تو وہ بلا تامل اپنی حکومت کو اللہ کی خوشنودی پر قربان کروں گا، اس سلسلے میں حکیم الامت ایک وعظ میں فرماتے ہیں۔

''یادرکھو! سلطنت مقصود بالذات نہیں، بلکہ اصل مقصود رضائے حق ہے اگر ہم سے خدا راضی نہ ہو تو ہم سلطنت کی حالت میں فرعون ہیں، اور لعنت ہے ایسی سلطنت پر جس سے ہم فرعون کے مشابہ ہوں۔ اگر سلطنت مقصود بالذات ہوتی تو فرعون، ہامان، نمرود و شداد بڑے مقرب ہونے چاہئیں، حالانکہ وہ مردود ہیں۔ معلوم ہوا کہ سلطنت وہی مطلوب ہے جس میں رضائے حق بھی ساتھ ساتھ ہو اور جس سلطنت میں رضائے حق نہ ہو، وہ وبال جان ہے اگر ہم سے خدا راضی ہو تو ہم پاخانہ اٹھانے پر راضی ہیں، اور اسی حالت میں ہم بادشاہ ہیں آخر حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کیا تمہارے نزدیک پاگل تھے؟ ان کو تو سلطنت ملی ہوئی تھی پھر کیوں چھوڑی؟ محض اس لئے کہ مقصود میں خلل واقع ہوتا تھا؟ معلوم ہوا کہ سلطنت خود مقصود نہیں بلکہ مقصود دوسری چیز ہے کہ اگر اس میں خلل واقع ہونے لگے تو اس وقت ترک سلطنت ہی سلطنت ہے، حضرت ابراہیم بن ادہم ہر فن کے امام ہیں، حدیث میں ثقہ اور محدث ہیں، اور فقہاء میں فقیہ اور صوفیاء میں تو امام ہیں، ان کو کوئی پاگل نہیں کہہ سکتا، جو ان کو پاگل کہے وہ خود پاگل ہے پھر دیکھو تو انہوں نے کیا کیا؟ جب رضائے حق میں سلطنت کو مزاحم دیکھا تو بادشاہت پر لات مار کر الگ ہوگئے۔ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو سلطنت مضر مقصود نہ تھی، تو ان کو اجازت دی گئی کہ منصب خلافت کو قبول کریں اور حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے مضر مقصود تھی تو ان کے لئے حکم ہے لا تلین مال یتیم و لا تقضین بین اثنین.

اس سے صاف معلوم ہوا کہ سلطنت خود مقصود نہیں بلکہ مقصود رضائے حق ہے اگر

سلطنت سے مقصود میں خلل واقع ہو تو اس وقت اس سے منع کیا جائے گا۔"

(تقلیل الاختلاط مع الانام ص ۶۰ تا ص ۶۳، اشرف الجواب ص ۴۵۵، ۴۵۶)

لہٰذا اسلامی حکمران کا فریضہ ہے کہ وہ حکومت کو رضائے الٰہی کا وسیلہ بنانے کے لئے اسلامی احکام پر عمل اور ان کے نفاذ کے لئے اپنی جان توڑ کوشش صرف کرے، ورنہ اس کی حکومت بیکار محض اور اس کا حکومت سے چمٹا رہنا ناجائز و حرام ہے لہٰذا اس کا یہ فرض ہے کہ انتہائی جزرسی کے ساتھ اپنے اقدامات کا جائزہ لیتا رہے اور شریعت کے معاملے میں ادنیٰ غفلت کو گوارا نہ کرے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"سلطنتیں جو گئی ہیں، میرے نزدیک چھوٹی چیزوں کے اہتمام کی غفلت ہی سے گئی ہیں کیونکہ چھوٹی چھوٹی جزئیات کی طرف سے جو غفلتیں ہوتی رہتی ہیں وہ سب مل کر ایک بہت بڑا مجموعہ غفلتوں کا ہو جاتا ہے جو آخر میں رنگ لاتا ہے اور اثر زوال کا موجب ہوتا ہے نیز جب چھوٹی چھوٹی باتوں کا اہتمام نہیں ہوتا تو غفلت کی عادت پڑ جاتی ہے، پھر بڑے بڑے امور میں بھی غفلت ہونے لگتی ہے اور وہ براہ راست مخل ہیں سلطنت کی"۔ (اصلاح المسلمین ص ۵۲۷ بحوالہ الافاضات ص ۷ ملفوظ ۲۵۹)

مسلمان حاکم کا فرض جس طرح یہ ہے کہ وہ خود انصاف کے خلاف کوئی کام نہ کرے اسی طرح اس کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں کو بھی ظلم نہ کرنے دے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"حاکم تنہا اپنی احتیاط سے نجات نہیں پا سکتا بلکہ اس کا انتظام بھی اس کے ذمے ہے کہ متعلقین بھی ظلم نہ کرنے پائیں جس کی صورت یہ ہے کہ عام طور سے اشتہار دے دے کہ میرے یہاں رشوت کا بالکل کام نہیں اس لئے اگر میرے عملے میں بھی کوئی شخص کسی سے رشوت مانگے تو ہرگز نہ دے، بلکہ ہم سے اس کی اطلاع کرے، پھر اطلاع کے بعد جس نے ایسی حرکت کی ہو، اس سے رقم واپس کرائے اور کافی سزا دے...... نیز حکام کو یہ بھی چاہئے کہ لوگوں کے تعلقات براہ راست اپنے سے رکھیں، کسی شخص کو واسطہ نہ بنائیں، کیونکہ یہ واسطے بہت ستم ڈھاتے ہیں۔ اگر کہو کہ صاحب یہ تو بڑا مشکل ہے، تو حضرت! حکومت کرنا آسان نہیں، یہ منہ کا نوالہ نہیں ہر وقت جہنم کے کنارے پر ہے۔" (انفاس عیسیٰ ص ۲۲۴، ۲۲۵ جلد ا باب ۴)

اسلامی حکومت میں حکمران اور علماء کے درمیان تقسیم کار کیا ہونے چاہئے؟ اس کے بارے میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

''حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں دو شانیں تھیں، شان نبوت اور شان سلطنت، اس کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی دونوں کے جامع تھے، مگر اب یہ دونوں شانیں دو گروہوں پر تقسیم ہوگئیں، شان نبوت کے مظہر علماء ہیں اور شان سلطنت کے مظہر سلاطین اسلام، اب اگر یہ سلاطین علماء سے استغناء کرتے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک شان سے اعراض لازم آتا ہے، اور اگر علماء سلاطین کی مخالفت کرتے ہیں تو اس سے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ایک شان سے اعراض لازم آتا ہے، اب صورت دونوں کے جمع کرنے کی یہ ہے کہ سلاطین سے تو میں یہ کہتا ہوں کہ وہ اپنی حدود میں کوئی حکم اس وقت تک نافذ نہ کریں جب تک علماء حق سے استفتاء نہ کرلیں، اور علماء سے یہ کہتا ہوں کہ وہ نفاذ کے بعد اس پر کاربند ہوں، اگر یہ دونوں شانیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ہیں اس طرح جمع ہوجائیں تو مسلمانوں کی بہبود اور فلاح کی صورت نکل آئے، اور ان کی ڈوبتی ہوئی کشتی ساحل پر جا لگے، ورنہ اللہ ہی حافظ ہے۔'' (اصلاح المسلمین، ص ۵۳۶)

مباحات کے دائرے میں رہتے ہوئے حکمران کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ عقلمند اور تجربہ کار لوگوں سے مشورہ لیتا رہے، لیکن مشورے کے بعد جب کسی جانب رجحان ہوجائے اور اللہ کے بھروسے پر اس کے مطابق فیصلہ کردے تو تمام لوگوں پر اس کی اطاعت واجب ہے، خواہ ان کی رائے کے خلاف ہو۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

''سلطان کو چاہئے کہ ہمیشہ عقلاء سے رائے لیتا رہے، بدوں رائے لئے بہت سی باتیں نظر سے غائب رہتی ہیں، اور یہ مشورہ اور رائے تو مطلوب ہے، مگر یہ مخترعہ متعارفہ جمہوریت محض گھڑا ہوا ڈھکوسلہ ہے، بالخصوص ایسی جمہوری سلطنت جو مسلم اور کافر ارکان سے مرکب ہو وہ تو غیر مسلم ہی سلطنت ہوگی، ایسی سلطنت اسلامی نہ کہلائے گی۔''

اس پر ایک صاحب نے عرض کیا کہ اگر سلطان کے مشورہ لینے کے وقت اہل شوریٰ میں اختلاف رائے ہوجائے تو اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ سلطان کی رائے سے اختلاف کرنا

مذموم تو نہیں، اس پر فرمایا کہ:

''جو اختلاف حکمت اور مصلحت اور تدین و خیر خواہی پر مبنی ہو وہ مذموم نہیں، مگر اس کی بھی ایک حد ہے، یعنی یہ اختلاف اسی وقت تک جائز ہے جب تک مشورہ کا درجہ رہے، مگر بعد نفاذ اختلاف کرنا یا خلاف کرنا مذموم ہے، نفاذ کے بعد تو اطاعت ہی واجب ہے۔''

(الافاضات الیومیہ ص ۱۱۱، ۱۱۲ جلد ۳ ملفوظ ۲۵۲)

یہ درحقیقت اس آیت قرآنی کی توضیح ہے جس میں باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ

ترجمہ:۔ ''اور ان سے معاملے میں مشورہ کرو، اور جب کوئی عزم کرلو تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو۔''

(۳) اقامت دین کے لئے

سیاسی جدوجہد کا شرعی مقام اور اس کی حدود

تیسرا موضوع جس پر اس مقالے میں حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے ارشادات پیش کرنے مقصود ہیں، یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ ایک صحیح اسلامی حکومت کے قیام اور غیر اسلامی طاقتوں کے شر سے دفاع کے لئے جدوجہد کریں؟ اگر ضروری ہے تو اس جدوجہد کی حدود کیا ہونی چاہئے؟ اس موضوع پر حضرت قدس سرہ نے ایک مستقل رسالہ ''الروضہ الناضرة فی المسائل الحاضرة'' کے نام سے تحریر فرمایا ہے جس میں اصولی طور پر سیاسی جدوجہد کی شرعی حیثیت کو بھی واضح فرمایا ہے، اور اپنے زمانے کے سیاسی حالات کے بارے میں اپنی رائے بھی ظاہر فرمائی ہے۔ یہ رسالہ مختصر مگر بہت پرمغز اور جامع ہے۔ لیکن چونکہ اہل علم کے لئے لکھا گیا ہے، اس لئے اس میں علمی اور اصطلاحی اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ اس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

''مدافعت کفار کی مطلقاً اہل اسلام سے، اور خصوص سلطنت اسلامیہ سے جس میں خلافت و غیر خلافت، اور جس میں سلطنت اسلامیہ واقعیہ و سلطنت اسلامیہ مزعومہ کفار سب

داخل ہیں، پھرخصوص شعائر اسلام سے جن میں مقامات مقدسہ، بالخصوص حرمین شریفین بھی داخل ہیں، سب مسلمانوں پر فرض ہے، کبھی علی العین، کبھی علی الکفایہ علی اختلاف الاحوال، مگر اس کی فرضیت کے کچھ شرائط ہیں جو کتب فقہ میں مذکور ہیں، منجملہ ان کے ایک شرط استطاعت بھی ہے، اور استطاعت سے مراد استطاعت لغویہ نہیں، استطاعت شرعیہ ہے جس کو اس حدیث نے صاف کر دیا ہے۔

"عن ابی سعید الخدری عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من رای منکم منکر افلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ "
(الحدیث رواہ مسلم، مشکوٰۃ باب الامر بالمعروف)

ظاہر ہے کہ استطاعت باللسان ہر وقت حاصل ہے، پھر اس کے انتفاء کی تقدیر کب متحقق ہوگی؟ اس سے ثابت ہوا کہ استطاعت سے مراد یہ ہے کہ اس میں ایسا خطرہ نہ ہو جس کی مقاومت بظن غالب عادتاً ناممکن ہو۔ اسی طرح ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس دفاع کے بعد اس سے زیادہ شر میں مبتلا نہ ہو جائیں، مثلاً کفار کی جگہ کفار ہی مسلط ہوں یا مرکب کافر و مسلم سے کہ مجموعہ تابع اخس کے ہوتا ہے، کیونکہ اس صورت میں غایت ہی مفقود ہے، اور وہ اخلاء الارض من الفساد ہے، اور قاعدہ ہے............الشئ اذا خلا عن الغایہ انتفی.

اور اگر ایسا خطرہ ہو تو پھر وجوب تو ساقط ہو جائے گا، باقی جواز، اس میں تفصیل ہے، بعض صورتوں میں جواز بھی نہیں، بعض میں جواز بلکہ استحباب بھی ہے۔ اور مدار بناء جواز وعدم جواز یا استحباب کا اجتہاد اور رائے پر ہے۔ پس اس میں دو اختلاف کی گنجائش ہے۔ ایک علمی کہ واقعات سے ایک شخص کے نزدیک عدم جواز کی بناء متحقق ہے اور دوسرے کے نزدیک جواز یا استحباب کی، دوسرا عملی کہ باوجود بناء جواز یا استحباب پر متفق ہونے کے ایک نے بناء پر عدم وجوب رخصت پر عمل کیا، دوسرے نے بنا پر استحباب عزیمت پر عمل کیا۔ ایک کو دوسرے پر ملامت کرنے کا حق نہیں۔ اور اگر کسی مقام پر تسلط مسلمان ہی کا ہو، مگر وہ مسلمان کافر سے مسالمت رکھتا ہو تو اس کو تسلط کافر کہنا محل تامل ہے۔" (افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ ص ۱۰)

خلاصہ یہ ہے کہ اگر استطاعت ہو اور کسی بڑے مفسدے کا اندیشہ نہ ہو تو یہ جدو جہد

واجب ہے، کبھی علی العین اور کبھی علی الکفایہ، لیکن اگر کسی بڑے مفسدے کا اندیشہ ہو یا استطاعت نہ ہو تو واجب نہیں، لیکن مختلف حالات میں جائز یا مستحب ہو سکتی ہے، اور اس کے تعین میں اہل علم کی آراء بھی مختلف ہو سکتی ہے، اور یہ اختلاف آراء اگر اخلاص کے ساتھ ہو تو نہ مذموم ہے نہ اس میں کسی کو دوسرے پر ملامت کرنے کا حق ہے۔

لیکن چونکہ دین کا مقصود اصلی سیاست نہیں، بلکہ دیانات اور ان کے ذریعے رضائے حق کا حصول ہے جیسا کہ مقالے کے آغاز میں حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ ہی کے الفاظ میں اس کی تفصیل عرض کی جا چکی ہے۔ اس لئے ہر قسم کی سیاسی جدوجہد شرعی احکام کے دائرے میں رہ کر ہونی چاہئے۔ سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے دین کے کسی معمولی سے معمولی حکم یا تقاضے کو بھی قربان کرنا جائز نہیں ہے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب جدوجہد کرنے والا پورے اخلاص اور للہیت کے ساتھ صرف دین حق کی سربلندی اور باری تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کی نیت سے جدوجہد کر رہا ہو اور محض جاہ وجلال کا حصول اس کا مطمح نظر نہ ہو، اور وہ شدید نفسانی تقاضوں کے باوجود اپنے آپ کو شریعت کے تابع رکھنے پر قادر ہو، ورنہ سیاست ایسا خارزار ہے جس میں قدم قدم پر نام ونمود اور جاہ وجلال کے فتنے پیدا ہوتے ہیں، نفس وشیطان کی تاویلات انسان پر یلغار کرتی ہیں، اور بسا اوقات وہ ان تمام محرکات سے مغلوب ہو کر اسی راستے پر چل پڑتا ہے جس پر دنیا جاری ہے، اور رفتہ رفتہ اس کی سیاست اسلامی سیاست کے بجائے لادینی سیاست ہو کر رہ جاتی ہے۔

سیاسی جدوجہد اور تزکیہ اخلاق

لہٰذا اس جدوجہد کی شرط اول یہ ہے کہ انسان کے اعمال واخلاق کا تزکیہ ہو چکا ہو۔ ور اس کے جذبات وخیالات اعتدال کے سانچے میں ڈھل چکے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ٓنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تئیس سالہ عہد نبوت میں ابتدائی تیرہ سال اس طرح گزرے ہیں کہ نہ ان میں کوئی جہاد ہے نہ حکومت وریاست ہے، نہ کسی قسم کی سیاسی جدوجہد ہے کوئی اگر مارتا اور اذیتیں دیتا ہے تو اس کے جواب میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں

اور اس کے بجائے مسلسل صبر کی تعلیم و تلقین کی جارہی ہے۔ یہ تیرہ سال تعلیم و تربیت اور تزکیہ اخلاق کے سال ہیں، مجاہدات نفس کی اسی بھٹی سے گزرنے کے بعد جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اخلاق واعمال صیقل ہو چکے تو اس کے بعد مدنی زندگی میں حکومت و سیاست اور جہاد وقتال کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہ اسی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''دیکھئے اس کی تائید میں ایک بارنکتہ بتلاتا ہوں وہ یہ کہ مسلمانوں کو مکہ میں رہتے ہوئے قتال کی اجازت نہیں ہوئی، مدینہ میں پہنچ کر اجازت ہوئی اس کی کیا وجہ ہے، ظاہر میں یہ سمجھتے ہیں کہ قلت جماعت وقلت اسباب اس کا سبب تھا، یہ خلاف تحقیق ہے، کیونکہ مدینہ ہی میں پہنچ کر کیا جماعت بڑھ گئی تھی؟ کفار کا پھر بھی غلبہ تھا۔ مدینہ کی تمام جماعت تمام عرب کے مقابلے میں کیا چیز تھی؟ بلکہ اگر یہ دیکھا جائے کہ تمام کفار عالم کے مقابلے میں یہ اجازت ہوئی تھی، تب تو مدینہ کیا سارا عرب بھی قلیل تھا اسی طرح مدینہ پہنچ کر سامان میں کیا زیادتی ہوگئی تھی؟...... نصوص سے خود معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی جماعت کفار کے مقابلے میں اکثر مواقع میں اس قدر کم ہوتی تھی کہ ملائکہ کا جوڑ لگایا جاتا تھا...... اور یہ صورت ملائکہ کی مکہ میں رہتے ہوئے بھی ممکن تھی مگر پھر بھی اس صورت کو اختیار کر کے وہاں اجازت نہ دی گئی تو اس کی کوئی اور وجہ بتلانی چاہئے۔ اہل ظاہر اس کی شافی وجہ نہیں بتلا سکتے۔ محققین نے فرمایا ہے کہ اصل بات یہ تھی کہ مکہ میں عام مسلمانوں کے اندر اخلاق حمیدہ، اخلاص وصبر و تقویٰ کامل طور پر راسخ نہ ہوئے تھے اس وقت اگر اجازت قتال کی ہوجاتی تو سارا مقابلہ جوش وغضب اور انتقال النفس کے لئے ہوتا، محض اخلاق اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے نہ ہوتا، اور اس حالت میں وہ اس قابل نہ ہوتے کہ ملائکہ کی جماعت سے ان کی امداد کی جاوے۔ اور حمایت الٰہی ان کے شامل حال ہو۔ چنانچہ آیت مذکورہ میں (بَلٰٓی اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا) کی شرط بتلا رہی ہے کہ حمایت الٰہی اسی وقت متوجہ ہوتی ہے جب کہ مسلمان صبر وتقویٰ میں راسخ ہوں۔ اور تقویٰ کے معنی ہیں: احتراز عمانهى الله عنه، امتثال ما امربه جس میں اخلاص اور احتراز عن الریاء وعن شائبہ النفس بھی داخل ہے) اور مدینہ میں پہنچ کر یہ

اخلاق راسخ ہو گئے تھے۔ مہاجرین کو مکہ میں رہنے کی حالت میں کفار کی ایذاء پر صبر کرنے سے نفس کی مقاومت سہل ہو گئی نیز قوت غضب نفسانی ضعیف بلکہ زائل ہو گئی تھی۔

پھر ہجرت کے وقت جب انہوں نے اپنے وطن، اہل وعیال اور مال و دولت سب پر خاک ڈال دی تو ان کی محبت الٰہی کامل ہو گئی، اور محبت دنیا ان کے قلب سے نکل گئی۔ انصار مدینہ نے مہاجرین کے ساتھ جو سلوک کیا اس سے ان کے قلوب بھی محبت الٰہی سے لبریز اور محبت دنیا سے پاک ہو گئے تھے چنانچہ انصار نے خوش خوش ان حضرات کو اپنے مکانات و اموال میں شریک کرنا چاہا۔

غرض واقعہ ہجرت سے مہاجرین و انصار دونوں کا امتحان ہو گیا جس میں وہ کامل اترے۔ اس کے بعد ان کو اجازت قتال دی گئی کہ اب جو کچھ کریں گے محض خدا کے لئے کریں گے۔ جوش غضب اور خواہش انتقام اور شفاء غیظ نفس کے لئے کچھ نہ کریں گے اس وقت یہ اس قابل ہوں گے کہ حمایت الٰہی ان کا ساتھ دے اور ملائکہ رحمت ان کی مدد کریں۔ چنانچہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات اس پر شاہد ہیں کہ وہ جو کچھ کرتے تھے خدا کے لئے کرتے تھے، حتیٰ کہ مثنوی میں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک یہودی کو معرکہ قتال میں پچھاڑا اور ذبح کا ارادہ کیا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ اس کم بخت نے آپ کے چہرہ مبارک پر تھوکا۔ اب چاہئے تھا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کو فوراً ہی ذبح کر ڈالتے مگر تھوکنے کے بعد فوراً اس کے سینے پر سے کھڑے ہو گئے۔ اور فوراً اسے چھوڑ دیا۔ وہ یہودی بڑا متعجب ہوا...... اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس کی وجہ پوچھی کہ اگر آپ نے مجھ کو کافر سمجھ کر قتل کرنا چاہا تھا تو تھوکنے پر کیوں رہا کر دیا؟...... حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ...... بات یہ ہے کہ اول جب میں نے تجھ پر حملہ کیا تو اس وقت بجز رضائے حق کے مجھے کچھ مطلوب نہ تھا۔ اور جب تو نے مجھ پر تھوکا تو مجھے غصہ اور جوش انتقام پیدا ہوا میں نے دیکھا کہ اب میرا تجھے قتل کرنا محض خدا کے لئے نہ ہو گا بلکہ اس میں نفس کی بھی آمیزش ہو گی۔ اور میں نے چاہا کہ نفس کے لئے کام کر کے اپنے عمل کو ضائع کروں، اس لئے تجھے رہا کر دیا۔ وہ یہودی فوراً مسلمان ہو گیا اور سمجھ گیا کہ واقعی یہی مذہب

حق ہے۔ جس میں شرک سے اس درجہ نفرت دلائی گئی ہے کہ کوئی کام نفس کے لئے نہ کرو بلکہ محض خدا کے لئے ہر کام کرو۔ دوستی اور دشمنی میں بھی نفس کی آمیزش سے روکا گیا ہے۔

اب ہماری یہ حالت ہے کہ جو لوگ خدمت اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں ان میں اکثر وہ لوگ ہیں جو نفس کے واسطے کام کرتے۔ اپنے ذرا ذرا سے کارناموں کو اچھالتے اور اخباروں میں شائع کرتے ہیں۔ احکام الٰہی کی پرواہ نہیں کرتے، بس ان کا مقصود یہ ہے کہ کام ہونا چاہئے خواہ شریعت کے موافق ہو یا مخالف، چندہ میں جائز و ناجائز کی پرواہ نہیں، صرف میں حلال وحرام کا خیال نہیں، پھر حمایت الٰہی ان کے ساتھ کیوں کر ہو؟ بلکہ اب تو یہ کہا جاتا ہے کہ میاں مسئلے مسائل کو ابھی رہنے دو اس وقت تو کام کرنا چاہئے۔ بعد کو مسئلے مسائل دیکھے جائیں گے۔ (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ) ان صاحبوں کو یہ خبر نہیں کہ مسئلے مسائل کے بغیر تو مسلمان کو نہ دنیوی فلاح ہو سکتی ہے، نہ اخروی، اور سب سے زیادہ اخلاص نیت کی ضرورت ہے، جس کا یہاں صفر ہے۔ (وعظ محاسن اسلام در مجموعہ "محاسن اسلام" ص ۲۸۰ مطبوعہ ملتان)

یہ بات مشہور ہے کہ حضرت حکیم الامت قدس سرہ ہندوستان کی سیاسی تحریکات سے الگ رہے، اس دوران ایک صاحب نے یہ پیش کش کی کہ ہم آپ کو امیر المومنین بناتے ہیں۔ آپ ہماری قیادت فرمایئے حضرت نے اس پیشکش کا مناسب جواب دینے کے بعد فرمایا۔

"سب سے پہلے جو امیر المومنین ہو کر حکم دوں گا وہ یہ ہوگا کہ دس برس تک سب تحریک اور شور وغل بند۔ ان دس سالوں میں مسلمانوں کی اصلاح کی کوشش کی جائے گی۔ جب یہ قابل اطمینان ہو جائیں گے تب مناسب حکم دوں گا۔" (الافاضات الیومیہ ص ۶۷ ج ۲ ملفوظات ۸۹ ملقب بہ تدبیر الفلاح)

اگر ہم حقیقت پسندی سے اپنے حالات کا جائزہ لیں تو محسوس ہوگا کہ حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے اس اقتباس میں ہماری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے، اگر آج ہماری سیاست کی بیل منڈھے نہیں چڑھتی تو اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم مکی زندگی کے تیرہ سال کی چھلانگ لگا کر پہلے ہی دن سے مدنی زندگی کا آغاز کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو اخلاقی اور روحانی اعتبار سے تیار کئے بغیر اصلاح قوم کا جھنڈا لے کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ جھنڈا کس طرح پکڑا جاتا ہے؟ نہ ہمیں یہ پتہ ہے کہ اسے سربلند

رکھنے کا طریقہ کیا ہے؟ نہ ہم نے اس کام کی کوئی تربیت حاصل کی ہے، بس ہم نے کچھ دوسری قوموں کو اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے جھنڈا اٹھائے دیکھا تو انہی کی نقالی ہم نے بھی شروع کر دی نتیجہ یہ ہے کہ ہماری سیاسی جدوجہد کا طرز و انداز، ہماری کوششوں کا طریق کار، ہماری اختیار کی ہوئی تدبیریں، تقریباً سب کی سب وہ ہیں جو ہم نے دوسری قوموں سے مستعار لی ہیں، اور ان کو شریعت کی کسوٹی پر صحیح طریقے سے پرکھے بغیر اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ جب ان طریقوں سے لادینی سیاست کامیاب ہو سکتی ہے تو اسلامی سیاست بھی کامیابی کی منزل تک پہنچ سکتی ہے۔ حالانکہ اسلامی سیاست کو لادینی سیاست پر قیاس کرنا کھجور کے درخت کو کنویں پر قیاس کرنے کے مترادف ہے۔

سیاسی تدابیر

حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے اپنی تصانیف اور مواعظ و ملفوظات میں جابجا اس بات پر زور دیا ہے کہ اسلامی سیاست میں صرف مقصد کا نیک اور شریعت کے موافق ہونا کافی نہیں، بلکہ اس کے طریق کار اور اس کی تدبیروں کا بھی شریعت کے مطابق ہونا ضروری ہے، اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ وہ شریعت کے احکام پس پشت ڈال کر اور ان کی خلاف ورزی کر کے اسلامی حکومت قائم کرے گا تو وہ ایسی خام خیالی میں مبتلا ہے جس کا نتیجہ محرومی کے سوا کچھ نہیں۔ اگر اس طرح کوئی حکومت اس نے قائم کر بھی لی تو وہ اسلامی حکومت نہیں، بلکہ اسلامی حکومت کا دھوکہ ہوگا۔

جیسا کہ مقالے کے آغاز میں حضرت حکیم الامت کا ارشاد ناقابل انکار دلائل کے ساتھ گزر چکا ہے۔ اسلام میں سیاست و حکومت بذات خود مقصود نہیں، بلکہ اصل شریعت کا اتباع اور اس کے نتیجے میں رضائے حق کا حصول ہے، اس لئے یہ طرز فکر اسلام کے دائرے میں نہیں کھپ سکتا کہ اسلامی حکومت کے قیام کی جدوجہد میں اسلام کے بعض احکام کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے، اور اعلیٰ مقصد کے حصول کے لئے جزوی شرعی احکام کی قربانی دی جا سکتی ہے۔ اس کے بجائے مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ شرعی احکام کے دائرے میں رہ کر جدوجہد کرے، اور ہر اس طریقے سے اپنا دامن بچائے جس سے کسی شرعی حکم کی خلاف

ورزی ہوتی ہو۔ مسلمان کی کامیابی کا راز اتباع شریعت میں ہے اسی پر نصرت الٰہی کا وعدہ ہے لہٰذا کامیابی انشاء اللہ اسی طریقے سے ہوگی۔ اور اگر بالفرض کسی شرعی حکم کی پابندی کی وجہ سے ظاہراً کوئی کامیابی حاصل نہ ہوسکے تب بھی مسلمان اس سے زیادہ کا مکلف نہیں اس ناکامی کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے اور نہ اس سے آخرت میں اس ناکامی پر باز پرس ہوگی۔ اگر وہ شریعت کے فرمان پر چل رہا ہے تو وہ پوری طرح کامیاب اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر کا مستحق ہے اور اس کی زندگی کا اصل مقصد پوری طرح حاصل ہے۔ لہٰذا سیاسی جدوجہد کے دوران ہر تدبیر اور ہر اقدام کے بارے میں یہ اطمینان کر لینا ضروری ہے کہ وہ شرعی نقطہ نظر سے جائز ہے یا ناجائز ہے؟ کسی تدبیر کو اختیار کرنے کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ اس تدبیر کا موجودہ سیاست کی دنیا میں رواج عام ہے یا وہ سیاسی تحریکوں میں بہت موثر ثابت ہوئی ہے، اور اسے آج کی سیاست میں ناگزیر سمجھا جاتا ہے اگر وہ اصول شرعیہ کے اعتبار سے جائز نہ ہو، یا شرعی مفاسد پر مشتمل ہو تو خواہ موجودہ سیاست کے علمبردار اسے کتنا ضروری کیوں نہ سمجھتے ہوں، اسے ہرگز اختیار نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ سیاست مقصود نہیں، شریعت کی اطاعت مقصود ہے۔

سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے حالات میں ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک باز صحابہ نے موثر سے موثر تدبیریں صرف اس لئے چھوڑ دیں کہ وہ شریعت کے خلاف تھیں۔

غزوہ بدر کے موقع پر جب حق و باطل کا پہلا فیصلہ کن معرکہ درپیش تھا۔ اور تین سو تیرہ بے سروسامان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اتنی بڑی طاقت سے ٹکر لینے جارہے تھے تو ایک ایک شخص کی بڑی قدر و قیمت تھی، اور قدرتی طور پر نفری میں تھوڑا سا بھی اضافہ کامیابی میں موثر ہوسکتا تھا، اس موقع پر حضرت حذیفہ ابن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے جاں نثار صحابی اور ان کے والد نے لشکر میں شامل ہونا چاہا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس بناء پر جہاد میں شامل ہونے سے روک دیا کہ آتے وقت انہیں کفار نے گرفتار کر لیا تھا اور اس وعدے پر چھوڑا تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد نہیں کریں گے۔ آنحضرت صلی

اللہ علیہ وسلم نے انہیں جہاد کی شرکت سے روکتے ہوئے فرمایا۔

نفی بعهدو نستعين الله تعالىٰ عليهم

ترجمہ:۔ ''ہم ان سے کئے ہوئے وعدے کو پورا کریں گے اور ان کے خلاف اللہ تعالیٰ سے مدد مانگیں گے۔'' (صحیح مسلم و بخاری ص ۱۰۲، ج ۲، سیر اعلام النبلاء ص ۳۶۲ و ۳۶۳، ج ۲ والاصابہ ص ۲۲۳، ج ۲)

اسی غزوہ میں ایک نہایت تجربہ کار مشرک شخص نے جو اپنی بہادری اور جنگجوئی میں مشہور تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لڑائی میں شامل ہونا چاہا لیکن یہ حق و باطل کا پہلا معرکہ تھا اور اس پہلے معرکے میں کسی کافر کی مدد لینا اسلام کو گوارا نہ تھا۔ چنانچہ اس وقت حکم یہی تھا کہ کافروں سے مدد نہ لی جائے۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بھی لڑائی میں شامل کرنے سے انکار فرما دیا اور ارشاد فرمایا۔

ارجع ، فلن استعين بمشرك

ترجمہ:۔ ''میں کسی مشرک سے ہرگز مدد نہ لوں گا۔'' (جامع ترمذی، کتاب السیر باب فی اہل الذمۃ یغزون مع المسلمین)

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا مقام تو بہت بلند ہے۔ بعد کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اسی اصول پر ہمیشہ کاربند رہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا رومیوں سے جنگ بندی کا معاہدہ تھا اس کی مدت ختم ہونے سے پہلے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی فوجیں سرحد پر ڈال دیں اور مدت کے ختم ہوتے ہی حملہ کر دیا، رومی لوگ بے خبری میں تھے اس لئے پسپا ہونے شروع ہو گئے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فاتحانہ آگے بڑھتے رہے اتنے میں حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پیچھے سے گھوڑا دوڑاتے ہوئے آئے اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو روک کر انہیں ایک حدیث سنائی جس کی رو سے یہ حملہ شرعاً ناجائز تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ سمجھتے تھے کہ حملہ چونکہ جنگ بندی ختم ہونے کے بعد ہوا ہے اس لئے یہ عہد شکنی میں داخل نہیں ہے۔ لیکن حدیث سنتے ہی کوئی تاویل کرنے کے بجائے اپنے پورے لشکر کے ساتھ واپس لوٹ گئے۔ (جامع ترمذی، ابواب السیر باب ماجاء فی الغدر)

جو سالار لشکر اپنی کامیاب تدبیر کے بعد فتح کے نشے میں آگے بڑھ رہا ہو، اس کے لئے اپنی یلغار روکنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ چہ جائیکہ مفتوحہ علاقہ بھی واپس کر دے۔ لیکن مقصد

چونکہ سیاست وحکومت نہیں، اطاعت شریعت تھا۔ اس لئے تدبیر کے ناجائز ہونے کا علم ہوتے ہی اس ساری تدبیر سے دستبردار ہوگئے۔

غرض ہماری تاریخ ایسی درخشاں مثالوں سے بھری پڑی ہے جن میں مسلمانوں نے موثر تدبیر کے لئے بھی شریعت کی ادنیٰ خلاف ورزی گوارا نہیں کی بلکہ اسے ترک کردیا۔

لہٰذا اسلامی سیاست میں جدوجہد کی تدبیروں کو شرعاً جائز ہونا ضروری ہے لیکن آج کل عموماً سیاسی جدوجہد کے دوران یہ پہلو نظروں سے بالکل اوجھل ہوجاتا ہے، جو تدبیریں لادینی سیاست کے علمبردار اختیار کئے ہوئے ہیں اور جن کا رواج عام ہوچکا ہے انہیں یہ دیکھے بغیر اختیار کرلیا جاتا ہے کہ تدبیریں اپنے لوازم کے ساتھ جائز بھی ہیں یا نہیں؟ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے سیاسی جدوجہد کے کئی مروجہ طریقوں پر شرعی نقطۂ نظر سے بحث فرمائی ہے اوران کے شرعی حکم کو واضح فرمایا ہے۔

بائیکاٹ اور ہڑتال کا شرعی حکم

مثلاً حکومت سے مطالبات منوانے کے لئے آج کل ہڑتالوں کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، اگر بات صرف اس حد تک ہوتی کہ لوگ اپنی خوشی سے احتجاجاً کاروبار بند کردیں تو دوسرے مفاسد کی عدم موجودگی میں اسے ایک مباح تدبیر کہا جاسکتا تھا، چنانچہ حضرت فرماتے ہیں۔

"بائیکاٹ یا نان کوآپریشن یہ شرعاً افراد جہاد میں سے نہیں، دلائل میں ملاحظہ کیا جائے، بلکہ مستقل تدابیر مقاومت کی ہیں جو فی نفسہ مباح ہیں۔"

(الروضۃ، الناصرۃ، افادات اشرفیہ درمسائل سیاسیہ ص ۱۰)

لیکن ایسی ہڑتال جو لوگوں نے کلیتاً اپنی خوشی سے کی ہو آج عملاً دنیا میں اس کا وجود نہیں ہے، اکثر وبیشتر تو لوگوں کو ان کی خواہش اور رائے کے برخلاف ہڑتال میں حصہ لینے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی حصہ نہ لے تو اس کو جسمانی اور مالی اذیتیں دی جاتی ہیں، سنگ باری اور آتشزدگی تو ہڑتال کا ایک لازمی حصہ بن گئے ہیں، سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کرکے لوگوں کے لئے اپنی ضرورت سے چلنا پھرنا مسدود کردیا جاتا ہے، چلتی ہوئی گاڑیوں پر پتھراؤ ہوتا ہے، بہت سے لوگ اسی قسم کی ایذاء رسانیوں کے خوف سے اپنا کاروبار بند رکھتے ہیں اور جو

ضرورت مند شخص باہر نکلنے پر کسی وجہ سے مجبور ہو وہ ہر وقت جانی و مالی نقصان کے خطرے میں رہتا ہے اور بسا اوقات کوئی نہ کوئی بے گناہ مارا جاتا ہے، بعض مرتبہ مریض علاج کو ترس ترس کر رخصت ہو جاتے ہیں اور بہت سے غریب لوگ فاقہ کشی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

یہ تمام باتیں ہڑتال کا ایسا لازمی حصہ بن کر رہ گئی ہیں کہ ان کے بغیر کسی ''کامیاب ہڑتال'' کا تصور نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام باتیں شرعاً حرام و ناجائز ہیں اور جو چیز ان حرام و ناجائز باتوں کا لازمی سبب بنے وہ کیسے جائز ہو سکتی ہے؟

لہٰذا حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے ہڑتال کے مروجہ طریقوں کو شرعاً ناجائز قرار دیا ہے، تحریکات خلافت کے زمانے میں ''ترک موالات'' کے جو طریقے اختیار کئے گئے تھے ان میں ہڑتال بھی داخل تھی، ترک موالات کے تحت یہ تحریک چلائی گئی تھی کہ برطانوی مصنوعات کا بائیکاٹ کیا جائے، چنانچہ اہل تحریک نے ایسی دکانوں پر جو برطانوی مصنوعات فروخت کرتی تھیں رضا کار مقرر کر دیئے تھے، جو لوگوں کو جس طرح ممکن ہو وہاں سے خریداری کرنے سے روکتے تھے، اگر خرید چکے ہوں تو ان کو واپسی پر مجبور کرتے تھے، نیز دکانداروں کو مجبور کرتے تھے کہ وہ ایسی اشیاء اپنی دکانوں میں نہ رکھیں، اگر وہ نہ مانیں تو ان کو نقصان پہنچاتے تھے خواہ اس دکاندار کے پاس کوئی اور ذریعہ معاش نہ ہو، اور اس تجارت کو بند کرنے سے اس کے اہل و عیال پر فاقوں کی نوبت آجائے حضرت ان طریقوں کا شرعی حکم بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

''یہ واقعہ بھی متعدد گناہوں پر مشتمل ہے، ایک مباح فعل کے ترک پر مجبور کرنا بجز بعض خاص تجارتوں کے سبب اشیاء کی خرید و فروخت کا معاملہ اہل حرب تک کے ساتھ بھی جائز ہے چہ جائیکہ معاہدین کے ساتھ...... دوسرے بعد اتمام بیع کے واپسی پر مجبور کرنا اور زیادہ گناہ ہے کیونکہ بدوں قانون خیار کے یہ واپسی بھی شرعاً مثال بیع کے ہے جس میں تراضی متعاقدین شرط ہے، تیسرے نہ ماننے والوں کو ایذا دینا جو ظلم ہے، چوتھے اہل و عیال کو تکلیف پہنچانا کہ یہ بھی ظلم ہے، پانچویں اگر اس کو واجب شرعی بتلایا جاوے تو شریعت کی تغیر و تحریف ہونا......''

اس کے بعد حضرت ہڑتال کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''اس میں بھی وہی خرابیاں ہیں جو نمبر ۳ میں مذکور ہوئیں اور اگر ان احتجاجات مذکور میں شرکت نہ کرنے پر ایذا جسمانی کی بھی نوبت آجاوے تو یہ گناہ ہونے میں اضرار مالی سے بھی اشد اور منافی اقتضائے اسلام ہے..... پھر ان مقاطعات پر مجبور کرنے میں یہ جابرین خود اپنے تسلیم کردہ قانون حریت کے بھی خلاف کررہے ہیں ورنہ کیا وجہ کہ اپنی آزادی کی تو کوشش کریں اور دوسروں کی آزادی کو سلب کریں۔'' (معاملۃ المسلمین، افادات اشرفیہ ص ۲۷، ۲۸)

اس کے علاوہ حضرت نے ہڑتال ہی کے موضوع پر ایک مستقل رسالہ ''تلبین العرائک'' کے نام سے لکھا ہے جس کا اصل موضوع تو تعلیمی اداروں میں طلبہ کی ہڑتال ہے لیکن اس میں مطلق ہڑتال کے بارے میں بھی اصولی بحثیں آگئی ہیں، اس رسالے کا حاصل بھی یہی ہے کہ ہڑتال کا مروجہ طریق کار شریعت کے خلاف اور ناجائز ہے۔ (ملاحظہ ہو امداد الفتاویٰ ص ۲۰۱ ج ۶)

بھوک ہڑتال

اسی طرح مطالبات منوانے کے لئے ایک طریقہ بھوک ہڑتال کا بھی اختیار کیا جاتا ہے اس کے بارے میں حضرت سے سوال کیا گیا تھا کہ ''اگر کوئی گرفتار ہوجائے ان میں سے بعضے لوگ جیل جانے میں مقاطعہ جوعی کرتے ہیں یہاں تک کہ مرجاتے ہیں اور قوم میں ان کی مدح کی جاتی ہے۔'' حضرت نے اس کا شرعی حکم بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

''اس کا خودکشی اور حرام ہونا ظاہر ہے۔ قال اللہ تعالیٰ وَلَا تَقْتُلُوٓا اَنْفُسَكُمْ وفی الهدایه کتاب الاکراه فیاثم کما فی حالة المخمصه وفی العنایة فامتناعه عن التناول کا متناعه من تناول الطعام الحلال حتی تلفت نفسه او عضوه فکان آثما الخ۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ جان بچانا اس درجہ فرض ہے کہ اگر حالت اضطرار میں اندیشہ مرجانے کا ہو، اور مردار کھانے سے جان بچ سکتی ہو کہ اس کا نہ کھانا اور جان دے دینا معصیت ہے، چہ جائیکہ طعام حلال کا ترک اور اس فعل کی مدح کرنے میں تو اندیشہ کفر ہے۔ کہ صریح تکذیب ہے شریعت کی کہ شریعت جس فعل کو مذموم کہتی ہو، یہ اس کو محمود کہتا ہے۔'' (افادات اشرفیہ در مسائل سیاسہ ص ۲۸، ۲۹، نمبر ۲)

ایک اور موقع پر ارشاد فرماتے ہیں۔

''یہ (بھوک ہڑتال) خودکشی کے مترادف ہے اگر موت واقع ہو جائے گی تو وہ موت حرام ہوگی۔'' (الافاضات الیومیہ ص ۳۰ ج ۳ ملفوظ نمبر ۱۴)

پبلسٹی کے مروجہ ذرائع

آج کی سیاست میں پبلسٹی اور پروپیگنڈہ کو بھی نہایت اہم مقام حاصل ہے، اور اس سلسلے میں عموماً مغربی سیاست کے ایک مشہور نمائندے گوئبلز کے اس مقولے پر عمل کیا جاتا ہے کہ

''جھوٹ اتنی شدت سے بولو کہ دنیا اسے سچ جان لے۔''

آج کل کی حکومتیں ہوں، یا لادینی سیاسی جماعتیں وہ تو اس اصول پر عمل کرتی ہی ہیں، لیکن بسا اوقات اسلام کے لئے سیاسی جدوجہد کرنے والے حضرات بھی اس چھائے ہوئے ماحول سے متاثر ہو کر پبلسٹی اور پروپیگنڈے کے مروجہ ذرائع استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں، اور ان کے جائز و ناجائز ہونے کی طرف یا تو دھیان نہیں جاتا یا پھر وہی نظریہ کارفرما ہوتا ہے کہ سیاست کی اصلاح ایک بلند مقصد ہے، اور اس کے حصول کے لئے چھوٹے چھوٹے امور کی قربانی دی جا سکتی ہے۔ غلط بیانی تو حرام ہے ہی لیکن سیاسی مخالفین کی بلاوجہ غیبت، ان کے خلاف ناجائز بدگوئی، ان پر بہتان وافتراء اور تحقیق کے بغیر افواہیں پھیلانا، یا ان پر تحقیق کے بغیر یقین کرنا یہ سب وہ باتیں ہیں جو ہماری سیاسی تحریکات میں شعوری یا غیر شعوری طور پر داخل ہو گئی ہیں، اور ان کی وجہ سے افتراق وانتشار، پارٹی بندیوں اور فتنہ وفساد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے اپنی تصانیف اور مواعظ وملفوظات میں اس طریق کار پر بھی تنقید فرمائی ہے، اور ایسی سیاسی تدبیروں کو ناجائز اور واجب الترک قرار دیا ہے جو ان مفاسد پر مشتمل ہوں۔

اسی طرح جلسے جلوس بھی پبلسٹی اور اپنے نقطۂ نظر کو عوام تک پہنچانے کا اہم ذریعہ سمجھے جاتے ہیں لیکن ان میں بھی بعض اوقات احکام شرعیہ کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اس کے بارے میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

''جب کوئی تدبیر تدابیر منصوصہ کے خلاف اختیار کی جاوے گی اس کو تو ممنوع ہی کہا جاوے گا۔ خصوص جبکہ وہ فعل عبث یا مضر بھی ہو تو اس کی حرمت میں پھر کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ وہاں تو الضرورات تبیح المحظورات کا شبہ بھی نہیں ہو سکتا مثلاً ہڑتال میں جلوس ہیں ان میں وقت کا ضائع ہونا، روپیہ کا صرف ہونا، حاجت مند لوگوں کو تکلیف ہونا، نمازوں کا ضائع ہونا کھلے مفاسد ہیں تو یہ افعال کیسے جائز ہو سکتے ہیں؟ (ایک صاحب نے عرض کیا کہ اگر نیت امداد حق کی ہو؟ تو فرمایا کہ) ان باتوں سے حق کو کوئی امداد نہیں پہنچتی، دوسرے نامشروع فعل نیت سے مشروع نہیں ہو جاتا۔'' (الافاضات الیومیہ ص۱۳۲ ج۵ ملفوظ نمبر ۱۵۲)

مروجہ سیاسی تدابیر کے بارے میں ایک اور موقع پر آپ نے اپنا نقطہ نظر واضح فرمایا ہے، آپ سے پوچھا گیا تھا کہ ''جتھے (حکومت کے) مقابلے کے لئے جاتے ہیں اور گرفتار ہوتے ہیں، خاموش مقابلہ کرتے ہیں، اگر حکومت کی طرف سے تشدد بھی ہو تب بھی جواب نہیں دیا جاتا۔ ان صورتوں کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا۔

''عقلی دو ہی احتمال ہیں، یا تو مقابلے کی قوت ہے یا قوت نہیں، اگر قوت ہے تو گرفتار ہونے کے کیا معنی؟ مقابلہ کرنا چاہئے، اور جب مقابلہ نہیں کر سکتے تو یہ صورت عدم قوت کی ہے جیسا کہ ظاہر ہے تو عدم قوت کی حالت میں قصداً ایسی صورت اختیار کرنے کی خود ضرب و جس میں مبتلا ہو شریعت اجازت نہیں دیتی بلکہ ایسے مخترع مقابلے کے مکارہ (ناگوار امور) پر صبر پر سے کام لینا چاہئے۔ خلاصہ یہ کہ اگر قوت ہے مقابلہ کرو، اگر قوت نہیں صبر کو ان دو صورتوں کے علاوہ تیسری صورت منقول نہیں۔''

آگے ارشاد فرماتے ہیں۔

''اس وقت سب سے بڑی وجہ ناکامی کی یہی ہوئی کہ مسلمانوں کے سر پر کوئی بڑا نہیں، نہ مسلمانوں کی قوت کسی مرکز پر جمع ہے اور نہ ہو سکتی ہے جب تک کہ بالاتفاق ایک کو بڑا نہ بنالیں۔ اگر امام ہو تو سب کام ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ اس کے حکم سے میدان میں جاویں، اگر جان بھی جاتی رہے تو کوئی حرج نہیں، اور یہ کیا کہ بیٹھے بیٹھے جا کر قتل ہو جاویں، یہ کوئی انسانیت ہے؟ اصل بات وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ خیر القرون میں دو ہی صورتیں تھیں کہ قوت کے

وقت مقابلہ، اور عدم قوت کے وقت صبر، اس کے سوا سب من گھڑت تدابیر ہیں۔ اس لئے ان میں خیر و برکت نہیں ہوسکتی، اور جب خیر و برکت نہ ہو اور مسلمان ظاہراً کامیاب بھی ہو جائیں تو اس کامیابی پر کیا خوشی جو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے خلاف تدابیر اختیار کر کے کامیابی حاصل کی جاوے اور ایسی کامیابی کا ہو جانا تو کوئی کمال کی بات نہیں، اس لئے کہ ایسی کامیابی کافروں کو بھی ہو جاتی ہے۔ اور مسلمانوں کی اصل کامیابی تو وہ ہے کہ چاہے غلامی ہو، مگر خدا راضی ہو، اور اگر حکومت ہوئی اور ان کی مرضی کے خلاف ہوئی، وہ راضی نہ ہوئے تو فرعون کی حکومت اور تمہاری حکومت میں کیا فرق ہوا؟ بس ان کے راضی کرنے کی فکر کرو، ان سے صحیح معنوں میں تعلق کو جوڑو، اسلام اور احکام اسلام کی پابندی کرو، ان بتوں کا اتباع تو بہت دن کر کے دیکھ لیا۔ اب خدا کے سامنے سر رکھ کر اور اس سے اپنی حاجت اور ضروریات کو مانگ کر بھی دیکھ لو کہ کیا ہوتا ہے؟" (الافاضات الیومیہ ص ۱۶۸، ۱۶۹، ج ۵ ملفوظ نمبر ۱۹۰)

حکومت کے ساتھ طرز عمل

اسلام نے اپنے احکام میں اصل زور اس بات پر دیا ہے کہ ہر حالت میں احکام شریعت کی اتباع کی جائے، اگر حاکم وقت کی طرف سے خلاف شرع امور کا حکم دیا جائے تو اس کی اطاعت واجب نہیں۔ بلکہ جب تک اکراہ کی شرعی حالت متحقق نہ ہو، شریعت کے احکام پر عمل ضروری ہے، اس راستے میں جتنی تکلیفیں پیش آ جائیں ان پر صبر کرنا چاہئے کہ وہ موجب اجر ہے۔ اسی طرح اگر کوئی حاکم شریعت کے خلاف کام کر رہا ہے تو اسے راہ راست پر لانے کے لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس کی شرائط کے ساتھ انجام دینا بھی ضروری ہے اور ضرورت کے وقت اس کے سامنے اظہار حق بھی، جسے حدیث میں "افضل الجہاد" قرار دیا گیا ہے۔ یہ تمام کام شریعت کے عین مطابق ہیں بشرط یہ کہ شرعی حدود میں ہوں اور پیش نظر اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا اور دین حق کی تبلیغ و نصرت ہو، محض اپنی بہادری جتانا، لوگوں سے داد حاصل کرنا، یا خود طلب اقتدار پیش نظر نہ ہو۔

لیکن آج کی سیاسی فضا میں یہ معاملہ بھی شدید افراط و تفریط کا شکار ہے جو لوگ حزب اقتدار سے وابستہ یا حکومت کے طرف دار ہوتے ہیں، وہ ہر حال میں حکومت کی تعریفوں

کے پل باندھے رکھتے ہیں اور اس کے ہر جائز و ناجائز فعل کی تائید و حمایت کرتے ہیں۔ حکومت کے ناجائز یا ظالمانہ اقدامات کو کھلی آنکھوں دیکھتے ہیں پھر بھی خاموش رہتے ہیں اور ان کی تاویلات تلاش کرتے رہتے ہیں۔ جو صریح مداہنت ہے اور بعض لوگ تو ان ناجائز اقدامات کی حمایت کے لئے تحریف دین تک سے دریغ نہیں کرتے اور دوسری طرف جو لوگ ''حزب اختلاف'' سے وابستہ یا حکومت کے مخالف ہیں وہ ''حکومت کی مخالفت'' کو بذات خود ایک مقصد بنا لیتے ہیں اور اسے سیاسی فیشن کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ خاص طور پر حزب اختلاف یہ بات اپنے فرائض منصبی میں سے سمجھتی ہے کہ وہ حکومت کی ہر بات میں کیڑے نکالے اور اس کی کسی اچھائی کا اعتراف نہ کرے۔ اس طرز عمل کا مقصد بسا اوقات حق کی نصرت کے بجائے حکومت کو بدنام کر کے اپنے اقتدار کا راستہ ہموار کرنا اور عوام سے بہادری کی داد حاصل کرنا ہوتا ہے۔

عوام میں بھی حکام کو وقت بے وقت برا بھلا کہنے اور انہیں گالیاں تک دینے کا رواج عام ہو چکا ہے۔ جلوسوں میں سربراہان حکومت کو ''کتا'' اور ''......سور'' تک بنا کر ان کے خلاف ہائے ہائے کے نعرے لگائے جاتے ہیں۔ مجلسوں میں ایک مشغلے کے طور پر حکام کا ذکر کر کے ان کی برائیاں کی جاتی ہیں۔ جو کسی معقول وجہ کے بغیر ہونے کی وجہ سے غیبت میں تو داخل ہیں ہی، بعض اوقات افتراء اور بہتان کی حدود میں بھی داخل ہو جاتی ہیں، اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ فاسق و فاجر حکمرانوں کو برا کہنا غیبت میں داخل نہیں۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے اس طرز عمل پر بھی تنقید فرمائی ہے۔ حضرت فرماتے ہیں۔

''حجاج بن یوسف اس امت کا سب سے بڑا ظالم مشہور ہے مگر کسی بزرگ کی مجلس میں ایک شخص نے اس پر کوئی الزام لگایا اور غیبت کی تو انہوں نے فرمایا کہ وہ اگرچہ ظالم و فاسق ہے مگر حق تعالیٰ کو اس سے کوئی دشمنی نہیں وہ جس طرح دوسرے مظلوموں کا انتقام حجاج سے لے گا، اسی طرح اگر کوئی حجاج پر ظلم کرے گا تو اس سے بھی انتقام لیا جائے گا۔''

(مجالس حکیم الامت ص ۹۲، ملفوظات رمضان ۱۳۴۸ھ)

اس کے علاوہ حضرت نے کئی مقامات پر یہ بات واضح فرمائی ہے کہ کسی ضرورت کے

بغیر حکام کی علی الاعلان اہانت شرعاً پسندیدہ بھی نہیں ہے۔ فرماتے ہیں۔

"سلاطین اسلام کی علی الاعلان اہانت میں ضرر ہے جمہوریت کا ہیبت نکلنے سے فتن پھیلتے ہیں، اس لئے سلاطین اسلام کا احترام کرنا چاہیے۔" (انفاس عیسیٰ ص ۳۶۹ ج ا باب ۴)

حضرت حکیم الامت کی یہ بات درحقیقت سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی شرح ہے جو حضرت عیاض بن غنم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت کیا ہے۔

"من ارادان ینصح لذی سلطان بامر فلا یبدله علانیه فلکن لیاخذ بیده فیخلوبه فان قبل منه فذاک، والا کان قدادی الذی علیه"

جو شخص کسی صاحب اقتدار کو کسی بات کی نصیحت کرنا چاہے تو اس نصیحت کو علانیہ ظاہر نہ کرے، بلکہ اس کا ہاتھ پکڑ کر خلوت میں لے جائے اگر وہ اس کی بات قبول کرلے تو بہتر ورنہ اس نے اپنا فرض ادا کردیا۔ (مجمع الزوائد ص ۲۲۹ ج ۵ بحوالہ مسند احمد ورجالہ ثقات)

ایک اور وعظ میں حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں۔

"بعض لوگ بعض مصائب سے تنگ ہوکر حکام وقت کو برا بھلا کہتے ہیں، یہ بھی علامت ہے بے صبری کی، اور پسندیدہ تدبیر نہیں، اور حدیث شریف میں اس کی ممانعت بھی آئی ہے فرماتے ہیں۔ "لاتسبوا الملوک" یعنی بادشاہوں کو برامت کہو، ان کے قلوب میرے قبضے میں ہیں میری اطاعت کرو، میں ان کے دلوں کو تم پر نرم کردوں گا۔"
(وعظ الصبر ص ۳۶، ماخوذ از اصلاح المسلمین ص ۵۲۲)

جس حدیث کی طرف حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا ہے وہ مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مختلف الفاظ میں مروی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اس کے یہ الفاظ مروی ہیں۔

"لاتشغلوا قلوبکم لسب الملوک، ولکن تقربوا الی الله تعالیٰ بالدعاء لهم یعطف الله قلوبهم علیکم."

ترجمہ:۔ "اپنے دل بادشاہوں کو برا بھلا کہنے میں مشغول نہ کرو۔ بلکہ ان کے حق میں دعا کرکے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرو، اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو تمہاری طرف متوجہ فرمادیں گے۔" (کنز العمال ص ۲ ج ۶، حدیث ۹ بحوالہ ابن النجار)

اورحضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ الفاظ منقول ہیں۔

"ان اللہ یقول انا اللہ لا الہ الا انا مالک الملک وملک الملوک، قلوب الملوک بیدی، وان العباد اذا اطاعولی حولت قلوب ملوکھم علیھم بالرافہ والرحمہ، وان العباد اذا عصونی حولت قلوبھم علیھم بالسخط والنفمہ، فساموھم سوء العذاب، فلا تشغلوا انفسھم بالدعاء علی الملوک ، ولکن اشغلوا انفسکم بالذکر والتضرع اکفکم ملوککم"

ترجمہ:۔"اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، میں مالک الملک ہوں، اور بادشاہوں کا بادشاہ ہوں، بادشاہوں کے قلوب میرے ہاتھ میں ہیں، اور بندے جب میری اطاعت کرتے ہیں تو میں ان کے بادشاہوں کے دلوں کو ان کی طرف رحمت و رافت سے متوجہ کر دیتا ہوں، اور جب بندے میری نافرمانی کرتے ہیں تو میں ان کے دلوں کو ان کے خلاف ناراضی اور عذاب کے ساتھ متوجہ کر دیتا ہوں، چنانچہ وہ انہیں بدترین اذیتیں پہنچاتے ہیں، لہٰذا تم بادشاہوں کو بددعائیں دینے میں مشغول نہ ہو، بلکہ اپنے آپ کو ذکر اور دعا و تضرع میں مشغول رکھو، میں تمہارے بادشاہوں کے معاملے میں تمہاری مدد کروں گا۔" (مجمع الزوائد ص ۲۴۹، ج ۵ بحوالہ طبرانی، وفیہ ابراہیم بن راشد، وھو متروک)

اورحضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ الفاظ مروی ہیں۔

"لاتسبوا لائمہ وادعوا اللہ لھم بالصلاح فان صلاحھم لکم صلاح."

ترجمہ:۔"ائمہ (سربراہان حکومت) کو برا بھلا نہ کہو، بلکہ ان کے حق میں نیکی کی دعا کرو۔ کیونکہ ان کی نیکی تمہاری بھلائی ہے۔" (السراج المنیر للعزیزی ص ۴۱۱ ج ۴، وقال: اسنادہ حسن)

بہرصورت! حکام کو بلاضرورت برا کہنے کو مشغلہ بنالینا شرعاً پسندیدہ نہیں ہے، اگر وہ اتنے برے ہوں کہ ان کے خلاف خروج (بغاوت) جائز ہو تو پھر شرعی احکام کے مطابق خروج کیا جائے، (جس کی کچھ تفصیل انشاء اللہ آگے آرہی ہے) لیکن بدگوئی کو شیوہ بنانے سے منع کیا گیا

ہے۔غیبت کے نقصان کے علاوہ حضرت حکیم الامت نے اس بدگوئی کے ایک اور نقصان کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے، اور وہ یہ کہ حکومت کی فی الجملہ ہیبت امن وامان کے قیام کے لئے ضروری ہے اور جب یہ ہیبت دلوں سے اٹھ جائے تو اس کا لازمی نتیجہ مجرموں کی بے باکی کی صورت میں نکلتا ہے ملک میں بدامنی پھیلتی ہے، اور اس کا نقصان پوری قوم کو بھگتنا پڑتا ہے۔

حکومت کے غیر شرعی قوانین اور اقدامات کے خلاف چارہ کار

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہڑتال، بھوک ہڑتال اور احتجاج کی مروجہ بیشتر صورتوں کو درمیان سے نکال دیا جائے تو موجودہ حکومتوں کے غیر شرعی قوانین اور اقدامات کے خلاف امت کے پاس چارہ کار کیا رہ جاتا ہے؟ کیا موجودہ حکومتوں کو اس طرح آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ اسلامی احکام کو پامال کرتی رہیں؟ لوگوں کو اسلام اور اسلامی تعلیمات سے برگشتہ کرنے کے لئے حکومت کی پوری مشینری کو استعمال کرتی رہیں؟ تعلیم گاہوں اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے غیر اسلامی نظریات کی ترویج جاری رہے؟ اور جو مسلمان دین پر عمل کرنا چاہتے ہیں وہ زبانی وعظ ونصیحت کے سوا کچھ نہ کریں؟ جبکہ آج کل کی حکومتوں کا تجربہ ہے کہ وہ زبانی وعظ ونصیحت کو درخور اعتناء نہیں سمجھتیں اور جب تک ان پر احتجاج کا دباؤ نہ ڈالا جائے اس وقت تک وہ کسی مطالبے کو عموماً تسلیم نہیں کرتیں۔

اس سوال کا جواب حضرت حکیم الامت کے ارشادات کی روشنی میں یہ ہے کہ مغربی سیاست کے رواج عام کے سبب ہمارے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ احتجاج کا طریقہ ہڑتالوں، جلوسوں اور مظاہروں ہی میں منحصر ہے حالانکہ ایک مسلمان کو احتجاج کا طریقہ بھی خود اپنے دین کے احکام ہی سے لینا چاہئے، اور وہ یہ ہے کہ اگر حکومت کے غیر اسلامی اقدامات اس حد تک پہنچ جاتے ہیں جہاں حکومت کے خلاف خروج (مسلح بغاوت) جائز ہو جائے تو وہاں خروج کے احکام جاری ہوں گے (جن کی کچھ تفصیل آگے آرہی ہے) لیکن جہاں خروج جائز نہ ہو، وہاں وعظ ونصیحت کے علاوہ مسلمانوں کے پاس احتجاج کا ایک طریقہ ایسا ہے جو بڑی بڑی حکومتوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرسکتا ہے اور وہ طریقہ ہے۔

''لاطاعة المخلوق فی معصیة الخالق.''

یعنی! ''خالق کی نافرمانی کر کے کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔''

اور یہ طریقہ خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے ثابت ہوتا ہے، حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا۔

خذو العطاء مادام عطاء، فاذا صار رشوة علی الذین فلا تاخذوه ولستم بتاركيه يمنعكم الفقر والحاجه، لا ان رحی الاسلام دائرة قدروامع الكتاب حيث دار، الا ان الكتاب والسلطان سيفتر قان، فالا تفارقوا الكتاب الا انه سيكون عليكم امراء لقضون لانفسهم مالا ليقضون لكم فان عصيتموهم قتلوكم، وان اطعتموهم اضلوكم، قالو يا رسول الله كيف نصنع؟ قال كما صنع اصحاب عيسىٰ بن مريم نشروا بالمناشير، وحملوا على الخشب، موت فی طاعة الله خير من حياة فی معصية الله.

تنخواہ اس وقت تک لو جب تک وہ تنخواہ رہے، لیکن اگر وہ دین (فروشی) کے اوپر رشوت بن جائے تو نہ لو اور تم فقر اور حاجت کے خوف سے اسے چھوڑو گے نہیں، خوب سن لو کہ اسلام کی چکی چل چکی ہے لہٰذا قرآن جہاں بھی جائے تم اس کے ساتھ جاؤ۔ خبردار قرآن اور اقتدار دونوں الگ الگ ہو جائیں گے ایسے میں تم قرآن کا ساتھ نہ چھوڑنا، یادرکھو کہ تم پر کچھ ایسے امراء آئیں گے جو اپنے حق میں وہ فیصلے کریں گے جو تمہارے حق میں نہیں کریں گے۔ اگر تم نے ان کی خلاف ورزی کی تو وہ تمہیں قتل کر دیں گے اور اگر تم نے ان کے اطاعت کی تو وہ تمہیں گمراہ کر دیں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم ایسے میں کیا کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہی کرو جو عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے ساتھیوں نے کیا، ان کو آروں سے چیر دیا گیا اور لکڑیوں پر اٹھایا گیا۔ اللہ کی اطاعت میں موت آجائے تو وہ اللہ کی نافرمانی میں زندگی گزارنے سے بہتر ہے۔ (مجمع الزوائد ص ۲۳۸ جلد ۵، بحوالہ طبرانی، وقال الہیثمی یزید مرندلم یسمع من معاذ والوضین بن عطاء وثقہ ابن حبان وغیرہ وضعفہ جماعۃ، وبقیۃ رجالہ ثقات)

اس حدیث نے واضح فرمادیا کہ اگر کبھی حکومت وقت کی طرف سے ایسے احکام جاری کئے جائیں جواللہ کی کتاب کے صراحتاً خلاف ہوں (جن میں اسلام کے تمام قطعی اور منصوص احکام داخل ہیں) تو ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ ان احکام کے بجائے اللہ کے حکم کی پابندی کرے، یہ طریق کار جہاں انفرادی طور پر اور اخروی نجات کا راستہ ہے، وہاں اس میں اجتماعی اصلاح کی بھی زبردست صلاحیت ہے کیونکہ اب اگر عوام میں یہ عام دینی شعور پیدا کردیا جائے کہ وہ خالص اپنے دینی جذبے سے حکومت کے غیر اسلامی احکام کی تنقید میں حصہ دار بننے سے ہاتھ روک لیں تو ایک حکومت پر اس سے بڑے کسی دباؤ کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ تصور فرمائیے کہ اگر مسلمان اپنے دینی شعور کے تحت یہ فیصلہ کرلیں کہ وہ بینکوں کے سودی کھاتوں میں رقمیں نہیں رکھوائیں گے۔ ملازمین یہ طے کرلیں کہ وہ سودی بینکوں کی ملازمت چھوڑ دیں گے، اور تجار یہ طے کرلیں کہ وہ کسی بینک سے سود پر قرض نہیں لیں گے، تو کیا یہ سودی نظام ایک دن باقی رہ سکتا ہے؟ اگر مسلمان جج یہ طے کرلیں کہ کسی غیر اسلامی قانون کے تحت فیصلہ نہیں کریں گے۔ اور اس کے لئے ملازمت چھورنی پڑے تو چھوڑ دیں گے۔ وکلاء یہ طے کرلیں کہ وہ کسی غیر اسلامی قانون کے تحت کسی مقدمے کی پیروی نہیں کریں گے خواہ انہیں کتنے مالی فوائد سے ہاتھ دھونے پڑیں تو کیا یہ غیر اسلامی قوانین عوام کے سروں پر مسلط رہ سکتے ہیں؟ اگر مسلمان سرکاری ملازمین یہ عزم کرلیں کہ وہ حکومت کے کسی غیر اسلامی اقدام کی تنفیذ میں حصہ دار بننا گوارہ نہیں کریں گے اور اگر انہیں ایسا کرنا پڑا تو وہ ملازمت سے مستعفی ہوجائیں گے تو کیا یہ غیر اسلامی اقدامات باقی رہ سکتے ہیں؟

احتجاج کے مروجہ طریقوں کے مقابلے میں اس تجویز میں صرف یہ خرابی ہے کہ یہ مغربی سیاست کے ٹکسال سے ڈھل کر نہیں نکلی اس لئے ذہنوں کے لئے اچنبھی اور نامانوس ہے لیکن اگر اس تجویز پر ٹھیک ٹھیک عمل کرلیا جائے تو اس میں ملک کا نظام بدلنے کی پوری صلاحیت موجود ہے، اور یہ مروجہ تدابیر کے مفاسد سے بھی خالی ہے۔ ہاں اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ نفاذ اسلام کی جدوجہد کرنے والوں کے دل میں خدا کا خوف، آخرت کا فکر، اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا احساس، اور اتباع شریعت کی لگن موجود ہو۔ اور وہ پہلے

اپنے ذات پر اسلامی احکام کے نفاذ کے لئے تیار ہوں۔

اس کے برعکس مروجہ طریق کار لوگوں کو اس لئے آسان معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اپنی ذات پر اسلام کی کوئی پابندی عائد کرنے کی کوئی شرط نہیں ہے، جس شخص کی ذاتی زندگی اسلام کی بنیادی تعلیمات تک سے خالی ہو، وہ بھی نفاذ اسلام کا جھنڈا بلند کر کے سڑکوں پر نعرے لگا سکتا ہے، اس طریق کار میں ''اسلامی جذبے'' کے اظہار کے لئے ایک دن ہڑتال میں حصہ لے لینا کافی ہے۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد دوکانوں اور دفتروں میں بیٹھ کر خالص غیر اسلامی معاملات اپنے ہاتھوں سے طے کئے جا رہے ہیں تو اس سے اس جدوجہد پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سوال یہ ہے کہ جو لوگ خود اپنی ذاتی زندگی پر اسلامی احکام نافذ نہ کر سکتے ہوں وہ کیسے یہ توقع کر سکتے ہیں کہ نفاذ اسلام کے لئے ان کی جدوجہد اور ان کے مطالبات پورے ہو جائیں گے؟ اس عظیم کام کے لئے اتنی شرط تو ہونی چاہئے کہ جو لوگ اس جدوجہد کا بیڑا اٹھائیں، کم از کم وہ تو اپنی زندگی کو اسلام کے سانچے میں ڈھالے ہوئے ہوں اور اس راہ میں جان و مال اور جذبات و مفادات کی قربانی پیش کرنے کا عزم رکھتے ہوں۔ اگر یہ بنیادی شرط ہی مفقود ہے تو نفاذ اسلام کی جدوجہد کی حیثیت و اہمیت ایک بے جان اور سطحی شورش سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔

حکومت کے خلاف خروج

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت کو شدید جرم قرار دیا ہے اور باغی کی سزا موت قرار دی ہے۔ چنانچہ اس بات پر فقہاء کرام کا اجماع ہے کہ حکومت عادلہ کے خلاف بغاوت حرام ہے۔ البتہ ایک ظالم یا غیر اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت کس وقت ہوتی ہے؟ اس مسئلے میں فقہاء امت نے کافی مفصل بحثیں کی ہیں یہ بات تو احادیث سے واضح ہے کہ اگر حکمران سے کفر بواح (واضح کفر) کا صدور ہو جائے تو اس کے خلاف بغاوت بالکل برحق ہے لیکن اگر اس سے فسق و فجور سرزد ہو تو اس صورت میں عموماً فقہاء بغاوت کو جائز نہیں کہتے کیونکہ حدیث میں صرف کفر بواح کی صورت میں بغاوت کی

اجازت دی گئی ہے، لیکن دوسری طرف بعض احادیث کے کچھ الفاظ اس کے خلاف بھی نظر آتے ہیں۔ جن سے حکمران کے فسق کی صورت میں خروج کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، اسی بناء پر بعض فقہاء کی عبارتیں متضاد سی نظر آتی ہیں۔ خود راقم الحروف کو اس مسئلے میں ایک مدت تک بہت اشکال رہا، اور کوئی منقح بات سامنے نہیں آئی۔

لیکن حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے اس موضوع پر ایک نہایت جامع مفصل اور مدلل رسالہ تحریر فرمایا ہے جو امداد الفتاویٰ کی پانچویں جلد میں ''جزل الکلام عزل الامام'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں حضرت نے اس موضوع کی تمام احادیث اور فقہاء کرام کے اقوال کو یکجا جمع کر کے اس مسئلے کو اتنا منقح فرمادیا ہے کہ اس موضوع پر اس سے بہتر بحث احقر کی نظر سے نہیں گزری۔ حضرت نے مسئلے کی تمام صورتوں کا تجزیہ فرما کر ہر صورت کا حکم احادیث اور فقہی حوالوں کے ذریعے واضح فرمایا ہے۔ حضرت کی اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ حکمران کے غیر اسلامی اقدامات کی چند صورتیں ہیں اور ہر صورت کا حکم جدا ہے۔

۱۔ حکمران کا فسق اس کی ذات کی حد تک محدود ہو، مثلاً شراب نوشی وغیرہ، اس کا حکم یہ ہے کہ۔

''اگر بدوں کسی فتنے کے آسانی سے جدا کر دینا ممکن ہو، جدا کر دیا جائے، اگر فتنے کا اندیشہ ہو صبر کیا جائے...... اور اگر نہی عن العزل کی صورت میں اس پر کوئی خروج کرے تو عامہ مسلمین پر اس کی نصرت واجب ہے خاص کر جب امام بھی حکم کرے۔ **لقوله في العبارة السادسته فاذا خرج جماعة مسلمون**...... الخ۔''

۲۔...... دوسری صورت یہ ہے کہ اس کا فسق دوسروں تک متعدی ہو۔ یعنی لوگوں کا مال ناحق طریقے سے لینے لگے، لیکن اس میں اشتباہ جواز کا بھی ہوسکتا ہے۔ جیسے مصالح سلطنت کے نام سے ٹیکس وغیرہ وصول کرنے لگے۔ اس صورت کا حکم یہ ہے کہ اس میں اس کی اطاعت ہی واجب ہے خروج جائز نہیں۔

۳۔...... ایسا مالی ظلم کرے جس میں جواز کا شبہ بھی نہ ہو۔ بلکہ صریح ظلم ہو۔ اس کا حکم یہ کہ:

''اپنے اوپر سے ظلم کا دفع کرنا، اگرچہ قتال کی نوبت آجائے...... اور صبر بھی جائز

ہے۔ بلکہ غالباً اولیٰ ہے۔۔۔۔۔"

۴۔۔۔۔۔ لوگوں کو معصیتوں پر مجبور کرے، مگر اس کا منشاء دین کا استخفاف یا کفر و معصیت کی پسندیدگی نہ ہو، تو اس کا حکم یہ ہے کہ اس پر اکراہ کے وہ احکام جاری ہوں گے جو فقہ میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔ لیکن خروج جائز نہ ہوگا۔

۵۔۔۔۔۔لوگوں کو معصیت پر مجبور کرے۔ اور اس کا منشاء یا کفر و معصیت کی پسندیدگی ہو تو یہ کفر ہے، یا اگرچہ فی الحال تو اکراہ کا منشاء استخفاف وغیرہ نہ ہو، لیکن اکراہ عام بشکل قانون ایسے طور پر ہو کہ ایک مدت تک اس پر عام عمل ہونے سے فی المال ظن غالب ہو کہ طبائع میں استخفاف پیدا ہو جائے گا تو ایسا اکراہ بھی بحکم کفر ہے، اور ان تمام صورتوں میں وہی حکم ہوگا جو کفر بواح کا ہے اور جو چھٹی صورت میں آرہا ہے۔

۶۔ نعوذ باللہ کافر ہو جائے، اور اس کا حکم یہ ہے کہ۔

"معزول ہو جائے گا اور اگر جدا نہ ہو، بشرط قدرت جدا کر دینا علی الاطلاق واجب ہے مگر اس میں شرط یہ ہے کہ وہ کفر متفق علیہ ہو۔ اور جس طرح اس کا کفر ہونا قطعی ہو۔ اسی طرح اس کا صدور بھی یقینی ہو۔ مثل رویت عین کے، نہ کہ محض روایات ظنیہ کے درجے میں، کمادل علیه قوله علیه السلام: الا ان تروا المرادبه رویته العین بدلیل تعدیته الٰی مفعول واحد۔

کسی امر موجب کفر کی دلالت علی الکفر یا اس امر موجب کفر کا ثبوت قرائن مقامیہ یا مقالیہ کے اختلاف سے مختلف فیہ ہو سکتا ہے، اور خود قطعیت بھی مختلف فیہ ہو سکتی ہے اسی طرح کبھی اجماع مختلف فیہ ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس صورت میں ہر عامل اپنے عمل میں معذور ہوگا۔ اسی طرح ایک صورت میں بھی رائے کے اختلاف میں مساغ ہے، وہ یہ کہ عبارت خامہ میں تعارض مصالح کے وقت اخف المضرتین کے تحمل کا حکم کیا گیا ہے، تو ممکن ہے کہ وہ شخصوں کا اجتہاد مضرات مختلفہ کے اخف و اشد ہونے میں مختلف ہو۔ وبه ینحل کثیر من الاشکالات من اختلاف جماعات الثقات فی مثل هذا المقامات۔ (امداد الفتاویٰ ص ۱۲۰ ج ۵)

پھر جن صورتوں میں خروج کی اجازت یا وجوب بیان کیا گیا ہے ان میں شرط یہ ہے کہ خروج کے لئے مناسب قوت موجود ہو۔ اور اس کے نتیجے میں کسی اور بدتر حکمران کے مسلط ہوجانے یا کسی غیر مسلم طاقت کے قبضہ جمالینے کا اندیشہ نہ ہو۔

یہاں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کا نہایت اجمالی خلاصہ پیش کیا گیا ہے، ورنہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ہر صورت کے حکم کو حدیث اور فقہ کے دلائل سے مبرہن فرمایا ہے، اور تمام ممکنہ شبہات کا ازالہ بھی فرمایا ہے۔ اہل علم کے لئے یہ رسالہ نہایت مفید اور اطمینان بخش ہے۔

فهذا آخر ماارادنا ايراده فى هذه العجالة وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمين والصلوة والسلام على سيدنا و مولانا محمد النبى الامين وعلى آله واصحابه اجمعين.

مروجہ سیاست کے شرعی احکام

ازافادات: حکیم الامت مجدد ملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ

حکومت وسیاست بھی شریعت کا اہم شعبہ ہے

اس کے متعلق ایک غلطی یہ کی جاتی ہے کہ سیاست کو دین وشریعت کا جزء نہیں سمجھتے محض تمدنی امور سمجھ کر اس کا مدار رائے اور زمانہ کی مصلحت پر سمجھا جاتا ہے اور اس میں اپنے کو تصرف کرنے کا مختار سمجھا جاتا ہے۔ (الانتباہات المفیدہ ص ۷۰، انتباہ ص ۱۳)

یہ کیسی سخت غلطی اور کتنی بڑی جہالت ہے کہ سیاست کو لوگ دین نہیں سمجھتے۔ سیاست بھی تو دین ہے (ورنہ) اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اسلام نے سیاست کی تعلیم نہیں دی سو یہ کتنی بڑی تحریف ہے۔ (الافاضات الیومیہ ص ۱۵۲)

مذہب اسلام میں جو ایک حصہ سیاسیات ہے وہ مدون (مرتب) ہے وہی بہت کافی اور خالص مذہبی سیاست ہے۔ اس کو اختیار کرو۔ (ملفوظات ص ۹۵)

اسلام نے سیاست کی تعلیم دی ہے

لوگ سمجھتے ہیں کہ شریعت کی تعلیم کامل نہیں، تمام حالات کے متعلق اس میں احکام نہیں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ شریعت نے صرف عبادات اور معاملات ہی کے احکام بیان کئے ہیں۔ سیاست کے متعلق شریعت میں تعلیم نہیں ہے۔

اس فاسد خیال سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ وہ لوگ حد شرعی سے آگے بڑھنے لگے، اور جو کچھ جی میں آیا کرنے لگے۔ کیونکہ ان کے خیال میں تو شریعت نے ان امور کی بابت گفتگو کی ہی نہیں (سیاست کے) احکام بیان ہی نہیں کئے۔ پھر دوسری قومیں بھی ان لوگوں کے طرز عمل کو دیکھ کر یوں سمجھتے ہیں کہ دین اسلام کی تعلیم ناقص ہے جس نے ایسے وقت کے لئے کوئی قانون مقرر نہیں کیا۔ بلکہ بعض لوگ تو مسلمانوں کے طرز عمل کو دیکھ کر دین اسلام کو وحشت اور عدم تہذیب کی

طرف منسوب کرتے ہیں اور بے خبری کی وجہ سے کسی قدر اس نسبت کی وجہ صحیح بھی ہے۔ کیونکہ دوسری قومیں ہمارے مذہب کو کہاں معلوم کرتی پھرتی ہیں۔ ان کے نزدیک تو ہمارے اعمال ہی مذہب کا آئینہ ہیں۔ جیسے ہمارے افعال ہوں گے اسی پر مذہب کو محمول کریں گے۔

الغرض شریعت مقدسہ نے سیاست کے متعلق بھی کافی قانون مقرر کیا ہے...... شریعت نے ہر حالت کے متعلق ضروری قواعد بتلائے ہیں۔ اور اسی کی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ شریعت کامل ہے...... اور کسی قانون کا مکمل ہونا یہ ہے کہ اس کے تمام حالات کے متعلق قواعد ہوں...... شریعت کا کمال یہی ہے کہ اس میں تمام انسانی حالات کے متعلق مفصل قواعد موجود ہیں کوئی جزئی ایسی نکلنی ممکن نہیں جس میں شریعت کا کوئی حکم نہ ہو۔

اگر کوئی یوں کہے کہ گورنمنٹ کا قانون مکمل ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ ہر عقلمند یہی کہے گا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسری سلطنتوں کے مقابلہ میں اس میں ہر ہر محکمہ کے لئے کافی قانون موجود ہے اور پھر ہر محکمہ کی جزئیات پر پوری تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

تو جب ایک سلطنت کے قانون کا مکمل ہونا اس کا عمدہ وصف ہے تو خدا کے قانون کے لئے نقصان کیوں تجویز کیا جاتا ہے۔ اور اگر خدا کے قانون کے لئے مکمل ہونا ضروری ہے تو پھر اس کے بغیر تمام حالات کے متعلق مفصل احکام بیان کئے جائیں قانون کی تکمیل کیوں کر ہو سکتی ہے۔

الغرض شریعت مقدسہ نے سیاست کے متعلق بھی کافی قانون مقرر کیا ہے جس کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ اسلام کی تعلیم...... ناکافی ہے۔

واللہ شریعت ہی کے پابند ہو کر ہم سب کچھ ہو سکتے ہیں۔ (التبلیغ ص ۱۸۰، ۱۸۴، ۱۹۵)

سیاسی ترقی کے حدود اور علماء کے ترقی سے منع کرنے کی حقیقت

خوب سمجھ لیجئے ترقی کے دو درجہ ہیں ایک وہ جس میں دین کا ضرر (نقصان) نہ ہو۔ اور دوسرے وہ جس میں دین کا ضرر ہو۔ علماء پہلی ترقی کے حامی ہیں اور دوسری ترقی (جس کا نقصان ہو اس) کے ماحی (یعنی خلاف) ہیں۔

جیسے گورنمنٹ کو باوجود یہ کہ دنیاوی ترقی کا حامی کہا جاتا ہے۔ اور وہ اس کی حمایت کرتی

ہے کہ رعایا ترقی کرے۔ مگر ترقی کی حمایت کے باوجود یہ کہ گورنمنٹ ہی کا قانون ہے کہ ڈکیتی بڑا جرم ہے۔ حالانکہ وہ بھی ترقی ہے اور ترقی بھی کیسی کہ ایک رات میں آدمی مالا مال ہوجائے مگر گورنمنٹ اس ترقی کی حامی نہیں بلکہ محی (یعنی) اس کو ختم کرنے والی ہے۔

صاحبو! یہی قاعدہ تو علماء نے اختیار کیا ہے بعض قسم کی ترقی کے حامی ہیں اور بعض ترقی کے ماحی (خلاف) ہیں۔ یعنی جو ترقی دین کے لئے مضر نہ ہو، اس کے حامی ہیں اور جو مضر ہو اس کے ماحی ہیں۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ ایک ہی بات اگر علماء کریں تو وہ مردود ہو اور وہی بات گورنمنٹ کرے تو مقبول ہو، بات تو دونوں جگہ ایک ہی ہے مگر حیرت ہے کہ ایک جگہ مقبول ہو، اور دوسری جگہ مردود ہو۔ (شب قدر، التبلیغ ص ۸۴/۸)

علماء کی مخالفت کی حقیقت

ہماری مخالفت ایسی ہے جیسے باپ کو بچہ کے ساتھ ہوتی ہے۔ کہ جب بچہ غلط طریقہ اختیار کرتا ہے تو باپ اس کا مخالف ہوتا ہے۔ اور اس کو مارتا بھی ہے۔

یا جیسے ماں اپنے بیمار بچہ کی مخالفت کرتی ہے کہ بچہ اپنی طبیعت کے موافق غذائیں مانگتا ہے مگر...... ماں اس کو نہیں دیتی، بلکہ بسا اوقات ضد کرنے پر اس کو مارتی بھی ہے۔ اور وجہ اس کی یہ ہوتی ہے کہ ان دونوں مثالوں میں دو قسم کے نقصان ہیں، ایک اہون (کم درجہ) کا اور ایک اشد (یعنی سخت) ماں باپ اشد الضرر (یعنی بڑے نقصان) سے بچانے کے لئے اہون (یعنی کم درجہ کا نقصان) کو اختیار کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ عقلی قاعدہ ہے کہ جس جگہ دو قسم کے نقصان جمع ہوں، ایک سخت، دوسرا ہلکا تو ہلکے کو اختیار کر لینا چاہئے۔ مثلاً باپ نے بچہ کو غلطی کرنے پر جو مارا تو یہ بھی بچہ کے حق میں ایک درجہ کا نقصان ہے۔ اور دوسرا نقصان یعنی غلط طریقہ پر رہنا یہ زیادہ سخت ہے۔ کیونکہ اگر بچہ غلط طریقہ پر قائم رہا تو اس کا انجام بہت ہی برا ہوگا۔ مثلاً وہ پڑھتا نہیں یا بری صحبت میں بیٹھتا ہے تو اس سے آئندہ اس کو بہت نقصان ہوگا۔ اور یہ نقصان پہلے نقصان سے بڑھ کر ہے۔ اسی لئے باپ نے کم درجہ کے نقصان کو اختیار کیا تاکہ بڑے نقصان سے محفوظ رہے۔

اسی طرح ہم مانتے ہیں کہ ہمارے بعض مشورے ایسے ہیں کہ ان سے دنیا کا ایک درجہ کا نقصان ہے مگر چونکہ وہ نقصان کم درجہ کا ہے جو آزاد چھوڑ دینے سے (اس سے بڑھ کر) پیش آنے والا ہے۔ اس لئے بڑے نقصان سے بچانے کے لئے کم درجہ کا نقصان اختیار کیا گیا ہے۔ اور وہ بڑا نقصان کیا ہے؟ وہ دین کی خرابی (اور شریعت کے خلاف ہونا) ہے۔ اس سے زیادہ بڑا کوئی نقصان نہیں۔ اگر اس کا نام مخالفت ہے تو ماں باپ اور استاذ سب مخالف ہیں۔

اور حقیقت میں کم درجہ کے نقصان کو اختیار کرنا تو اصلاح ہے۔ ترقی والوں نے خوامخواہ ہم کو اپنا مخالف سمجھ لیا ہے، ہم تو ایسی ترقی کے حامی ہیں کہ سات پشت تک اس کی برکت چلی جائے۔ اور ان کے پاس اپنے دعوے پر کہ ان کی ترقی حقیقی ترقی ہے (اس پر) کوئی دلیل نہیں اور ہمارے پاس قرآن وحدیث سے دلیل موجود ہے۔ (التبلیغ ص ۲۲/۸)

مفاد پرست لیڈروں کے تابع نام نہاد علماء

علماء حقیقت میں صرف وہ ہیں جو لیڈروں کے تابع نہ ہوں بلکہ شرعی حکم کے تابع ہوں۔ اور جو علماء لیڈروں کے تابع ہیں ان کی تو حالت یہ ہے کہ بخدا اگر لیڈر آج اپنی رائے کو بدل دیں تو یہ علماء بھی ادھر ہی ہوجائیں مگر ہیں عقلمند کہ فوراً اپنے فتوے کو نہ بدلیں گے کیونکہ اس سے عوام کو صاف معلوم ہوجائے گا کہ ان کے فتوے لیڈروں کی رائے کے تابع ہیں، بلکہ آہستہ آہستہ اپنی رائے کو بدل کر لیڈروں کے راستہ پر آجائیں گے۔

آج کل علماء لیڈروں کے ساتھ دو وجہ سے ہیں۔ یا تو اس لئے کہ ان سے علیحدگی میں جاہ (عزت) کے چلے جانے کا اندیشہ ہے چنانچہ مشاہدہ ہے کہ جو علماء ان کے ساتھ نہیں ہیں ان کو عوام نے کیسا بدنام کیا اور کتنا برا بھلا کہا۔

یا روپیہ کی لالچ کی وجہ سے ان کے ساتھ ہیں۔ کہ اگر ہم نے ان تحریکات میں شرکت نہ کی تو مدرسہ کا چندہ بند ہوجائے گا۔ کوئی مدرسہ کی اعانت نہ کرے گا۔

ایک عالم نے مجھے لکھا تھا کہ ان تحریکات سے علیحدگی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اکیلے رہ جاؤ گے کوئی تمہارے ساتھ نہ ہوگا۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے خدا کا ساتھ ہونا کافی ہے۔ اور کسی کے ساتھ ہونے کی ضرورت نہیں۔

لعنت ہے ایسے مال وجاہ پر جس سے مخلوق کی رضا مقصود ہو مسلمانوں کی شان تو یہ ہونا چاہئے کہ خدا کی رضا کے سامنے اس کو کسی کی پرواہ نہ ہو اگر چہ مخلوق اس کو پاگل کہے مگر خدا راضی ہو تو وہی اس کے لئے سلطنت ہے اگر وہ پاگل بھی ہے تو کس کا پاگل ہے۔ (تقلیل الاختلاط، برکات رمضان ص ۳۴۷)

سیاست کی قسمیں اور علماء کا منصب

سیاست کے دو حصے

سیاست کے دو حصے ہیں ایک سیاست کے شرعی احکام یہ بے شک شریعت کا جز ہے اور کوئی عالم اس سے ناواقف نہیں۔ چنانچہ ابواب فقہیہ میں کتاب السیر کا ایک مستقل جز ہے۔ جس کی درس تدریس کا پابندی سے اہتمام ہے۔

دوسرا حصہ سیاست کا تجرباتی تدبیریں ہیں جو ہر زمانہ میں حالات وواقعات اور آلات وغیرہ کی تبدیلی سے بدلتی رہتی ہیں اور یہ حصہ شریعت کا جز نہیں۔ اور علماء کا اس میں ماہر ہونا ضروری نہیں۔ اس کی مہارت کے دوسرے ذرائع ہیں جن کا حاصل تجربہ اور خاص مناسبت (کا ہونا) ہے۔

لیکن اوپر جو عرض کیا گیا کہ سیاست کا یہ حصہ یعنی تجرباتی تدبیریں شریعت کا جز نہیں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حصہ شریعت سے مستغنی (بے نیاز) ہے اور اس کے استعمال کرنے والوں کو شریعت کے علماء کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں............ کیونکہ کوئی واقعہ اور کوئی عمل اور کوئی تجویز ورائے دنیا میں ایسی نہیں جس کے جواز میں شریعت سے تحقیق کرنے کی ضرورت نہ ہو۔ گو وہ شریعت کا جز نہ ہو (لیکن) جز نہ ہونے سے تابع نہ ہونا لازم نہیں آتا۔ (البدائع ص ۲۴)

سیاست میں کودنا علماء کا منصب نہیں

اگر تم یہ چاہو کہ (علماء) اس سے آگے بڑھ کر سیاست میں عملی طور پر بھی حصہ لیں، اور تمہارے سیاسی جلسوں اور مظاہروں میں شریک ہوا کریں تو یہ کام ان کا نہیں، اور نہ تم کو انہیں مجبور کرنے کا حق ہے۔ تم نے علماء کو سمجھا کیا ہے۔ علماء جس کام کو کر رہے ہیں وہ اس قدر اہم و ضروری ہے کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ جس بستی میں ایک ہی عالم ہو اور جہاد شروع ہو جائے تو اس عالم کو میدان جہاد میں جانا جائز نہیں۔ کیونکہ علماء اگر مر جائیں گے تو علم دین کو کون سنبھالے

گا۔اسی لئے ہمارے حاجی صاحب علماء کو ہجرت کرنے سے منع کرتے تھے کہ اگر تم ہندوستان کو چھوڑ دو گے تو ہندوستان میں دین کا کیا حال ہوگا اب لوگ اس کو تو دیکھتے نہیں کہ علماء کو سیاست میں پڑنے سے خود فقہاء اسلام نے منع کیا ہے۔بس ان کو تو الزام دینے سے کام ہے مسلمانوں پر جو بھی مصیبت آئے اس کا الزام سب سے پہلے علماء پر ہے۔

جو کام علماء کا ہے وہ کریں.......... علماء سے مسائل پوچھو۔دنیا کے حاصل ہونے کی (اور سیاسی) تدبیریں انہیں کیا معلوم۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسے علوم اولین و آخرین کے جاننے والے کے لئے فن باغبانی کے مسئلہ تابیر.......... سے واقف ہونا لازم نہیں تو معلوم ہوگیا کہ یہ کوئی نقص نہیں۔ پھر غضب ہے کہ نبی کا فنون سے واقف نہ ہونا کوئی نقص نہ ہو اور ایک مولوی بیچارہ اگر فن سیاست نہ جانتا ہو تو اس کا یہ نقص (عیب) سمجھا جائے۔اور اس کو ملامت کا نشانہ بنایا جائے۔(الافاضات الیومیہ ص ۲۴۷ ج ۱۰)

نبی کے لئے سیاست میں حصہ لینا ضروری نہیں

اَلَمْ تَرَ اِلَی الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰی اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ

ترجمہ:۔کیا تجھ کو بنی اسرائیل کی جماعت کا قصہ جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوا ہے تحقیق نہیں ہوا۔جب کہ ان لوگوں نے اپنے ایک پیغمبر سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے کہ ہم اللہ کی راہ میں قتال کریں۔(بیان القرآن)

ان آیتوں سے اثبات مدعی (دعویٰ کے ثابت کرنے) کی تقریر یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے باوجود ان میں ایک نبی کے موجود ہونے کے ان نبی سے یہ نہیں کہا کہ آپ ہمارے (سیاسی) قائد بنئے بلکہ اس مقصد کے لئے بادشاہ مقرر کرنے کی درخواست کی۔سو اگر نبی کافی سمجھے جاتے اور نبی کا سیاسی قائد ہونا ضروری ہوتا تو ایسی درخواست کیوں کی جاتی۔اور اگر یہ شبہ ہو کہ یہ بنی اسرائیل کی غلطی تھی کہ اس غلطی پر ان کے نبی نے تنبیہ کیوں نہیں فرمائی کہ میں کافی ہوں، بلکہ بادشاہ مقرر کرنے کا انتظام شروع فرمادیا۔اور اگر کوئی جسارت کر کے یہ کہنے لگے کہ ان نبی سے بھی لغزش

ہوگئی تو پھر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ کیوں نہیں فرمائی۔ بلکہ اس درخواست کو بلانکیر قبول فرمالیا۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ ہر نبی کے لئے بھی سیاست میں تجربہ و مناسبت لوازم میں سے نہیں۔ چہ جائے کہ علماء و مشائخ کے لئے لازم ہو بلکہ مفسرین کی نقل سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے لئے ان کی سنت یہی رہی کہ وہاں کے سیاسی معاملات بادشاہوں سے متعلق ہوتے تھے۔ اور بادشاہ انبیاء کے حکم اور مشورہ کے مطابق چلتے تھے۔ چنانچہ تفسیر مظہری نے بھی ابعث لنا ملکا کے تحت یہی لکھا ہے۔ (البدائع ص ۲۵)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو شانیں، شان نبوت، شان سلطنت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو شانیں تھیں۔ شان نبوت اور شان سلطنت اس کے بعد خلفاء راشدین بھی دونوں کے جامع تھے، مگر اب یہ دونوں شانیں دو گروہ پر تقسیم ہو گئیں۔ شان نبوت کے مظہر علماء ہیں۔ اور شان سلطنت کے مظہر سلاطین اسلام۔ اب اگر یہ سلاطین (بادشاہ) علماء سے استغناء (بے پروائی) کرتے ہیں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک شان سے اعراض لازم آتا ہے۔ اور اگر علماء سلاطین کی مخالفت کرتے ہیں، تو اس سے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک شان سے اعراض لازم آتا ہے۔

اب دونوں کے جمع کرنے کی صورت یہ ہے کہ سلاطین (بادشاہوں) سے تو میں کہتا ہوں کہ وہ اپنے حدود (قوانین) میں کوئی حکم اس وقت تک نافذ نہ کریں جب تک اہل حق علماء سے استغناء نہ کرلیں۔ اور علماء سے یہ کہتا ہوں کہ وہ نفاذ کے بعد اس پر کاربند ہوں (یعنی عمل کریں اور تائید کریں)۔

اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دو شانیں اس طرح جمع ہو جائیں تو مسلمانوں کی فلاح و بہبودی کی صورت نکل آئے۔ اور ان کی ڈوبتی ہوئی کشتی ساحل پر آ لگے ورنہ اللہ ہی حافظ ہے۔ (ملفوظات ص ۲۲۱/۳، اصلاح المسلمین ص ۵۱۶)

کام کی تقسیم اور کامیابی کا طریقہ

سب کو مل کر کام کرنے کا یہ مطلب ہے کہ............ تجربہ کا کام تو لیڈر کریں کہ وہ کسی کام کے کرنے سے پہلے علماء سے جائز ناجائز معلوم کرلیں۔ اور احکام بتلانے کا کام علماء

کریں۔اس طرح ہر شخص اپنے فرض منصبی کو انجام دے۔اس صورت میں کامیابی کی امید نکل سکتی ہے کہ ہم اپنا کام کریں وہ اپنا کام کریں۔

سب کے مل کر کام کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ سب ایک کام میں لگ جائیں یا ایک کا کام دوسرا کرنے لگے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک مکان تیار کیا جارہا ہے اس کی تیاری کے لئے معمار (کاریگر) کی بھی ضرورت ہے۔ بڑھئی کی بھی ضرورت ہے، مزدور کی بھی ضرورت ہے۔اب یہ بتلاؤ کہ سب مل کر جو تعمیر کا کام کررہے ہیں۔اس کا کیا طریقہ ہے۔ یہی کہو گے کہ کاریگر اینٹ لگائے۔مزدور گارا پہنچائے، اینٹ پہنچائے، بڑھئی آرا چلائے جب یہ سمجھ میں آگیا۔اب میں پوچھتا ہوں اگر یہ سب مل کر اینٹ ہی لگانے لگیں یا سب کے سب آرا ہی چلانے لگیں، یا سب کے سب گارا ہی پکڑانے لگیں تو کیا مکان تیار ہوسکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔اسی طرح یہاں خیال کرلو کہ سب کو مل کر کام کرنے کے یہ معنی ہیں، کہ تجربہ کا کام تو لیڈر کریں۔اور احکام بتلانے کا کام علماء کریں۔ ہر قوم کے لئے تقسیم خدمات ضروری ہے اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔

تمام اہل تمدن اس کی ضرورت پر متفق ہیں۔ چنانچہ جنگ میں فوج جاتی ہے۔فوجی افسر جاتے ہیں۔منشی، محرر، کلکٹر اور جج وغیرہ نہیں جاتے پھر نہ معلوم مولویوں کے ذمہ سارا کام کیوں رکھا جاتا ہے کہ وہ تفسیر وحدیث وفقہ کا علم بھی حاصل کریں، فتویٰ بھی دیں، وعظ بھی کہیں، درس وتدریس بھی کریں، مدرسے بھی قائم کریں، اور لیڈروں کے ساتھ جھنڈا لے کر سیاست میں بھی شریک ہوں۔ (الافاضات الیومیہ ص ۱۳۰ ج ۱)(التبلیغ ص ۱۱۵ الحدود والقیود)

لیڈروں کی ذمہ داری

لیڈروں۔(اور مسلم نیتاؤں) پر لازم ہے کہ جو کچھ قومی ترقی کے طریقے سوچیں ان کو پہلے علماء کے سامنے پیش کرکے شرعی فتویٰ حاصل کرلیا کریں کہ یہ جائز ہے یا ناجائز۔(یہ مناسب ہے یا نہیں) جب علماء فتویٰ دے دیں اس کے بعد ان سیاسی تدبیروں پر عمل کیا جائے۔

تقسیم خدمات بہت ضروری ہے، قومی ترقی کے اسباب اور ذرائع تو لیڈروں کو سوچنا

چاہئے اور ہر تدبیر کے جواز وعدم جواز کو اپنی رائے سے طے نہ کریں بلکہ علماء سے استفتاء کرلیا کریں، ورنہ محض ترجمہ پڑھنے سے قرآن (حدیث) حل نہیں ہوسکتا۔

(خلاصہ یہ کہ) لیڈر علماء سے پوچھ کر کام کریں (یعنی) تجربہ کا کام لیڈر کریں اور کام کرنے سے قبل علماء سے جائز ونا جائز معلوم کرلیا کریں۔ (التبلیغ الحدود والقیود الافاضات ص ۱/۱۴)

نام نہاد لیڈروں کی بدحالی

آج کل کے لیڈر اکثر عقل سے کورے ہیں۔ جب عقل صحیح نہیں پھر ایسی عقل میں اسلامی احکام کیسے آئیں.......... پھر نماز نہیں، روزہ نہیں، زہد نہیں، تقویٰ نہیں، ان اعمال سے بھی عقل میں نور پیدا ہوتا ہے.......... پھر دعویٰ بھی ہے کہ ہم قوم کی کشتی کے ناخدا ہیں۔

ایسے (لیڈروں) کی بدولت مسلمانوں کو نقصان پہنچ رہا ہے ہر روز ایک نیا لباس بدل کر پلیٹ فارموں پر آ کھڑے ہوئے ہیں۔ (ملفوظات ص ۵/۸۴،ص ۵/۱۸۶) اصلاح المسلمین ص ۵۲۷)

اگر کہا جاتا ہے کہ تم خود عمل کر کے دکھلاؤ پہلے اپنی اصلاح کرو کیونکہ تمہارا نہ ظاہر ٹھیک ہے نہ باطن، نہ صورت، نہ سیرت، اور مسلمانوں کے رہبر اور متقدا بنتے ہو؟ تو جواب میں کہتے ہیں کہ آپ ذاتیات پر حملہ کرتے ہیں۔ ارے بھلے مانسو! تم اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر حملہ کرو، احکام الٰہیہ کے بجائے اپنے دماغ سے تراشی ہوئی باتوں پر عمل کرنے کے لئے دنیا (کے مسلمانوں) کو مجبور کرو۔ اسلامی احکام کی پامالی کرو۔ مگر دوسرا تمہارا کسی حالت پر بھی نوٹس نہ لے، ایسی حالت میں تمہیں ہی دوسروں کو کہنے کا کیا حق ہے؟ دوسرا تمہاری کیوں ماننے لگے۔ وہ بھی یہی کہہ کر الگ ہوجائے گا کہ میری ذاتیات سے آپ کو کیا بحث، چلو چھٹی ہوئی۔ آدمی کچھ تو عقل سے کام لے۔

(ایسے لوگوں) کی بڑی دوڑ یہ ہوتی ہے کہ کوئی جلسہ (ہنگامہ) کرلیا، دو چار ریزرویشن پاس کرالئے۔ (ایسے ہی لوگ) دین کے پکے دشمن ہیں۔ دوستی کے پردہ میں دشمنی کررہے ہیں۔ احکام اسلام کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں...... ہاتھ دھو کر اسلام کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں...... اور قوم کے خیرخواہ، رہبر، متقدا بنے ہوئے ہیں۔ اسلام کو غیروں سے شکایت نہیں اس کو تو مسلمانوں ہی سے شکایت ہے۔

طلبہ مدارس کی سیاست میں شرکت

سخت افسوس ہے کہ بعض لوگوں کی یہ حالت ہے کہ علم دین میں مشغول ہونے کوفضول اور بے کار سمجھتے ہیں نہ معلوم یہ سبق کہاں سے حاصل کیا ہے یورپ میں بھی تو یہ طریقہ نہیں، وہاں بھی بعض اوقات اس قسم کی (سیاسی) تحریکات ہوتی ہیں مگر جو جماعت علم حاصل کرنے میں مشغول ہے اس کوان تحریکات میں شرکت کی اجازت نہیں دی جاتی۔ (الافاضات ص ۱۳ ج ۱)

میری رائے ہے کہ کسی تحریک میں بھی طالب علم کوشرکت کی اجازت نہ ہونا چاہئے۔ آئندہ کے لئے اس میں سخت نقصان ہے جواس وقت محسوس نہیں ہوتی۔ آخر میں پوچھتا ہوں کہ جب پڑھنے پڑھانے میں کوئی مشغول نہ رہے گا۔ تو پھر کام کرنے والی علماء کی جماعت کہاں سے پیدا ہوگی.......... جو کرنا ہے تم ہی کرو۔ طلبہ کو تو اپنے کام میں لگا رہنے دو تا کہ آئندہ دین کے احکام بتلانے والی جماعت کا سلسلہ جاری رہے۔ کیا یہ خیال ہے کہ آئندہ دین کی ضرورت ہی نہیں رہے گی جیسا کہ کہتے ہیں کہ مسائل کا وقت نہیں کام کا وقت ہے...... میں کہتا ہوں اگر دین نہ رہا اور احکام اسلام کو پامال کرنے کے بعد کوئی کام بھی کیا تو وہ کام پھر دین کا نہ ہوگا۔

طلبہ کو اس قسم کی کمیٹیوں اور جلسوں میں شرکت کی اجازت ہرگز ہرگز نہیں دینا چاہئے۔ کیا ان کاموں کے لئے طلبہ ہی رہ گئے ہیں۔ اور مسلمان کچھ کم ہیں ان سے کام لو۔
(الافاضات ص ۹۹ ج ۱، ص ۱۲۱ ج ۱)

دینی مدارس میں سیاست کی تعلیم

فرمایا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسے علوم اولین و آخرین کے جاننے والے کے لئے فن یا باغبانی کا مسئلہ تابیر سے واقف ہونا لازم نہیں (جیسا کہ مشکوۃ شریف کی روایت میں آیا ہے) تو معلوم ہوگیا کہ یہ کوئی نقص (اور عیب) نہیں۔ پھر غضب ہے کہ نبی کا تو فنون سے واقف نہ ہونا کوئی نقص (عیب) نہ ہو۔ اور ایک مولوی بیچارہ اگر فن سیاست نہ جانتا ہو تو س کا یہ نقص سمجھا جائے۔ اور اس کو ملامت کا نشانہ بنایا جائے۔

تو تعلیم یافتوں کی کیا شکایت آج کل کے مولوی خود پھسل گئے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے میرے سامنے خود یہ تجویز پیش کی کہ علماء کو ماہر سیاست ہونا چاہئے۔ ان کو مصر پہنچایا جائے

بیروت بھیجا جائے۔ تاکہ وہاں کے ماہرین سیاست سے وہ سیاست سیکھ کر آئیں۔ اور یہاں کے مدارس دینیہ میں طلبہ کو سیاست کا باقاعدہ نصاب تجویز کر کے سیاست کا درس دیا کریں۔

میں نے کہا کہ اس کے بجائے کہ یہاں سے علماء وہاں سیاست سیکھنے کے لئے بھیجے جائیں، وہاں سے ماہرین سیاست کو تنخواہ دے کر بلایا جائے اور وہ علماء کے سامنے اپنے سیاسی اصول کو پیش کر کے ان کے متعلق احکام شرعیہ پوچھیں، اور علماء انہیں سیاسی جزئیات کے متعلق شرعی احکامات بتلائیں اس طرح ماہرین سیاست تو ماہر شریعت ماہر ہو جائیں۔ اور ماہرین شریعت ماہر سیاست ہو جائیں............بس اس وقت تو ہاں ہاں کرتے رہے پھر وہی خبط۔ (افاضات الیومیہ ص ۶۳ ج ۱۰)

مروجہ سیاست میں علماء کے شریک نہ ہونے کی ایک وجہ

ہندوستان میں موجودہ سیاست کا حاصل یہ ہے کہ گورنمنٹ کے قانون کے ماتحت رہ کر اپنے حقوق کی حفاظت کی جائے............لہٰذا موجودہ سیاست کے لئے ضروری ہوا کہ گورنمنٹ کے تمام قوانین پر بھی عبور ہو اور انگریزوں (یعنی حکام) کی طبیعت اور مزاج سے بھی پوری واقفیت ہو۔ اور یہ بات پیدا ہوتی ہے ان میں گھل مل کر رہنے سے۔ اور ظاہر ہے کہ علماء ان سب باتوں سے ناواقف ہیں۔ تو یہ اگر سیاست میں بحیثیت لیڈر کام کریں گے تو ان کی ناواقفی کے سبب مسلمانوں کو بجائے نفع کے نقصان پہنچے گا۔ پھر تجربہ شاہد ہے کہ عام سیاسی لیڈر ملکی مصلحتوں کو دین پر مقدم رکھتے ہیں اور جب مصلحت و مذہب میں تعارض ہوتا ہے تو مذہب میں بعید تاویل کرنے میں دریغ نہیں کرتے علماء بھی اس میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ اور ان کی تاویل چونکہ برنگ دین ہوتی ہے اس لئے وہ عام مسلمانوں کو زیادہ غلطی میں مبتلا کرتی ہے۔ (البدائع بدیعہ نمبر ۱۰۱ ص ۷۲)

علماء کو سیاست میں حصہ لینا کب ضروری ہے؟

اگر کسی وقت کوئی سیاسی جماعت ایسی نہ ہو جو کہ علماء سے احکام پوچھ پوچھ کر عمل کیا کرے جیسا کہ اس وقت غالب ہے تو اس وقت علماء ایسی جماعت کے پیدا ہونے کے منتظر نہ رہیں ورنہ محبان دنیا (مفاد پرست لیڈر) دینی مقاصد کو (اور امت کو) تباہ کر دیں گے۔ بلکہ وہ خود اپنے میں سے ایسی جماعت بنائیں جو علم و عمل دونوں میں سیاست و شریعت کے

جامع ہوں۔ مگر یہ حکم سیاست مدنیہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ سیاست بدنیہ یعنی طب بلکہ اسباب معاش میں سے جتنے فرض کفایہ ہیں، مثلاً تجارت، زراعت سب کا یہی حکم ہوگا۔

اوران سب مفاسد کی اصلاح کے لئے جماعت کا انتظام کرنا ہر حال میں استطاعت کے ساتھ مشروط ہوگا یہ ایک کلی تحقیق ہے۔ (البدائع ص ۲۴، افادات اشرفیہ ص ۹۵)

علماء کی سیاسی جماعت کا طریقہ کار

اس وقت طریقہ کار یہ مفید ہوسکتا ہے ہے کہ سیاسی جماعت علیحدہ ہواور مذہبی علیحدہ۔ اور مذہبی جماعت اپنا اصلی کام تبلیغ کا اس طرح انجام دے کہ مسلمانوں کی سیاست جماعت کی نگرانی کرے کہ یہ سیاسی جماعت مسلمانوں کے حقوق گورنمنٹ سے مطالبہ کرتے وقت شریعت کے خلاف عمل نہ کر بیٹھے اور چونکہ موجودہ زمانہ میں سیاسی جماعت مذہبی جماعت سے پوچھ کر عمل کرنے کی عادی نہیں رہی، اس لئے علماء کے ذمہ ہے کہ خود اس جماعت کے پاس پہنچیں اوراحسن طریقہ سے تبلیغ کریں۔

اگر علماء اپنا اصلی کام تبلیغ رکھتے تو عظمت ووقار میں چار چاند لگ جاتے۔ اگر علماء حضرات تبلیغ فرما کر لیڈروں کو سنبھالتے اوران کو مفید مشورے اور طریقہ کار سے رہنمائی کرتے تو اس طرز میں شرعی طریقہ پر مسلمانوں کے حقوق (ان کے جان ومال) کی حفاظت بھی ہوتی اور علماء کی عظمت بھی بڑھتی۔ (البدائع ص ۲۸)

سیاست میں کفار مشرکین سے مدد لینے اوران کے ساتھ مل کر کام کرنے کا شرعی حکم

فی شرح السیر الکبیر باب الستانه باهل الشرک واستعانه المشرکین بالمسلمین...... ولا باس بان یستعین المسلمون باهل الشرک علی اهل الشرک اذا کان الاسلام بوا الظاهر.

اس روایت کا حاصل یہ کہ کفار کے ساتھ ایسے معاملات میں (یعنی سیاسی امور میں کفار...... کے ساتھ) شرکت کی شرط یہ ہے کہ وہ ہمارے تابع ہوں، اوراگر وہ ہمارے تابع

نہ ہوں خواہ متبوع ہوں (یعنی ہم ان کے تابع ہوں) یا دونوں قوت وعمل میں برابر ہوں تو ان کے ساتھ شرکت جائز نہیں۔ جس کی وجہ سے اسی روایت میں مذکور ہے کہ جب انہیں بھی مستقل قوت حاصل ہے تو شرکت میں اندیشہ ہے کہ جب مجموعی قوت سے ان کا مقابل مغلوب ہو جائے پھر وہ اپنی قوت سے مسلمانوں کو مغلوب کر سکتے ہیں۔

اور اگر کہیں اس شرط کے خلاف ہوا ہے جیسے ایک غنیم کے مقابلہ میں نجاشی کی مدد حضرات صحابہ نے لی تو اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ نجاشی اس وقت مسلمان ہو گئے تھے یا یہ وجہ ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ حالت میں کسی پناہ کی حاجت تھی اور نجاشی بہ نسبت اس غنیم کے مسلمانوں کے لئے زیادہ مفید تھے اس لئے اس موقع پر وہ شرط نہیں رہی یہ حاصل ہے روایت کا۔ (معاملۃ المسلمین ص ۳۱، اشرف السوانح ص ۲۰۳/۳)

فاسقوں فاجروں اور بدعتیوں کیساتھ مل کر کام کرنیکا حکم

کہاں اصل ایمان کا فقدان اور کہاں فروع اعمال کا نقصان (اول میں تو سرے سے ایمان ہی نہیں، دوسرے میں ایمان کے ساتھ صرف اعمال کی کوتاہی ہے) ایک کا قیاس دوسرے پر محض فاسد، اور قیاس مع الفارق ہے خصوصاً جب کہ اس دوسرے نقصان کی اصلاح کی توقع بھی ہو۔

شرح سیر کبیر سے ایک روایت نقل کرتا ہوں (جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان خواہ فاسق، فاجر، بدعتی، خارجی ہی کیوں نہ ہو) حربیوں کے مقابل میں ان کے ساتھ مل کر کوشش کرنا درست ہے۔

وفی شرح السیر ولا باس بان یقاتل المسلمون من اهل العدل مع الخوارج المشرکین من اهل الحرب (ص ۲۴۱/۳)

اور ظاہر ہے کہ اہل مسلم کی کوتاہیاں خوارج کی بددینی کے درجہ تک تو نہیں۔ پھر جب کفار کے مقابلہ کے لئے خوارج کے ساتھ (جن کی اعانت بھی مکروہ ہوتی ہے) اشتراک عمل (یعنی ان کے ساتھ مل کر کام کرنا) جائز ہے تو مسلم لیگ کے ساتھ تو بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا۔

(الطریق الامم ملحقہ افادات اشرفیہ ص ۸۰

سیاست میں کافر کی اقتداء

ایک صاحب نے عرض کیا کہ اگر ایک شخص سیاست کا ماہر ہے مگر ہے کافر، اگر اس میں اس کی اقتداء کرلی جائے تو کیا حرج ہے؟ فرمایا اس کی بالکل ایسی مثال ہے کہ اگر کافر نماز خوب جانتا ہو۔ اور مسلمان نہ جانتا ہو تو اس کافر کی اقتداء جائز ہے؟

شبہ کا منشا یہ ہے کہ سیاست کو لوگ دین نہیں سمجھتے خود یہی سخت غلطی اور بڑی جہالت ہے، سیاست بھی تو دین ہی ہے اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اسلام نے سیاست کی تعلیم نہیں کی، یہ کتنی بڑی تحریف ہے پھر دین میں کافر کی اقتداء کرنے کا کیا مطلب؟ نیز کیا اس میں اسلام اور مسلمانوں کی اہانت (ذلت) نہیں ہے؟ اور کیا کوئی شخص کہیں یہ بات دکھلا سکتا ہے۔ کہ اس طرح سے اسلام اور مسلمانوں کی اہانت کرانا اور ان کو ذلیل کرانا جائز ہے؟ اور کیا مسلمانوں میں ایسا کوئی نہیں جو سیاست جانتا ہو۔

البتہ اس طریقہ سے ان کے ساتھ مل کر کام کر سکتے ہیں کہ کافر تابع اور مسلمان متبوع (یعنی کافر مسلمان کی اتباع کرتے ہوں تو درست ہے) (الافاضات الیومیہ ص ۱۵۲/۳)

فصل

موجودہ حالات میں کس جماعت کے ساتھ مل کر کام کریں

شرعی احکام دو قسم کے ہیں ایک اصلی دوسرے عارضی یعنی احکام کبھی کسی شی کی ذات پر نظر کر کے مرتب ہوتے ہیں، اور کبھی عوارض (یعنی عارضی حالات) پر نظر کر کے اور ان دونوں قسم کے احکام باہم مختلف بھی ہو جاتے ہیں۔ (بوادر النوادر ص ۷۷/۲)

(مثال کے طور پر) مسجد الحرام میں جب تک مشرکین مکہ مسلط (اور غالب رہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم وہاں نماز بھی بیت اللہ کا طواف بھی فرماتے رہے۔ اسی درمیان میں وہ زمانہ بھی آیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے عمرہ کے لئے مکہ تشریف لائے اور مشرکین نے آنے نہیں دیا۔ پھر اس پر صلح ہوئی کہ تین روز کے لئے تشریف لائیں اور عمرہ کر کے چلے جائیں آپ نے اس صلح کو قبول فرمایا اور محدود وقت تک

قیام فرما کر واپس تشریف لے گئے یہ سب اس وقت ہوا جب آپ کا تسلط (غلبہ) نہ تھا، غدر کی حالت میں آپ نے اس عارضی حکم پر عمل فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو با قاعدہ مسلط فرما دیا اس وقت اصلی حکم پر عمل فرمایا۔ (امداد الفتاویٰ، فقہ حنفی کے اصول ص ۶۲)

اور یہ شرعی و عقلی قاعدہ ہے کہ جس جگہ دو قسم کے ضرر (نقصان) جمع ہوں ایک اشد (سنگین) دوسرا اہون (یعنی کم درجہ کا) تو اہون کو اختیار کر لینا چاہئے یعنی جہاں دونوں شقوں میں مفسدہ ہو مگر ایک میں اشد، ایک میں اخف تو اشد سے بچنے کے لئے یا اس کو دفع کرنے کے لئے اخف (ہلکے) کو گوارہ کر لیا جاتا ہے اور ہے تو یہ بھی برا مگر دوسرے مفسدہ کے مقابلہ میں پھر بھی اخف ہے۔ (ملفوظات اشرفیہ ص ۴۱، افادات اشرفیہ ص ۳۳)

(اس کے بعد سمجھئے) کہ موجودہ حالات میں افسوس اور نہایت افسوس ہے کہ مسلمانوں کی ایسی جماعت (جو خالص اسلامی جماعت.........اور غلبہ وقوت والی ہو نہ موجود ہے نہ قریب میں اس کی توقع ہے۔

(اس لئے ایسے حالات میں عارضی حکم یہی ہے اور) اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ (مسلمان) موجودہ جماعتوں میں سے کسی جماعت میں داخل ہوں اور قواعد شرعیہ کی رو سے ان میں جو نقص ہو اس کی اصلاح کریں اور اگر ان میں ایک کی اصلاح آسان ہو اور دوسرے کی دشوار ہو تو مذکورہ قاعدہ کے مطابق اس میں داخل ہو جائیں جس کی اصلاح آسان ہے۔

بس مسلمانوں کو اطمینان و توکل کے ساتھ (ایسی ہی) جماعت میں داخل ہو جانا چاہئے پھر ان میں جو اہل قوت و اہل اثر ہیں ان کو اپنی قوت و اثر سے اس کی اصلاح کی کوشش کرنا چاہئے اور اصلاح کے طریقوں میں علماء محققین سے مدد لیتے رہیں، (یہ حکم عارضی ہے) اور جب کوئی جماعت مسلمہ منظم، صاحب قوت صاحب اثر تیار ہو جائے...... (اس کے ساتھ) مل کر کام کریں، موافق مخاطب ہر ایک کے ساتھ اسلامی اخلاق کو اپنا شعار رکھیں۔ (تنظیم المسلمین، افادات اشرفیہ ص ۲، ۷، ۳، ۷، ۴، ۷)

موجودہ پارٹیوں میں سے کسی پارٹی میں شریک ہونے کا شرعی ضابطہ

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ موجودہ فضا میں مسلمانوں کو شدید استحکام (مضبوطی) کے ساتھ منظم ہونے کی سخت ضرورت ہے اور ان کے تمام مصالح ومنافع کی حفاظت اور تمام مضار ومفاسد سے صیانت (یعنی ترقی کرنے اور نقصان سے بچنے کی تدبیریں) اسی تنظیم پر موقوف ہے۔

مگر اس کے ساتھ ہی ہر مسلمان پر یہ بھی واجب ہے کہ وہ تنظیم حسب قدرت احکام شرعیہ کے بالکل موافق ہو۔ اگر اس وقت ملک میں اس صفت کی کوئی منظم جماعت موجود ہوتی یا قریب میں اس کی توقع ہوتی تو جواب واضح تھا۔ لیکن موجودہ حالت میں نہایت افسوس ہے کہ ایسی جماعت کا نہ تحقق ہے۔ نہ قریب میں توقع۔ اس لئے اس کے سوا چارہ کار نہیں کہ موجودہ جماعتوں میں سے کسی جماعت میں داخل ہوں اور قواعد شرعیہ کی رو سے۔ اس میں جو نقص (غلط کام) ہو، (حسب قدرت) اس کی اصلاح کریں اور اگر ان میں ایک کی اصلاح آسان اور دوسرے کی دشوار ہو (یا ایک میں ضرر زیادہ ہو دوسرے میں کم ہو) تو اس میں داخل ہو جائیں جس کی اصلاح آسان ہو۔ یہ قاعدہ عقلیہ ونقلیہ من ابتلی ببلیتین فلیختر اهونهما (افادات اشرفیہ ص ۴۲)

یہ قاعدہ شرعیہ ہے کہ جس جگہ دو قسم کے ضرر جمع ہوں ایک اشد (سخت) دوسرا اہون (ہلکا) تو اشد سے بچنے کے لئے اس کو دفع کرنے کے لئے اہون (ہلکے) کو اختیار کرنا چاہئے۔ (امداد الفتاویٰ ص ۳/ ۴۳۰، کمالات اشرفیہ ص ۱۱۵، افادات اشرفیہ ص ۴۳)

کسی سیاسی جماعت میں شریک ہونے کے بعد علماء وعوام کے لئے لائحہ عمل اور ضروری ہدایت

موجودہ حالت میں اس کے سوا چارہ کار نہیں کہ موجودہ (سیاسی) جماعتوں میں سے کسی جماعت میں داخل ہوں............ اس لئے میری رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کو اطمینان

وتوکل کے ساتھ ایسی جماعت) میں داخل ہو جانا چاہئے جس کی اصلاح آسان ہے۔
۱- (پھر) قواعد شرعیہ کی رو سے اس جماعت میں جو نقص (خرابیاں) ہوں اس کی اصلاح کریں۔
۲- جو لوگ اہل قوت اور اثر والے ہیں ان کو اپنی قوت واثر سے اس کی اصلاح کی کوشش کرنا چاہئے۔
۳- اور جو اہل قوت نہیں (جن کا اثر نہیں ان کو چاہئے کہ) وہ اہل قوت کو وقتاً فوقتاً یاد دہانی کر کے تقاضے کے ساتھ ان سے اصلاح کی درخواست کرتے رہیں۔
۴- اور اصلاح کے طریقوں میں علماء محققین سے مدد لیتے رہیں۔
۵- جو علماء اس میں شریک ہوں ان سے تو علمی وعملی دونوں قسم کی امداد حاصل کریں۔
۶- اور جو علماء اس میں کسی مصلحت یا عذر سے باضابطہ شریک نہ ہوں ان سے صرف علمی مدد لیں یعنی ان سے واقعات (اور صورت حال) ظاہر کر کے شرعی احکام معلوم کرتے رہیں اور ان کے موافق حالت کو درست کرتے رہیں۔
۷- اور جو علماء باضابطہ کسی جماعت میں شریک نہ ہوں وہ بھی بیکار نہ رہیں، بلکہ وہ اس سے اہم خدمت میں مشغول رہیں۔ اور وہ خدمت ہے خدا کے بندوں کو احکام شرعیہ کی تعلیم و ترغیب دینے کی جو مشترک طریقہ ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کا۔
۸- بلکہ پہلی قسم کے علماء (جو باضابطہ سیاسی جماعت میں شریک ہیں ان) کو بھی جتنا وقت خدمت سے بچے احکام کی اشاعت میں حصہ لینا ضروری ہے۔
۹- اپنی تنظیم کو ہمیشہ ہمیشہ مستقلاً جاری وباقی رکھیں۔ اس کو کمزور نہ کریں۔
سب حالات میں قول وعمل، تقریر وتحریر میں موافق ومخالف ہر ایک کے ساتھ اسلامی اخلاق کو اپنا شعار رکھیں۔

خلاصہ دستور العمل یہ ہے کہ......... رضائے حق کو مطمح نظر رکھ کر اپنے کام میں لگے رہیں۔ اور اس رضا کی شرط یہ ہے کہ ہر کام میں اس کا پورا لحاظ رکھیں کہ کوئی امر خلاف شرع نہ ہونے پائے۔ یہی عبدیت کی روح اور حیات مسلم کی اصل الاصول ہے۔ اور اس استقلال واستقامت کے ساتھ دعا وابتہال کو اصل وظیفہ وتدبیر سمجھیں۔ اور پھر حق تعالیٰ کی

نصرت کے منتظر رہیں اور ایک دعا بھی نماز کے بعد ورد رکھنے کے قابل ہے۔

اللھم انصر من نصر دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم وجعلنا منھم واخذل من خذل دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم ولا تجعلنا منھم

(آمین) (تنظیم المسلمین، امداد الفتاویٰ ص ۴/۶۳۰)

سیاسی اختلاف

سیاسی مسائل میں اختلاف کی بنیاد

بعض مسائل تو قطعی ہوتے ہیں ان میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہوتی، اور بعض مسائل اجتہادی وظنی ہوتے ہیں ان میں سلف سے خلف تک شاگرد نے استاذ کے ساتھ، مرید نے پیر کے ساتھ، چھوٹی جماعت نے بڑی جماعت کے ساتھ، ایک نے کئی کے ساتھ اختلاف کیا ہے اور علمائے امت نے اس پر نکیر نہیں فرمائی اور نہ ایک نے دوسرے کو گمراہ گنہگار کہا، نہ کسی نے دوسرے کو اپنے ساتھ متفق ہونے پر مجبور کیا۔ نہ اختلاف کے ہوتے ہوئے بغض عداوت، ہوا، نہ مناظرہ پر اصرار کیا گیا۔ چنانچہ مشاجرات میں صحابہ کا اختلاف اور علیحدہ رہنے والوں کی علیحدگی کو سب کا جائز رکھنا معلوم ہے۔

ایسے ظنی اجتہادی مسائل میں اختلاف دو طرح سے ہوتا ہے۔ ایک دلائل کے اختلاف سے جیسے حنفی شافعی میں قرأت فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں۔ دوسرے واقعات (حالات) یا عوارض کے اختلاف سے جیسے امام صاحب اور صاحبین نے صائبات کے مسئلہ میں کہ جن کی تحقیق یہ ہے کہ وہ اہل کتاب میں سے ہیں انہوں نے ان سے نکاح کو جائز رکھا اور جن کی تحقیق یہ ہے کہ وہ اہل کتاب میں سے نہیں انہوں نے اس نکاح کو ناجائز رکھا۔ تو یہ واقعہ کی تحقیق میں اختلاف ہوا کہ وہ اہل کتاب میں ہیں یا نہیں۔ اس لئے فتویٰ میں اختلاف ہوا، سیاسی مسائل میں بھی اختلاف کی یہی دو بنیادیں ہوتی ہیں۔ (سیاسیات حاضرہ ص ۵)

سیاسی اجتہادی مسائل میں اختلاف کا حکم

اس تمہید سے امور ذیل معلوم ہوئے۔

ایک یہ کہ اس (قسم) کے اختلاف قطعی نہیں ظنی اجتہادی ہیں پس ان میں اختلاف کی گنجائش ہے گو کوئی چھوٹے درجہ کا طالب علم ہی کسی بڑے عالم کے ساتھ اختلاف کرے۔ محض اس اختلاف سے کسی فریق (جماعت) کو دوسرے فریق پر لعن طعن سب وشتم (برا بھلا کہنا) یا اس کو کافر، فاسق کہنا یا ظلم و زیادتی کرنا، ایذا پہنچانا، زبان سے یا عمل سے، یا کسی بزرگ کا مخالف و بے ادب مشہور کر کے بدنام کرنا جائز نہیں۔

البتہ منکرات شرعیہ پر انکار اور اس کی برائی کرنا یہ واجب ہے اس میں کسی مسلمان کا اختلاف نہیں۔ (سیاسیات حاضرہ، افادات اشرفیہ ص ۷)

سیاسی امور میں اہل حق کا مسلک

سیاسی مسائل میں جب تک کسی قطعی فیصلہ کی شرعی ضرورت نہ ہو سکوت (یعنی خاموش رہنا ہی) مصلحت ہے۔

اس درسگاہ کا مسلک مختصر الفاظ میں ہمیشہ یہ رہا اور ہے کہ اس نے نہ اعلان حق میں کبھی دریغ کیا نہ عمل میں کبھی نمائش اور ہنگامہ آرائی کو دخل دیا اس کی جماعت جس طرح شورش پسند نہیں ہے۔ اسی طرح کسی اثر سے متاثر ہو کر کتمان حق کرنے والی (یعنی حق کو چھپانے والی) بھی نہیں ہے یہ اس کا قدیم جماعتی مسلک ہے۔ جس پر کسی انفرادی یا شخصی عمل کی ذمہ داری نہ کبھی پہلے عائد ہوئی ہے اور نہ اب ہو سکتی ہے۔ (معاملۃ المسلمین ص ۳۴)

سیاسی مسئلہ میں شرعی حکم میں اگر علماء کا اختلاف ہو جائے

جو معاملات پیش آئیں ان کے متعلق اگر علماء میں اختلاف ہو تو جو علماء کسی جماعت میں باضابطہ شریک نہ ہوں ان سے استفتاء کیا جائے۔

اور ان میں بھی اگر اختلاف ہو جائے تو شرعاً دونوں شقوں میں گنجائش سمجھی جائے۔ اور دونوں شقوں (صورتوں) میں سے مدبروں (جن کو سیاسی تجربہ حاصل ہے اور اللہ نے انہیں عقل سلیم دی ہے ان کے) نزدیک جو مصلحت ہو اس پر عمل کیا جائے۔ (تنظیم المسلمین، امداد الفتاویٰ ص ۶۲۹ ج ۴)

سیاسی مسائل میں عوام کس کے فتوے پر عمل کریں

سوال:۔ اگر کسی ایک عالم یا علماء کسی جماعت نے افعال مذکورہ میں شرکت یا موافقت کا فتویٰ دے دیا خواہ کسی فاسد غرض سے یا خلوص کے ساتھ اجتہادی غلطی سے............ مگر بہت سے علماء اس فتویٰ سے متفق بھی نہیں تو کیا سب مسلمانوں پر اس فتوے پر عمل کرنا واجب ہوجاتا ہے یا جس سے جس کو اعتقاد ہو اس کے فتویٰ پر عمل کرسکتا ہے اور کیا چند علماء سے خواہ وہ اکثر ہوں اتفاق کرلینا اجماع میں داخل ہوگا جس کی مخالفت ناجائز ہوتی ہے۔

الجواب:۔ ایسا فتویٰ سب پر حجت نہیں، ہر شخص کو جائز ہے کہ جس عالم سے عقیدت ہو اس کے فتوے پر عمل کرے...... اور جواز شرکت کا فتویٰ دینے والوں کے قول میں اگر تاویل ہی کردی جائے تو غنیمت ہے۔ مثلاً یہ کہ ان کی نیت نیک ہوگی، اور ان مفاسد پر ان کی نظر نہ ہوگی۔ اور اس کو اجماع تو کسی طرح کہہ ہی نہیں سکتے۔

اجتہادی مسائل میں ایک شق کو درست سمجھنا اور دوسری شق پر ملامت کرنا، ظلم وتعدی (حد سے آگے بڑھنے) کا مصداق ہے۔ (معاملات المسلمین، افادات اشرفیہ ص ۳۳)

ممکن ہے کوئی اپنے اجتہاد سے کسی مصلحت سے (کسی سیاسی نظریے کو) ضروری کہہ دے مگر وہ وجوب اجتہادی ہوگا دوسرے پر حجت نہیں۔ (افادات اشرفیہ ص ۱۰)

سیاست کے شرعی احکام

یا تو قتال یا پھر صبر اس کے علاوہ بھوک ہڑتال جیل بھرو تحریک شرعی حکم کے خلاف ہے

فرمایا شریعت میں دو ہی صورتیں ہیں قوت کے وقت مقابلہ اور عاجزی کے وقت صبر، خدا معلوم، یہ تیسری صورت بخوشی گرفتار ہوجانے کی کہاں سے نکال لی۔

فرمایا شرعی دستور العمل یہ ہے کہ اگر قدرت ہو تو قتال کریں اور اگر قدرت نہیں ہے تو صبر کریں۔ اور درمیانی صورتیں مثلاً جتھوں کا جیل جانا، پٹنا، بھوک ہڑتال وغیرہ سب نصوص

کے مقابلہ میں اجتہاد ہے اور نصوص کے خلاف اجتہاد کرنے میں بہت بڑا حرج ہے۔
اگر خودکشی سے کسی کو فائدہ پہنچے تب بھی خودکشی جائز نہیں چہ جائیکہ کوئی فائدہ بھی نہ پہنچے تو اس کا درجہ ظاہر ہے۔ یعنی اگر یہ معلوم ہو جائے کہ خودکشی کرنے سے کفار پر اثر ہوگا تو کیا خودکشی کرنا جائز ہو جائے گا؟ اگر خودکشی پر کوئی نفع بھی مرتب ہوتو یہ خود اتنا زبردست نقصان ہے جس کا پھر کوئی بدل نہیں۔
نیز ہر نفع کا اعتبار نہیں اس کی مثال تو ایسی ہے کہ کوئی شخص یوں کہے کہ اگر تم کنویں میں گر جاؤ تو فلاں شخص کی جان بچ سکتی ہے تو کیا اس کی جان بچانے کی غرض سے کنویں میں گر جانا جائز ہے؟
نیز قدرت علی اضرار الخصم (یعنی اپنے مخالف فریق کو نقصان پہنچانے کی قدرت) یہ ہے کہ جس میں خصم کا کوئی معتد بہ (لائق اعتبار) نقصان ہو اور اس کے ساتھ اپنا کوئی یقینی ضرر نہ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ جیل وغیرہ جانے میں اپنا تو ضرر ہے۔ اور ان کا کوئی معتد بہ (خاص) ضرر نہیں۔
نیز قدرت کی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ جو کام ہم کرنا چاہتے ہیں اس پر تو قدرت ہے لیکن اس کے کر لینے کے بعد جن خطرات کا سامنا ہوگا ان کے دفع کرنے پر قدرت نہیں۔
دوسرے یہ کہ فعل پر قدرت ہے اور پھر جو خطرات پیش آئیں گے ان کے دفع کرنے پر بھی قدرت کا عادتاً ظن غالب ہو، پہلی صورت استطاعت لغویہ ہے دوسری صورت استطاعت شرعیہ ہے۔
مدافعت کی فرضیت کیلئے استطاعت شرعیہ شرط ہے۔ (یعنی دوسری قسم کی قدرت) استطاعت لغویہ کافی نہیں...... نیز ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس دفاع کے بعد اس سے زیادہ شر میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ (ملفوظات اشرفیہ ص ۷۹ طبع پاکستان)

کافروں سے بائیکاٹ اور ان سے قطعاً معاملات نہ کرنے کا شرعی حکم

بائیکاٹ یا نان کا اپریشن جہاد کے افراد میں سے نہیں...... بلکہ مقاومت (ومقابلہ) کی مستقل تدبیریں جو مباح ہیں کرنا چاہئے۔ اور ممکن ہے کہ کوئی اپنے اجتہاد سے کسی ضروری

مصلحت سے ضروری بھی کہہ دے مگر وہ وجوب اجتہادی ہوگا دوسرے پر حجت نہیں، اور اس کو واجبات مقصودہ شرعیہ سے نہیں کہا جاسکتا۔

(شرعی حکم تو یہ ہے کہ) بعض خاص تجارتوں کے علاوہ سب چیزوں کی خرید وفروخت کا معاملہ اہل حرب (یعنی حربی کافر) تک کے ساتھ بھی جائز ہے چہ جائیکہ معاہدین کے ساتھ (جن کے ساتھ صلح ومعاہدہ ہوا ہو) شرح سیر کبیر ج سوم میں اس کی تصریح موجود ہے۔

باب مایکرہ ادخال دارالحرب الا انہ لاباس بذالک فی الطعام والثیاب ونحو ذالک

اس وقت گاڑھا اور ولایتی کپڑا پہننے کا سوال اکثر ہوتا ہے اگر اس کی بناء (مقصد) بائیکاٹ ہے تب تو اس کا حکم وہی ہے جو اوپر گزر چکا ہے اور اگر اس سے قطع نظر یوں ہی (یعنی بائیکاٹ کے بغیر) ہے تو دونوں میں اباحت ہے (خواہ پہنے یا نہ پہنے) مگر تشبہ نہ ہندوؤں کے ساتھ جائز ہے نہ انگریزوں کے ساتھ۔ (افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ ص۱۰، ۱۲، ۲۷)

ہڑتال کرنے کا شرعی حکم

سوال:۔ اپنے رہبروں (علماء لیڈروں) کی گرفتاری وغیرہ کے موقع پر ہڑتال کردینا یعنی دکانیں بند کرانا اگرچہ کسی کو دکان بند کرنے سے فاقہ ہی کی نوبت آجائے اور جو شخص ان مقاطعت اور احتجاجات میں شریک نہ ہو اس کو تکلیف پہنچاتے ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات موقع پاکر مار پیٹ میں بھی دریغ نہ کریں۔ شریعت میں اس کا کیا حکم ہے۔

الجواب:۔ اس میں بھی وہی خرابیاں ہیں جو نمبر ۳ میں مذکور ہوئیں اور اگر ان احتجاجات میں شرکت نہ کرنے پر جسمانی ایذا (تکلیف پہنچانے) کی بھی نوبت آجائے تو اس کا گناہ مالی نقصان سے بھی زیادہ سخت اور اسلام تقاضے کے منافی ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المسلم من سلم المسلمون

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کامل مسلمان وہ ہے جو کہ دوسرے مسلمان اس کی زبان و ہاتھ سے محفوظ ہوں اور مومن تو وہی ہے کہ جس سے لوگ اپنے مالوں اور جانوں کے حق میں مطمئن ہوں۔''

پھر ان مقاطعات (بائیکاٹ) پر مجبور کرنے میں یہ ظالم خود اپنے تسلیم کردہ قانون آزادی کے بھی خلاف کر رہے ہیں، ورنہ کیا وجہ ہے کہ اپنی آزادی کی تو کوشش کریں اور دوسروں کی آزادی کو ختم کریں۔ (افادات اشرفیہ ص ۲۲، در مسائل سیاسیہ ص ۲۸)

شرعی قاعدہ کا مقتضیٰ

فرمایا جن چیزوں کی خیر القرون میں حاجت نہیں ہوئی اور خیر القرون کے بعد وہ حاجت پیش آئی اور نصوص ان کے خلاف نہ ہوں وہ تو مسکوت عنہا ہو سکتی ہے۔ اور حکام کے مظالم تو ہمیشہ پیش آتے رہے ہیں۔ لیکن پھر بھی نصوص میں جہاد یا صبر ہی کا حکم ہے تو اس اعتبار سے یہ نئی گھڑی ہوئی۔ تدبیریں مسکوت عنہا نہ ہوں گی بلکہ منہی عنہا (یعنی منع) ہوں گی کہ باوجود ضرورت کے متقدمین نے ان کو ترک کیا تو اجماع ہوا، اس کے ترک پر اس لئے ممنوع ہیں۔ (ملفوظات کمالات اشرفیہ ص ۱۱۷)

از خود بھوکا رہ کر جان دے دینے کا شرعی حکم

سوال:۔ اگر کوئی گرفتار ہو جائے ان میں سے بعض لوگ جیل خانہ میں مقابلہ جوعی کرتے ہیں یعنی بھوک کی ہڑتال کرتے ہیں یعنی کھانا نہیں کھاتے یہاں تک کہ مر جاتے ہیں اور قوم میں ان کی تعریف کی جاتی ہے۔

الجواب:۔ اس کا خودکشی اور حرام ہونا ظاہر ہے۔

قال اللہ تعالیٰ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ

کتب فقہ ہدایہ وغیرہ میں تصریح ہے کہ جان بچانا اس درجہ فرض ہے کہ اگر حالت اضطرار میں مر جانے کا اندیشہ ہو اور مردار کھانے سے جان بچ سکتی ہو اس کا نہ کھانا اور جان دے دینا معصیت (اور گناہ) ہے چہ جائیکہ حلال کھانا چھوڑ کر جان دے دینا۔

اور اس فعل کی تعریف کرنے میں تو کفر کا اندیشہ ہے کہ شریعت کی صریح تکذیب ہے کہ شریعت جس چیز کو مذموم کہتی ہے یہ اس کو محمود کہتا ہے۔ (افادات اشرفیہ ص ۳۹، ۲۳)

حکومت کے خلاف بائیکاٹ کرنے اور حکومت کی قانون شکنی کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ملک ہندوستان میں ایک غیر مسلم قوم حکمراں ہے اس سے آزادی حاصل کرنے کے لئے مندرجہ ذیل تدبیریں اختیار کرنے کا شرعی حکم کیا ہے؟

ا:۔ حکومت کی قانون شکنی کی جائے گو وہ قانون نفسہ مباح ہو یعنی اس کے ماننے سے کسی واجب کا چھوڑنا یا حرام کا ارتکاب لازم نہ آئے اور اگر حکومت اس پر سختی کرے تب بھی مدافعت نہ کرے نہ مقابلہ سے نہ قانون شکنی سے باز آنے سے گو اس اصرار سے بعض اوقات ہلاکت تک کی نوبت آجائے، حالانکہ قانون شکنی سے بچ کر اپنی جان کی حفاظت ہوسکتی تھی۔

۲:۔ حکومت سے معاملات میں مقاطعہ (بائیکاٹ) کیا جائے یعنی نہ ان کی نوکری کریں اگرچہ جائز ہی نوکری ہو، اور اگرچہ دوسرے ذرائع معاش کے نہ پائے جانے سے اور نوکری نہ کرنے سے کتنی ہی تنگی ہو، اور اس کی تعلیم گاہوں میں تعلیم حاصل کی جائے اگرچہ وہ تعلیم مباح ہی ہو، اور نہ اس کے ملک کی تجارتی اشیاء خریدی جائیں۔

۳:۔ جن دکانوں پر ایسی چیزوں کی تجارت ہوتی ہے ان پر پہرے دار مقرر کئے جائیں کہ وہ خریداروں کو جس طرح ممکن ہو روکیں.......... نہ مانیں تو راستے میں لیٹ جائیں تاکہ وہ مجبور ہوجائیں، اگر خرید چکے ہوں تو ان کو واپسی پر مجبور کریں، گو دکاندار خوشی سے واپس نہ کرے اسی طرح دکانداروں کو ایسی چیزوں کی تجارت بند کرنے پر مجبور کریں اگر وہ نہ مانیں تو اس کو طرح طرح کی تدبیروں سے نقصان پہنچائیں۔ دھمکیاں دیں گو اس دکاندار کے پاس اور کوئی ذریعہ معاش نہ ہو۔

الجواب:۔ یہ افعال شرعاً جائز نہیں اور مسلمانوں کو ایسے افعال کا ارتکاب جائز نہیں

ا:۔ حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں۔

وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ

اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو۔

اور جس حالت میں اس قانون پر عمل کرنا شرعاً جائز ہو تو بلا ضرورت ایسی قانون شکنی کا انجام ہلاکت ہے۔

۲:۔ یہ مقاطعہ (بائیکاٹ) بعض اوقات واجب کے چھوڑنے کا ذریعہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً کسی کے پاس جائز نوکری یا کسی خاص تجارت کے علاوہ دوسرا کوئی ذریعہ معاش نہیں اور اہل وعیال کے حقوق کی ادائیگی کے لئے اس پر کمانا واجب ہے تو اس بائیکاٹ سے اس واجب کا ترک لازم آتا ہے اور واجب کا ترک معصیت ہے۔

اور جن مقاطعات میں واجب کا ترک لازم نہ بھی آتا ہو مگر حکومت سے عداوت لازم آتی ہے اور بلا ضرورت شرعیہ کمزور کے لئے جائز نہیں کہ قوی (طاقتور) کو اپنا دشمن بنالے کہ اس میں بھی اپنے کو مصیبت میں ڈالنا ہے...... اور اس پر کسی کو مجبور کرنا ظلم واکراہ ہے جس کا حرام ہونا ظاہر ہے۔

۳:۔ یہ صورت بھی کئی گناہوں پر مشتمل ہے، ایک مباح فعل کے ترک پر مجبور کرنا۔ دوسرے خرید وفروخت پوری ہو جانے کے بعد واپسی پر مجبور کرنا اور زیادہ گناہ ہے کیوں کہ اس میں شرعاً متعاقدین (بیچنے خریدنے والے) کی رضامندی شرط ہے، تیسرے نہ ماننے والوں کو تکلیف دینا جو کہ صریح ظلم ہے، چوتھے اہل وعیال کو تکلیف پہنچانا کہ یہ بھی ظلم ہے۔ (افادات اشرفیہ ص ۲۷)

خلاف قانون گولہ، بارود بم بنانا

سوال:۔ سکہ ڈھالنا یا بندوق کی بارود بلا لائسنس بنانا قانوناً تو ناجائز ہے تو کیا شرعاً بھی ناجائز ہے؟ اور کیوں؟

الجواب:۔ چونکہ اس میں خطرہ ہے اور خطرہ میں پڑنا شرعاً ناجائز ہے۔ اس لئے بچنا واجب ہے۔ (امداد الفتاویٰ ص ۱۳۹ ج ۴)

نوٹ:۔ جن حالات میں اپنے کو خطرہ میں ڈالنا جائز ہوگا اس وقت اس کا حکم بھی مختلف ہوگا۔ (مرتب)

کفار کی مذمت اوران کی برائی کرنے کا شرعی حکم

کفار کی مذمت مطلقاً معیوب و مذموم نہیں اگر کسی صحیح غرض کے لئے ہوتو دفاع کے لئے جب قتال تک جائز ہے بلکہ بعض صورتوں میں واجب وفرض ہے تو ہجو (یعنی ان کی برائی تحقیر کرنا) اس سے بہت ہلکی چیز ہے خصوصاً جب کہ اس کا مقصد اپنے ذاتی دشمنوں سے نہیں بلکہ دشمنان دین سے انتقام لینا ہواور تجربہ سے اس حربہ کا موثر اور کارگر ہونا ثابت ہو چکا ہے۔

کیونکہ جب وہ دیکھیں گے کہ ہم کہیں گے تو اس سے زیادہ سنیں گے تو ان کی ہمت ٹوٹ جائے گی تو اس میں مسلمانوں کی حفاظت ہے اور شر وایذا سے اہل حق کی حفاظت اعظم اخلاق میں سے ہے......... اس حکمت کی طرف خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ قریب بصراحت فرمایا ہے۔ حیث قال۔

"اهجوا قريشا فانه اشد عليها من شق النبل وقال صلى الله عليه وسلم ان روح القدس يويدك (رواه الفتاوی ص ۵۸۳/۴)

(لیکن) غیبت کافر ذمی کی بھی حرام ہے کیونکہ اس کو تکلیف دینا حرام ہے اور حربی کافر کی غیبت تضیع وقت کی وجہ سے مکروہ ہے۔ (بیان القرآن سورہ حجرات)

صلح واتفاق کے لئے شعائر اسلام کو ترک نہیں کیا جائے گا

صلح حدیبیہ کے قصہ سے استدلال کیا گیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھوانا چاہا تو مشرکین نے اس کے لکھے جانے سے انکار کیا۔ آپ نے اپنی اس درخواست کو منظور فرما کر بسمک اللھم لکھوایا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محمد رسول اللہ لکھوانا چاہا تو انہوں نے محمد رسول اللہ لکھے جانے سے بھی انکار کیا آپ نے محمد بن عبداللہ اس کی جگہ لکھوایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ صلح کے لئے شعائر اسلام کو بھی چھوڑنا درست ہے۔

میں اس کے متعلق ایک موٹی سی بات عرض کرنا چاہتا ہوں اس لئے کہ باریک بات تو علماء جانتے ہیں وہ یہ کہ دنیا جانتی ہے۔ اور ہر شخص کو یہ بات معلوم ہے کہ جب دو قوموں سے صلح ہوتی ہے اور صلح نامہ لکھا جاتا ہے تو وہ صلح نامہ فریقین کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ اور اس

صلح نامہ میں وہی مضمون لکھا جاتا ہے جو دونوں فریق کے مسلمات میں سے ہو (یعنی دونوں کو تسلیم ہو) اس میں کوئی ایسی بات نہیں لکھی جاتی جو فریقین کو تسلیم نہ ہو۔

جب یہ حقیقت ہے تو اب سنئے کہ جس صلح نامہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکھوانا چاہا تھا۔ اس کے ساتھ صرف مسلمان ہی کا تعلق نہ تھا بلکہ مشرکین مکہ بھی اس سے تعلق رکھتے تھے۔ یعنی وہ (صلح نامہ) دونوں کی طرف سے منسوب تھا، اور دونوں ہی کے اس پر دستخط ہوئے ہیں۔

اور جیسا کہ اس میں یہ بات قابل لحاظ تھی کہ اس میں کوئی بات مسلمانوں کے خیالات کے خلاف نہ ہو۔ اسی طرح یہ بات بھی قابل رعایت تھی کہ صلح نامہ کا ہر مضمون خصم کو بھی تسلیم ہو اسی وجہ سے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکھوانا چاہا تو مشرکین اور کفار مکہ نے صلح نامہ میں اس کا لکھا جانا منظور نہ کیا۔ اور ان کا اس انکار کرنے سے مطلب یہ تھا کہ صلح نامہ جس طرح مسلمانوں کی طرف منسوب ہوگا۔ اسی طرح ہماری طرف منسوب کیا جائے گا۔ اور جس طرح مسلمانوں کے اس پر دستخط ہوں گے اسی طرح ہم کو بھی دستخط کرنے ہوں گے، اس لئے صلح نامہ میں ایسے الفاظ نہ ہونا چاہئے۔ جس کے قبول کرنے سے ہم کو انکار ہے۔ کیونکہ ایسے الفاظ ہوتے ہوئے اس پر ہمارے دستخط کیسے ہوں گے۔ کفار مکہ کو فریق ہونے کی...... حیثیت سے صلح نامہ کے مضمون میں دخل دینے کا حق حاصل تھا۔ اور بسمک اللھم اور محمد بن عبداللہ کا لکھا جانا مسلمانوں کے کسی خیال کے خلاف نہ تھا۔ اس وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس درخواست کو منظور فرمالیا۔ اور وہی الفاظ مضمون صلح نامہ میں درج کرائے جو دونوں فریق کے متفق علیہ تھے اور جن الفاظ پر فریقین کو دستخط کردینا آسان تھا۔

اب اس کی حقیقت سمجھ لینے کے بعد بتلائیے کہ کیا اس سے یہ استدلال صحیح ہوسکتا ہے کہ صلح کیلئے مذہب کے اصول (شعائر اسلام) کو ترک کرنا درست ہے۔ (الافاضات الیومیہ ص ۲۱،۲۲ ج ۱)

مسئلہ امامت وامارت اور اس کے شرائط

سوال:۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی غیر منظم حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے ضرورت

کا تقاضا ہے کہ امارت الاسلام کی کوئی صورت نکالی جائے۔ کیا آپ بیان فرمائیں گے کہ یہ مسئلہ شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟

ا:۔ کیا ہم کو کل ہندوستان کے لئے یا کسی خاص علاقہ کے لئے اپنا امیر مقرر کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

۲:۔ اگر حق حاصل ہے تو کیا شرائط ہیں۔

۳:۔ اور آپ کی رائے عالی میں اس کے حاصل ہونے کے کیا ذرائع اور صورتیں بہم پہنچائی جاسکتی ہیں؟

الجواب:۔ ا:۔ حاصل ہے بشرط قدرت۔ اور مشاہدہ ہے کہ موجودہ حالت میں امارت ارادیہ پر قدرت ہے اور امارت قہریہ پر قدرت نہیں۔

۲:۔ تدین اور عقل۔

۳:۔ یہ حکم شرعی کا سوال نہیں جس کا اہل علم سے جواب لیا جائے تدبیر کا سوال ہے جس کا جواب اہل تجربہ سے لینا چاہئے۔ (امداد الفتاویٰ ص ۵۸۰/۴)

اس کام میں ضرورت ہے اتفاق کی............ اس کے لئے ارادت کافی نہیں قہر وقوت کی ضرورت ہے۔ اور وہ قوت امیر المومنین ہے اور اس وقت مسلمانوں کا کوئی (ایسا) امیر یا سردار نہیں جو ان کی قوت کو ایک مرکز پر جمع رکھ سکے جو روح ہے اس کام کو کرنے کی سب سے بڑا اور اہم مسئلہ یہ ہے۔ (الافاضات الیومیہ ص ۱۱۹)

امیر مقرر کرنے کے شرائط وجوب

نصب خلیفہ (یعنی امیر مقرر کرنا) واجب ہے۔ لیکن واجب کے لئے قدرت شرط ہے اور قدرت اس وقت مفقود ہے۔ اس واسطے گو عالم اس وقت خلیفہ سے خالی ہے لیکن بایں حالات خلیفہ کے نہ ہونے سے کوئی گناہ نہیں۔ (الکلام الحسن ص ۱۵)

(الغرض) امام کا مقرر کرنا دیگر دلائل سے واجب ہے اور تمام واجبات کا وجوب قدرت کے ساتھ مشروط ہے اور امام مقرر کرنے پر قدرت کی شرائط میں مسلمانوں کا اتفاق بھی ہے اور وہ موجودہ حالت میں (قدرت قہریہ نہ ہونے کی بنا پر) کبریت احمر (گویا محال) ہے۔ لہٰذا نہ گناہ

لازم آئے نہ جاہلیت کی موت لازم آئے گی۔ (امداد الفتاویٰ ص ۳۶۹/۴ سوال ۴۶۱)

حدیث من لم یعرف امام زمانہ کی تشریح

من لم یعرف امام زمانه اس حدیث کے معنی بندہ کے نزدیک یہ ہیں کہ اپنے زمانہ کے امام کو نہ پہچاننا یہ امام کی اطاعت نہ کرنے سے کنایہ ہے۔ اور یہ صادق آتا ہے امام کے موجود ہونے پر (گویا) لازم بول کر ملزوم مراد لیا ہے۔ کیونکہ امام کو نہ پہچاننا یہ مستلزم ہے اطاعت نہ کرنے کو۔ (امداد الفتاویٰ ص ۳۶۹/۴)

کس امیر وسلطان کی اتباع واجب ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور کہنا سنو اور بات مانو اگرچہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو۔ (ابوداؤد)

فائدہ:۔ اگرچہ حبشی غلام شرعی قاعدہ سے امام وخلیفہ نہیں ہوسکتا مگر شریعت میں جس طرح امام خلیفہ کی اطاعت واجب ہے اسی طرح سلطان کی بھی یعنی جس کو تسلط وشوکت (اور غلبہ) حاصل ہو جائے اور مسلمان اس کے سایہ حمایت میں امن وعافیت سے رہ سکیں۔ سو سلطان ہونے کے لئے وہ شرائط نہیں جو امامت وخلافت کے لئے ہیں البتہ اسلام شرط ہے۔

لقوله تعالیٰ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ (فروع الایمان ص ۷۷)

جس نے کسی امام سے بیعت نہیں کی وہ جاہلیت کی موت مرے گا

سوال:۔ ایک صاحب یہاں مشکوٰۃ شریف پڑھتے ہیں ان کو ایک حدیث میں شبہ ہے اور بندہ کو بھی شبہ ہے وہ حدیث یہ ہے۔

من مات وليس فى عنقه بيعه مات ميته الجاهليه (رواه مسلم)

جو شخص اس حال مرا کہ اس کو اپنے امام کی بیعت حاصل نہ ہوا ایسا شخص جاہلیت کی موت مرا۔ (شراح نے) بیعت کے تحت میں اے للامام لکھا ہے۔ اس حدیث کا کیا مطلب

ہے۔اور ہم لوگوں کے لئے اس امر میں نجات کی کیا صورت ہے؟

الجواب:۔ لیس فی عنقہ سے کنایہ ہے خروج عن طاعۃ الامام سے (یعنی امام کے خلاف بغاوت کرنے سے) اور یہ محقق ہے وقت تحقق امام کے (یعنی یہ اسی وقت ہوگا جبکہ خلیفہ وامام موجود ہو) اور جب امام نہ ہوتو اس معنی کر ولیس فی عنقہ بیعہ صادق نہیں آتا اس لئے کوئی تردد نہیں۔ (امداد الفتاوی ص ۸۸/۵)

الائمہ من قریش

فرمایا خلافت قریش کے لئے ہے غیر قریشی بادشاہ کو سلطان کہا جائے گا لیکن اطاعت اس کی بھی واجب ہوگی۔

اور بعض لوگوں نے جو کہا ہے کہ غیر قریشی بھی خلیفہ ہوسکتا ہے تو یہ نص کے خلاف ہے حدیث میں ہے الائمہ من قریش (یعنی امیر المومنین قریشی ہوں گے)

نیز حضرات انصار پر جب یہ نص (حدیث) پیش کی گئی تو انہوں نے بھی اس کو تسلیم فرمایا پس گویا اس پر صحابہ کا اجماع ہوگیا۔

اور وجہ اس کی وہ ہے جس کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ اسلام سے اوروں کا تو محض مذہبی تعلق ہے۔اور قریش کا خاندانی بھی تعلق ہے کہ نبی اس خاندان کے ہیں تو ان کو اسلام کی حمایت دو وجہ سے ہوگی .... البتہ جن لوگوں کے قبضہ میں سلطنتیں ہیں وہ اگر قریش کو جب کہ اس میں اہلیت ہو خلیفہ نہ بنائیں تو مجرم ہوں گے۔

(الکلام الحسن ص ۱۵، شریعت وسیاست ص ۱۷، القول الجلیل ص ۴۷)

شرعی حاکم نہ ہونے کی صورت میں اہل حل وعقد حاکم کے قائم مقام ہوں گے

شریعت نے بہت سے احکام میں ضرورت کے وقت عامۃ المسلمین (یعنی عام مسلمانوں) کو سلطان کے قائم مقام ٹھہرایا ہے جیسے نصب امام خطیب جمعہ اور وقف کے متولی

کا نصب کرنا وغیرہ لفقد ان السلطان المسلم۔ (ملفوظات اشرفیہ ص۴۰۲)

لیکن اب عام مومنین کا اجتماع تو مشکل ہے اسی لئے وہ لوگ ان کے قائم مقام ہوں گے جن کو عام مومنین سمجھیں گے کہ یہ ہمارے بڑے ہیں۔ ان کو زبان حال سے مانتے ہوں خواہ ان کا دینی اثر ہو یا دنیاوی اثر۔

وہ کون لوگ ہیں؟ اتقیاء و اہل حل وعقد۔ (حسن العزیز ص۳۷/۱۴۳سوم)

خلاصہ یہ کہ عام مومنین کا اجتماع ہر وقت دشوار ہے تو اس ضرورت سے عام مومنین میں جو ذی اثر لوگ ہوں گے۔ جیسے علماء و روساء، امراء، سلاطین، جن کو اہل حل وعقد کہا جاتا ہے وہ ان کے قائم مقام سمجھے جائیں گے اور ان ذی اثر لوگوں کا اجتماع (واتفاق) عام مومنین کا اجتماع قرار دیا جائے گا۔ (افاضات الیومیہ ص۲۲۰/۱۰)

مذہب وسیاست

ازافادات حکیم الامت مجدد ملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ

کفار حکمراں ہم پر کیوں مسلط کردیئے گئے

ایک شخص نے مجھ سے کہا، بتایئے کفار میں کون سی لیاقت اور کون سا ایسا استحقاق ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کو محروم کر کے ان کافروں کو حکومت عطا کی گئی ہے؟

میں نے کہا کہ مسلمان تو اپنی نالائقی اور نااہلی کی وجہ سے محروم ہوئے ہیں اور کافروں کو بلا استحقاق اور بلا قابلیت حکومت دے دی گئی تا کہ ہم کو تنبیہ ہو اور ہم خواب غفلت سے بیدار ہوں کہ جو چیز ہمارے پاس ہونا چاہئے تھی وہ ہماری غفلت کی وجہ سے دوسروں کے ہاتھ میں ہے۔ سو جب تک ہم اپنی حالت کو شرعی آئین کے ماتحت درست نہ کریں گے، حکومت کی باگ ڈور بھی ہمارے ہاتھ نہ آئے گی۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ بعض اوقات بادشاہ اپنی اولاد کو معمولی اور کم درجہ کے ملازمین سے سزا دلواتے ہیں تو کیا اس سے ان ملازمین کا محبوب اور اہل ہونا لازم آتا ہے؟ ہرگز نہیں ہاں اولاد کا نالائق ہونا ضرور ثابت ہوتا ہے (اسعد الابرار)

التعاظ بلغیر ملحقہ آداب انسانیت ص ۱۹۲، ص ۱۹۴ الاسلامی الحقیقی ص ۵۰۷

کیا اللہ تعالیٰ کافروں کا مددگار ہے؟

رہا یہ شبہ کہ اللہ میاں بھی کافروں کے مددگار ہیں جیسا کہ بعض گستاخوں نے کہا ہے۔

سنئے: نافرمانی وہ چیز ہے کہ بھنگی سے شہزادہ کے کوڑے لگوائے جاتے ہیں۔ تو کیا اس صورت میں بادشاہ بھنگی کا طرف دار ہے۔ اور کیا اس سے یہ لازم آ گیا کہ بھنگی مقبول ہے۔ بلکہ بات یوں ہے کہ شہزادہ اپنے مردود ہونے کی وجہ سے مغلوب ہے۔

ایک آیت شریف یاد آئی، سورۃ بنی اسرائیل میں ہے۔ اور یہ بنی اسرائیل کافر نہیں تھے۔ اہل کتاب تھے۔ انبیاء کے قائل تھے۔

وہ آیت یہ ہے۔

وَقَضَیْنَآ اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ فِی الْکِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ......

الی قولہ تعالیٰ وَکَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا (بنی اسرائیل)

آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں یہ بات بتلادی تھی کہ تم سرزمین میں دوبارہ فساد مچاؤ گے۔ جب اول مرتبہ شرارت کرو گے تو ہم تم پر اپنے ایسے بندوں کو مسلط کریں گے جو بڑے خونخوار (ظالم) ہونگے پھر وہ گھروں میں گھس پڑیں گے۔

اب اس میں دیکھنا چاہئے کہ ان لوگوں کو جو اہل کتاب ہیں مفسد اور حد سے گزرنے والا فرمایا ہے۔ اور دوسری بات ہے کہ جن کو عِبَادًا لَّنَآ فرمایا ہے یہ کون لوگ ہیں؟ یہ مشرک ہیں بت پرست ہیں ان کو اپنا بندہ فرمارہے ہیں اس حیثیت سے کہ ہمارے مملوک ہیں۔ اور ہمارا آلہ عذاب ہیں۔ نہ اس حیثیت سے کہ مقبول ہیں۔ بلکہ بات یہ ہے کہ تمہارے مردود ہونے کی وجہ سے ان کو تم پر مسلط کردیا ہے۔

دیکھئے اگر ٹوپی پر نجاست پڑجاتی ہے تو اسے اتار کر پھینک دیتے ہیں ایک منٹ سر پر نہیں رکھتے۔ اور جوتہ اگر نجاست میں بھر جائے تو اسے کوئی نہیں پھینکتا۔ اسی طرح کافر اور مسلم کی مثال ہے کہ مومن مثل ٹوپی کے ہے۔ کہ اس میں اگر ایک دھبہ بھی پڑجاتا ہے تو ناگوار ہوتا ہے اور کافر مثل جوتہ کے ہے کہ اگر پورا بھی نجاست سے بھر جائے تو ناگوار نہیں ہوتا۔ تو کیا اس سے یہ لازم آ گیا کہ جوتہ ٹوپی سے افضل ہے؟ (مزید المجید ص ۸۹)

(اس لئے) کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ہم تو گناہ کرنے والوں کو بڑے عیش (آرام) میں دیکھتے ہیں۔ کیونکہ یہ استدراج (ڈھیل) ہے اس کا اور بھی زیادہ خطرہ (اور سخت وبال) ہے۔ جیسے مکتب (سکول) میں کوئی لڑکا سبق نہ یاد کرتا ہو اور معلم ماسٹر ضد میں سزا نہیں دیتا کہ کل سبق نہ یاد ہوگا اس وقت اکٹھی سزا ہوگی۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ اہل یورپ (غیر مسلم کفار) تو بغیر دین کے آرام سے ہیں (اور برابر ترقی کررہے ہیں اور ہم کیوں بغیر دین کے ترقی نہیں کرسکتے)۔

اس کا جواب یہ ہے کہ.......... آپ اپنے کو ان پر قیاس نہیں کر سکتے۔ ان کافروں کو بغیر دین کے دنیا کی راحت حاصل ہو سکتی ہے مگر آپ کو بغیر دین کے دنیا کی راحت ہرگز نصیب نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ آپ اطاعت فرمانبرداری کے مدعی نہیں۔ اور وہ اطاعت کے مدعی ہیں۔ بلکہ کفر اختیار کر کے وہ خدا سے باغی ہو چکے ہیں۔ پس آپ کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جائے گا جو مدعی اطاعت (یعنی جو اطاعت کا دعویٰ کرتا ہو) اس کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ کہ بات بات پر گرفت ہوگی اور جہاں ذرا شریعت کے قانون سے باہر قدم رکھا فوراً سزا ہوگی۔

اور ان (غیر مسلموں) سے وہ برتاؤ کیا جا رہا ہے جو باغیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ باغی اگر دن میں سو دفعہ قانون کی مخالفت کرے تو اس سے تعرض نہیں کیا جاتا ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک تو بلقانی ریاستیں کے سلطان سے باغی ہو کر ان کے احکام کی مخالفت کرتی ہیں۔ اور ایک شخص سلطان کے کسی حکم کی مخالفت کرے تو بلقانی ریاستوں کی جزوی مخالفتوں پر نظر نہیں کی جاتی۔ بلکہ ان کی بغاوت کی سزا اکٹھی دی جائے گی۔ اور اس کا کچھ تذکرہ بھی نہ ہوگا۔ کہ بغاوت کے بعد انہوں نے اور کون کون سے کام خلاف قانون کئے تھے۔ کیونکہ بغاوت اتنا بڑا جرم ہے جس نے دوسرے جرائم کو نظر انداز کر دیا۔

اور ترکی ذرا سی قانونی مخالفت کرے تو فوراً سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے کو سلطنت کا مطیع کہتا ہے اس لئے اس کی ہر بات پر مواخذہ ہوتا ہے۔

اسی طرح یہاں سمجھئے کہ مسلمان کو تو ذرا ذرا سی مخالفت پر سزا ملتی ہے اور جہاں اس نے کوئی گناہ کیا فوراً اس کی دنیوی راحت سلب کر لی جاتی ہے گو ظاہری ساز و سامان جلدی سلب نہ کیا جائے مگر قلوب (دلوں کی راحت فوراً ختم ہو جاتی ہے جو کہ فلاح و کامیابی کی اصل حقیقت ہے کیونکہ وہ اطاعت کا مدعی ہے۔ اور کفار کے جزوی افعال پر نظر نہیں کی جاتی۔ بس ان کو تو بغاوت کی سزا اکٹھی دی جائے گی۔ جس کے لئے ایک میعاد معین ہے۔

شاید کوئی یہ کہے کہ اطاعت کے دعویٰ سے بغاوت ہی اچھی کہ روز کی گرفت سے تو بچے رہیں گے۔ تو سمجھ لیجئے کہ اطاعت کرنے والے کو تو ابھی سزا ہوگی مگر یہ سزا بھگتنے کے بعد پھر وہ ہمیشہ کے لئے راحت میں ہے۔ جیسے کوئی ترکی چوری یا زنا کرے تو اس کو اس وقت

کچھ دنوں کے واسطے قید کر دیا جاتا ہے۔ مگر قید کاٹنے کے بعد پھر سلطنت میں وہ کوئی عہدہ لے سکتا ہے اور اپنی زندگی آرام سے گزار سکتا ہے۔ مگر باغی کو چند روز یا چند سال کے لئے گو کچھ نہ کہا جائے لیکن جب پکڑا جائے گا تو اسکی سزا سولی سے ادھر نہ ہوگی۔

اسی طرح جو خدا تعالیٰ سے بغاوت کرے گا وہ چند روز دنیا میں گو راحت سے گزار لے۔ مگر جب اس کو پکڑا جائے گا تو ہمیشہ کے لئے عذاب جہنم سے ادھر اس کی سزا کچھ نہ ہوگی۔ اب اختیار ہے جس کو چاہو اختیار کر لو۔

غرض آسائش (آرام) کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو کوئی بالکل باغی ہو کر رہے تو بغاوت کی سزا کے وقت سے پہلے اس کو چین ہے اور یا بالکل مطیع فرمانبردار ہو کر رہے تو اس کو ہمیشہ کے لئے چین ہے۔ یہاں بھی اور آخرت میں بھی باقی مطیع و نافرمان دونوں بن کر دنیا کی راحت تو حاصل نہیں ہو سکتی ہاں آخر میں کچھ سزا بھگتنے کے بعد پھر راحت ہو جائے گی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ آسائش کا طریقہ جو کہ کامیابی کی اصل ہے وہ دین کی پابندی کے بغیر ممکن نہیں۔

اس مضمون کو میں نے اس لئے بیان کیا کہ آج کل سب لوگ فلاح کامیابی کے طالب ہیں جن میں زیادہ تر دنیا کی کامیابی کے طالب ہیں۔ تو میں نے بتلا دیا کہ دنیا بھی دین کے اتباع سے مل سکتی ہے۔ اس کے بغیر مسلمان کو تو کامیابی مل نہیں سکتی۔ اور اس وقت خطاب مسلمانوں ہی سے ہے۔

قدرت نے مسلمان اور غیر مسلم کی ترقی کا مدار الگ الگ مقرر کیا ہے

مسلمانو تم اپنی ترقی کے لئے یہ دیکھو کہ مسلمانوں کو اس سے پہلے کیسے اور کیوں کر ترقی ہوئی۔ اور یہ ہرگز نہ دیکھو کہ کفار کو ترقی کیوں (اور کیسے) ہوئی۔ کیونکہ ہر قوم کا باطنی مزاج الگ ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو طریقہ ایک قوم کو مفید ہو وہ سب کو مفید ہو۔ بلکہ یہ ضروری نہیں کہ جو صورت ایک قوم کے کسی فرد کو مفید ہو وہ سب افراد کو مفید ہو۔ جس کا مزاج لطیف

ہواس کو وہ چیزیں نفع نہیں دیتیں۔ جوایک گنوار کو نفع دیتی ہیں۔

مسلمانو! تم اسلام (لے آنے کے بعد) لطیف المزاج ہو گئے ہو تمہارا مزاج شاہانہ ہو گیا ہے تم کو وہ صورتیں مفید نہ ہوں گی جو کفار کو مفید ہیں۔ نیز تم ایسے ہو جیسے سر کی ٹوپی کہ جہاں اس میں ذرا سی ناپا کی لگی فوراً اتار کر پھینک دی جاتی ہے۔ اور جوتے میں اگر ناپا کی لگ جائے تو اس کو نہیں پھینکتے۔ اسی طرح حق تعالیٰ تم کو ناپا کی اور گندگی میں ملوث نہیں دیکھنا چاہتے اگر ملوث ہو گے تو فوراً کوٹے پیٹے جاؤ گے۔ اور کفار چاہے جتنا ملوث ہو جائیں گوارا کیا جائے گا۔ (شریعت وسیاست ص ۲۰)

وضاحتی مثال

اپنی ترقی کو کفار کی ترقی پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے (یعنی صحیح نہیں) اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔

ایک بھنگی عطر فروشوں کے بازار میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ وہ لوگ اپنی عادت کے موافق اس کو عطر سونگھانے لگے لیکن وہ ہوش میں نہیں آیا۔ اتفاقاً ایک دوسرے بھنگی کا ادھر گزر ہوا اس نے کتے کا پاخانہ سونگھایا اور وہ فوراً ہوش میں آ گیا اب اگر کوئی شخص اس بھنگی کے ہوش میں آنے کی اس تدبیر کو علی الاطلاق مفید سمجھ لے۔ (اور ہر شخص کے لئے اس کو کرنے لگے) اور عطر سونگھانے کے طریقہ کو غیر مفید سمجھ کر چھوڑ دے۔ اور پھر اسی بھنگی کے نسخہ کو کسی شریف آدمی نفیس المزاج اور لطیف الطبع پر استعمال کرے کہ اس کے بے ہوش ہونے پر اس کو کتے کا پاخانہ سونگھائے) تو نتیجہ یقیناً ناکامی کی شکل میں ظاہر ہوگا وہ ہوش میں تو کیا آئے گا اس کی بے ہوشی اور دماغی مرض بڑھ جائے گا۔ یہ تو عمدہ قسم کے بیش بہا عطریات کے سونگھانے سے ہوش میں آئے گا۔

بس ایسے ہی مسلمان کفار کے طریقوں سے ترقی کی راہ پر گامزن نہ ہو سکیں گے۔ مسلمانوں کی ترقی اور فلاح کا راز اعمال صالحہ اور احکام شرعیہ پر عمل کرنے میں مضمر ہے لہٰذا اس پر پابندی کیجئے اور رحمت خداوندی سے ثمرات ونتائج کے امید وار رہئے۔

غفلت کا وقت نہیں

یہ وقت مسلمانوں کی غفلت کا نہیں مگر مشکل تو یہ ہے کہ اگر مسلمان غفلت سے بیدار ہوتے بھی ہیں تو اس کے مصداق ہو جاتے ہیں۔

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

اس بیداری میں نہ احکام (شریعت) کا اتباع ہوتا ہے نہ آپس میں اتفاق ہوتا ہے۔
(ملفوظات ۲، ۲۱۲، ارشادات حکیم الامت ص ۵۰۸)

حکام کی برائی کرنے سے کوئی فائدہ نہیں

بعض لوگ مصیبتوں سے تنگ ہو کر حکام وقت کو برا بھلا کہتے ہیں۔ یہ بھی بے صبری کی علامت ہے۔ یہ پسندیدہ تدبیر نہیں۔ حدیث شریف میں اس کی ممانعت بھی آئی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لاتسبوا الملوک یعنی بادشاہوں کو برامت کہو۔ ان کے قلوب میرے قبضہ میں ہیں۔ میری اطاعت کرو میں ان کے دلوں کو تم پر نرم کر دوں گا۔

یاد رکھو جو مصیبت آتی ہے وہ اللہ کی جانب سے ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ یعنی کوئی مصیبت نہیں آتی مگر اللہ کے حکم سے اور جب مصیبت اللہ کی طرف سے ہے تو اس کا علاج یہی ہے کہ ادھر رجوع کرے۔ (یعنی اللہ سے توبہ و استغفار کرے) اور پھر جو پیش آئے (اسی میں) خیر سمجھے۔ الصبر ص ۳۶) (اصلاح المسلمین ص ۵۳۳)

اتباع شریعت کے بغیر ہم ترقی نہیں کر سکتے

حضرات آپ کو اس عقیدہ پر مضبوطی کے ساتھ جم جانا چاہئے۔ کہ مسلمان جب بھی ترقی کرے گا۔ احکام شرعیہ کی پابندی سے کرے گا۔ یہ خیال دل سے بالکل نکال دینا چاہئے کہ اتباع شریعت کے بغیر بھی مسلمان ترقی کر سکتے ہیں جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دیندار ہونے اور نماز روزہ کی پابندی کو ترقی میں کیا دخل ہے۔ بلکہ اس کے لئے صرف سیاسی تدبیریں کافی ہیں۔

مسلمانوں کا خدا کی ذات کے سوا کوئی حامی اور مددگار نہیں۔ اور ان کو کسی اور کی ضرورت بھی نہیں۔ میں سچ عرض کرتا ہوں کہ اگر مسلمانوں میں نظم ہو اور دین ہو تو تمام دنیا کی غیر مسلم قومیں اس ضعف (کمزوری) کی حالت میں بھی انکا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ لیکن مسلمان ویسے تو بہت گڑ بڑ کرتے ہیں مگر جو اصل تدبیر ہے اور کام کی تدبیر ہے۔ جس سے پہلے لوگوں کو کامیابی ہو چکی ہے وہ نہیں کرتے وہ تدبیر یہ ہے کہ اپنے خدا کو راضی کرنے کی فکر کریں۔

حضرات مسلمان کو خدا کی امداد کے سوا کسی کی امداد کی ضرورت نہیں اور امداد الٰہی کی شرط، احکام الٰہی کی پابندی ہے۔ جس کا سینکڑوں برس تک تجربہ کیا جا چکا ہے۔

اسلام کی قوت کا مدار لوگ شخصیتوں پر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اسلام کی قوت کا مدار حق پر ہے نہ کہ کسی مخلوق پر اسلام کی قوت خارج سے نہیں داخل سے ہے۔ حق میں وہ قوت ہے کہ اگر ایک شخص حق پر ہو اور سارا عالم اس کا مخالف ہو تو وہ کمزور نہیں۔ اور اگر یہ شخص حق پر نہیں سارا عالم اس کا معتقد ہو وہ شخص ضعیف ہے اس میں کچھ بھی قوت نہیں۔

مسلمانوں کی ترقی کی بنیاد

اگر تم ترقی کرنا چاہو تو دیکھو کہ پہلے مسلمانوں کو ترقی کیوں (اور کیسے) ہوئی تھی۔ چنانچہ جن لوگوں نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ترقی کا حال تاریخ میں دیکھا ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ ان حضرات کو محض دین کی اتباع کی وجہ سے ترقی ہوئی۔ وہ دین میں پختہ تھے۔ ان کے معاملات و معاشرت و اخلاق بالکل اسلامی تعلیم کے مطابق تھے۔ اس لئے دوسری قوموں کو خود بخود اسلام کی طرف کشش ہوتی تھی۔ اور جب مقابلہ کا وقت آیا۔ تو چونکہ انہوں نے خدا تعالیٰ کو راضی کر رکھا تھا۔ اس لئے خدا تعالیٰ ان کی مدد کرتا تھا یہی تو وجہ ہے کہ بے سروسامانی اور قلت تعداد کے باوجود بڑی بڑی سلطنتوں کو ان سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ (شریعت وسیاست ص ۲۱)

فتح وترقی کا مدار

فتح ونصرت کا مدار قلت وکثرت پر نہیں۔ وہ چیز ہی اور ہے۔ مسلمانوں کو صرف اسی ایک چیز

کا خیال رکھنا چاہئے۔ یعنی خدا تعالیٰ کی رضا کا۔ پھر کام میں لگ جانا چاہئے۔ اگر کامیاب ہوں شکر کریں۔ ناکام ہوں صبر کریں۔ اور مومن تو حقیقت میں ناکام ہوتا ہی نہیں۔ گو صورۃ (ظاہراً) ناکام ہو جائے۔ اس لئے کہ آخرت کا اجر تو ہر وقت حاصل ہے۔ جو ہر مسلمان کا مقصود ہے۔

حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ساٹھ ہزار کے مقابلے میں تیس آدمی تجویز کئے تھے۔ حضرت عبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ امت محمدیہ کو ہلاک کراؤ گے۔ تب ساٹھ آدمی تجویز کئے۔ یعنی ایک ہزار کے مقابلہ میں ایک آدمی۔ قلت و کثرت کی طرف ان حضرات کا خیال ہی نہ تھا۔ (شریعت وسیاست ص ۲٦)

مسلمانوں کی عزت کی کنجی

مسلمانو تم شریعت پر عمل کر کے دیکھو انشاء اللہ سب تمہاری عزت کریں گے۔ جس کی واضح دلیل یہ ہے کہ جو پکے مسلمان ہیں۔ انگریز ہندو یا پارسی وغیرہ۔ سب ان کی عزت کرتے ہیں۔ تم دین پر قائم رہو۔ ساری قومیں تمہارے تابع ہو جائیں گی۔ (شریعت وسیاست ص ۲۱)

اسلام کو اپنی طرف جذب کرنے یعنی راغب کرنے کے لئے غیر قوم کو بھائی بنانے کی ضرورت نہیں (اسلام کی تعلیم میں وہ حسن ہے کہ) وہ دشمن کو دشمن کہہ کر بھی اپنی طرف کھینچ سکتا ہے۔ کیونکہ اسلام نے دوسری قوموں کے حقوق کی بھی رعایت کی ہے۔ وہی حقوق اور وہی رعایت سب کے کھینچنے کے لئے کافی ہے۔ (کمالات اشرفیہ ص ۷٦)

پریشانیوں کی جڑ اور ہماری قوت کا سرچشمہ

تمام پریشانیوں کی جڑ خدا تعالیٰ سے صحیح تعلق نہ ہونا ہے اور یہ مسلمانوں کی انتہائی بدفہمی ہے کہ غیر قوموں کو (اپنا خیر خواہ ہمدرد سمجھتے ہیں) ان کی بغلوں میں جا کر گھستے ہیں اور ان کو اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین امنوا

حصر کے ساتھ فرماتے ہیں۔ کہ تمہارا کوئی دوست نہیں سوائے اللہ اور رسول اور مومنین کے۔ (الافاضات ص ۱۴۹/۳)

حضرات جنگ آئینی ہو یا غیر آئینی مسلمانوں کو خدا کے سوا کسی کی امداد کی ضرورت نہیں۔ امداد الٰہی کی شرط اللہ کے احکام کی پابندی ہے۔ جس کا سینکڑوں برس تک تجربہ کیا جا چکا ہے۔ جب تک مسلمان سچ مچ مذہبی دیوانے بنے رہے دنیا ان کی جوتیوں سے لگی رہی اور جیسے جیسے اس میں کمی آتی گئی مسلمان ترقی سے محروم ہوتے گئے۔

مسلمانو! یاد رکھو تمہاری فلاح بہبودی (کامیابی) صرف حق تعالیٰ کی اتباع اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں ہے۔

کیوں دربدری کی گداگری کرتے پھرتے ہو تمہارے گھر میں خزانہ مدفون ہے۔ تم کو خبر نہیں۔ تمہارے پاس ایک اتنی بڑی دولت ہے کہ تمام عالم کے غیر مسلم............ اس دولت کے گرد کو نہیں پہنچ سکتے۔ جس سے تم کو خداوند جل جلالہ نے نوازا ہے۔ وہ دولت ایمان کی دولت ہے۔ اس کی قدر کرو۔ اس کی قوت کے جو ذرائع اور نسخے ہیں ان کو اختیار کرو۔ اور وہ اعمال صالحہ ہیں۔ پھر دیکھو چند روز میں کیا سے کیا ہوتا ہے اور اعتقاد سے نہ سہی بطور امتحان ہی کے کر کے دیکھ لو۔

سالہا تو سنگ بودی دلخراش   آزموں را یک زمانے خاک پاش

سلطان صلاح الدین ایوبی کا حال

سلطان صلاح الدین نے جس وقت ملک شام کو فتح کیا ہے تو وزیروں نے عرض کیا کہ یہ نصرانیوں کا ملک ہے نیا فتح کیا ہوا ہے۔ اور اس ملک کے لوگ نہایت سرکش اور سخت ہیں۔ اور اسلامی سیاسیات (یعنی اسلامی قوانین) نرم ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ان پر قابو رکھنے کے لئے اسلامی احکام کے علاوہ اگر اور بھی کچھ قوانین اور قواعد نافذ کر دیئے جائیں۔ تو زیادہ مناسب ہے۔

اس پر سلطان صلاح الدین نے جو جواب دیا وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ فرماتے ہیں کہ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ میں نے جو ملک فتح کیا ہے وہ حکومت اور سلطنت کرنے کے لئے کیا ہے؟ میں نے تو محض اللہ کو خوش کرنے کے لئے یہ سب کوشش کی ہے۔ (میں تو) اسلامی احکام کو نافذ کروں گا۔ اس پر چاہے ملک رہے یا جائے۔ اسلامی احکام کے

خلاف ایک حکم کا بھی نفاذ نہ کروں گا۔

ان حضرات کی کامیابی کے یہ راز تھے۔ اور یہاں یہ حالت تھی کہ ابھی نہ کوئی ملک قبضہ میں ہے نہ آئندہ ملنے کے بظاہر کوئی اسباب نظر آتے ہیں۔ مگر شریعت مقدسہ کی قطع برید پہلے سے شروع کر دی۔ (الافاضات الیومیہ ص ۱۳۲ جلد ۱)

شوروغل ہنگامہ کی ممانعت

شریعت نے اس قدر ہم کو شوروغل (ہنگامہ) کی اجازت نہیں دی بلکہ حکم یہ ہے کہ:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا

ترجمہ: اے ایمان والو تکلیف پر خود صبر کرو اور کفار سے مقابلہ ہو تو مقابلہ میں صبر کرو مقابلہ کے لئے ہر حال میں تیار رہو۔ (بیان القرآن)

اور صبر کہتے ہیں استقلال کو۔ تو ایسا نہ کرنا چاہئے جیسا کہ آج کل لوگ ہر ہر واقعہ سے بے استقلالی (بے صبری) ظاہر کرنے لگتے ہیں مثلاً زیادہ شوروغل کرنا زیادہ پریشانی ظاہر کرنا جس سے معلوم ہو کہ ان کو بہت رنج ہے۔

نیز شوروغل خلاف احتیاط بھی ہے۔ بعض اوقات اس سے حکام کو غلط شبہات ہو جاتے ہیں تو کوئی بات خلاف احتیاط مت کرو۔

الغرض شریعت نے صبر کا حکم دیا ہے۔ تو یہ تمام جوش وخروش خلاف شرع ہے (اس سے بسا اوقات سخت نقصان ہو جاتا ہے۔ قاعدہ کے مطابق تدبیر کے ساتھ کارروائی کرنا چاہئے۔

جہاں تک میں اندازہ کرتا ہوں یہ شورش اکثر بے دینوں میں ہوتی ہے۔ جن کو دین کا علم بہت کم ہے۔ دینداروں میں امن وسکون ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نئی روشنی والے اس شورش کے اندر بھی یورپ کی تقلید کرتے ہیں۔ یہ طریقہ یورپ ہی کا ہے کہ جو کام کرتے ہیں۔ بڑھا چڑھا کر لوگوں کو دکھلا کر کرتے ہیں۔

اسی طرح اخبار نویسوں نے بھی بہت زیادہ لوگوں کو پریشان کر دیا ہے۔ ایسے ایسے مضامین لکھتے ہیں جس سے خوانخواہ دیکھنے والے کو جوش آئے۔ کیونکہ ان لوگوں کو تجارت

مقصود ہے۔ ایسے مضامین سے ان کے اخبار کی اشاعت خوب ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ اہل دنیا ہیں۔ اہل دین کا طریقہ تو رضا بر قضاء ہے وہ کتاب وسنت کو دیکھتے ہیں ان کو کوئی تجارت مقصود نہیں جو خواہ مخواہ جوش خروش ظاہر کریں۔ یہ سب باتیں صبر وقناعت کے خلاف ہیں۔

جوش خروش ہنگامے کی ممانعت

امن وسلامتی کی ضرورت

شرعی اجازت سے (حالات کے موافق) تدبیر کرنا جائز ہے۔ (لیکن) اپنی رائے سے تدبیر کرنا بھی شریعت کے خلاف ہے۔ آج کل بعض نوجوانوں کے اندر (جوش خروش) ولولے ہیں۔ بعض ناگوار واقعات کی تدبیر اس کو سمجھتے ہیں۔ کہ کوئی شورش (ہنگامہ) ہو، گڑ بڑ ہو۔ خدانخواستہ اگر کوئی شورش ہوگی بھی گو سب سے پہلے ہٹنے والے بھی یہی لوگ ہوں گے۔

صاحبو! امن وعافیت کو غنیمت سمجھو۔ اور امن وعافیت ہی اللہ سے مانگو۔ ہاں اگر کوئی واقعہ یا کوئی مصیبت خود بخود پیش آجائے تو اس میں صبر واستقلال سے کام لو۔ یہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہی تھی کہ خود کسی حادثہ کی تمنا نہ فرماتے تھے۔ اور اگر کوئی واقعہ ہوتا تھا تو تدبیر سے کام لیتے تھے۔ بیماری ہوتی تھی۔ دوا فرماتے تھے۔ لڑائی کا موقع ہوتا تھا جو اس (وقت کے لحاظ سے) مناسب تدبیریں تھیں وہ کرتے تھے۔ (الصبر ص ۳۶۔ اصلاح المسلمین ص ۵۲۲)

امن وامان سلامتی قائم ہونے کا طریقہ

شرعی احکام پر عمل کرنا اور جن باتوں سے شریعت نے منع کیا ہے ان سے بچنا یہ جڑ ہے، امن وسلامتی کی۔ اور یہی فساد کو دفع کرنے والی ہے قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ احکام الٰہیہ کی پابندی کرو نواہی یعنی (ناجائز کاموں) سے بچتے رہو۔ پس یہی اصلاح کی صورت ہے۔ زمین میں امن اسی سے قائم ہو سکتا ہے۔ اس کے خلاف جو صورتیں ہیں وہ فساد کی صورتیں ہیں۔

مگر افسوس لوگ خدا کی تعلیم کو چھوڑ کر اپنی طرف سے امن کی نئی صورتیں گڑھ رہے ہیں۔ (التعرف بالتصرف ص ۳۸۔ اصلاح المسلمین ص ۵۲۱)

اتباع شریعت کی ضرورت

شریعت میں انسان کی ہر حالت کے متعلق احکام ہیں اور حالات دو قسم کے ہیں۔ ایک نعمت وخوشی کی حالت دوسرے مصیبت اور رنج کی حالت ہے۔

مصیبت کے احکام بہت کم لوگ جانتے ہیں مصیبت کا ایک حکم یہ ہے کہ مصیبت کی وجہ سے دوسرے احکام شرعی میں کوتاہی نہ کرے اور ان کو ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ دیکھو سب ہی کو معلوم ہے کہ عزیز کا مرجانا کتنی بڑی مصیبت ہے مگر حکم یہ ہے کہ صرف آنسو بہا سکتے ہو چلانا اور شور مچانا حرام ہے۔

اس سے معلوم ہوا شرعی احکام کا لحاظ رکھنا بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی واجب ہے۔ (حقوق السراء والضراء ص ۱۹۹۔ التبلیغ ج ۸)

ظلم وزیادتی اور حد سے تجاوز کرنے کی ممانعت

تم پر لازم ہے کہ خود ظلم نہ کرو آج کل مشکل تو یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ ہوتا ہے لوگ حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ عورتوں اور بچوں پر بھی زیادتی کرنے لگتے ہیں۔ (بے قصور لوگوں کو مارنے لگتے ہیں) بھلا عورتوں اور بچوں نے کیا قصور کیا ہے۔ پھر اس غلطی کی وجہ سے معاملہ ہم پر ہی الٹ جاتا ہے اور قہر (یعنی اللہ کے عذاب) کی سی صورت بن جاتی ہے۔

تشویشناک حالات میں جھوٹ اور مبالغہ اور حدود شرع سے تجاوز بہت ہوتا ہے جس سے دین برباد ہو جاتا ہے۔

یاد رکھو مصیبتوں میں حدود شرع سے تجاوز کرنا اعلیٰ درجہ کی بے صبری ہے۔ صابر وہی ہے جو ایسے مواقع میں شریعت پر جما رہے۔ اور کوئی کام حق تعالیٰ کی مرضی کے خلاف نہ کرے۔ ایسے ہی صبر کرنے والوں کے لئے بشارت ہے اور ان ہی لوگوں کی فضیلت قرآن وحدیث میں بیان کی گئی ہے۔

(حدود شرع میں رہتے ہوئے) بالفرض اگر کبھی ناکامی بھی ہو تو اتباع شریعت کی برکت سے معاملہ الٹا نہیں ہوتا کہ قہر (عذاب) کی سی صورت ہو جائے۔

(لیکن) لوگ (ایسے حالات میں) شریعت سے بہت تجاوز کرتے ہیں کفر و معاصی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ افسوس وہ اسلامی کام ہی کہاں ہوا جس میں خدا تعالیٰ کو ناراض کیا جائے۔(حقیقت الصبر ص ۱۳۶،۱۴۳)

دین کی پابندی

اصل چیز یہ ہے کہ مسلمانوں میں دین پیدا ہو۔ کس طرح دل میں ڈال دوں جی چاہتا ہے کہ سب اس طرح راہ پر آ جائیں کہ ان کی ہر ادا سے اسلام کی شان ظاہر ہو۔ جیسے صحابہ کرام کو لوگ دیکھ کر اسلام قبول کرتے تھے۔ یہ ان کا نمونہ بن جائیں دین و دنیا کی بہبود (کامیابی) اسی میں پوشیدہ ہے۔

یہ ایک واقعی حقیقت ہے کہ اگر مسلمان اپنی اصلاح کرلیں اور دین ان میں راسخ ہوجائے۔ تو دین تو وہ ہے ہی لیکن دنیوی مصائب کا جو کچھ آج کل ان پر ہجوم ہے انشاء اللہ تعالیٰ چندروز میں کایا پلٹ ہوجائے گی۔ (الافاضات الیومیہ ص ۵۵)

ایمان واعمال کی طاقت اللہ کا وعدہ

مسلمانوں کی کوتاہی

آج کل مسلمانوں کو اس ارشاد الٰہی پر نظر نہیں۔

وعداللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض الایة

ترجمہ:۔تم میں جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں۔ ان سے اللہ وعدہ فرماتا ہے۔ کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا۔ جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی۔ اور جس دین کو ان کے لئے پسند کیا ہے اس کو ان کے لئے قوت دے گا۔ (اور ان کو) جو دشمنوں سے طبعی خوف ہے ان کے اس خوف کے بعد اس کو امن سے بدل دے گا۔ بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں اور میرے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کریں۔ (بیان القرآن ص ۳۰/۸)

مسلمان یہ سمجھتے ہی نہیں کہ ان کاموں کو بھی ترقی میں کچھ دخل ہے حالانکہ اس آیت

میں استخلاف فی الارض اور تمکین (یعنی خلافت اور غلبہ دینے) کا صاف صاف وعدہ کیا ہے۔ مگر مسلمانوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ نماز روزہ اور ایمان میں بھی کچھ قوت ہے اور اس سے بھی ترقی ہوتی ہے۔ (بلکہ بہت سے مسلمان اس کو) بیکار ہی سمجھتے ہیں۔ مگر ایسے لوگوں کو تو مسلمان بھی نہ کہنا چاہئے۔ یہ کیسے مسلمان جو نماز روزہ کو بیکار سمجھیں، مگر ایسے تو دو چار ہی نکلیں گے۔ زیادہ تر ایسے لوگ ہیں جو اس خزانہ کی قیمت اور اس کی طاقت سے بے خبر ہیں۔ اسی لئے ان اعمال کی بے قدری کرتے ہیں۔ کوئی مسلمان کے حالات کا جائزہ لے تو ان میں ہزاروں ایسے نکلیں گے جن کو کلمہ بھی نہیں آتا۔ اور لاکھوں ایسے ملیں گے جو نماز کو جانتے بھی نہیں کہ کس چیز کا نام ہے۔ اور بہت سے ایسے ملیں گے جو کبھی سال میں ایک دو دفعہ پڑھ لیتے ہیں کبھی جی چاہا جمعہ کو بھی مسجد میں آجاتے ہیں۔ اور جو تھوڑے سے اللہ کے بندے پانچوں وقت کی نمازوں کے پابند ہیں۔ ان میں بھی قاعدہ کے ساتھ صحیح طور پر ادا کرنے والے بہت کم ہیں۔ کسی کا سجدہ، کسی کا قومہ، کسی کا جلسہ، مفقود ہے (یعنی صحیح نہیں) ایک گڑ بڑ کر رکھی ہے۔ تو اب آخر یہ کیا ہے؟ بے قدری ہے یا نہیں۔ اور بخدا یہ بے قدری اسی واسطے ہے۔ کہ نماز کو صرف ثواب کا کام سمجھ رکھا ہے۔ اس کے دنیوی منافع کی ان کو خبر نہیں۔ بلکہ بعض جاہل تو نماز روزہ کو دنیاوی ترقی کے لئے رکاوٹ سمجھتے ہیں اور اگر ان کو حقیقت معلوم ہو جاتی اور یہ خبر (یقین کامل کے درجہ) میں ہو جاتی کہ ان اعمال کو ترقی اور تمکن یعنی قدرت و غلبہ میں دخل ہے۔ تو پھر دیکھئے مسلمان کس شوق سے ان اعمال کو بجا لاتے۔ گو اس نیت سے عمل کرنا اچھا نہیں۔ خلوص کے خلاف ہے۔ طاعات (عبادات) سے دنیاوی ثمرات کا قصد نہ ہونا چاہئے وہ تو تابع ہیں۔ خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں۔

الغرض ترقی کے اسباب تو آپ کے گھر میں موجود ہیں۔ الصبر ۃ بذبح البقرۃ ص ۵۰)

صحابہ کی کامیابی کا راز

صحابہ کرام جن کی مقبولیت اور فراست، عقل تمام دنیا کو تسلیم ہے اور بڑے بڑے عقلاء اس پر متفق ہیں۔ انہوں نے بھی ساری عمر یہ کام کئے۔ مگر اصول اور حدود کو ہاتھ سے

نہیں چھوڑا۔ یہی راز ہے ان کی کامیابی کا۔

یہ تو ہر شخص کی زبان پر ہے کہ ان کو کامیابیاں ہوئیں ان کی نصرت ہوئی۔ وہ تمام عالم پر بے سروسامانی کی حالت میں غالب آئے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی تو دیکھنا چاہئے کہ ان کا طریقہ کار کیا تھا۔ ان کا اس جدو جہد سے کیا مقصود تھا ان کی نیت کیا تھی۔ ان کے اعمال کیسے تھے، وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کیا برتاؤ کرتے تھے، وہ اسلامی احکام پر کس درجہ عمل کرنے والے تھے۔ ان کے دلوں میں اسلام اور احکام اسلام کی کس قدر عظمت و محبت تھی؟ ثمرات (نتائج) پر نظر ہے۔ ثمرات کے اسباب پر بھی تو نظر ہونا چاہئے۔ اور اس پر اپنی حالت کو منطبق کرنا چاہئے۔ کھوٹے کھرے کا فرق بسہولت معلوم ہو جائے گا۔ اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ہم ان کامیابیوں اور نصرتوں کے مستحق ہیں یا نہیں۔ (الافاضات الیومیہ ص ۱۲۵/۱)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سبق آموز مکتوب گرامی

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مصر و اسکندریہ کی فتح کے لئے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امیر لشکر بنا کر بھیجا تو جس طرف یہ خدائی لشکر رخ کرتا فتح و نصرت ان کے قدموں پر گرتی تھی۔ مگر اسکندریہ کی فتح میں معمول سے کچھ زیادہ دیر ہو گئی۔ یعنی تین مہینہ تک مسلمانوں کو اس کا محاصرہ کرنا پڑا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ تاخیر بار خاطر ہوئی، اور آپ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا۔

''حمد و صلوٰۃ کے بعد معلوم ہوا کہ مجھے حیرت ہے کہ آپ کو فتح اسکندریہ میں اتنی دیر کیوں ہو گئی۔ آپ تو ہمیشہ سے جہاد میں رہتے ہیں۔ اور ہر کام میں تجربہ کار ہیں۔ پھر اس تاخیر کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمہاری نیت میں تغیر آ گیا ہے اور تم دنیا سے اسی طرح محبت کرنے لگے۔ جیسے تمہارے مخالف اس میں مبتلا ہیں۔ حق تعالیٰ خلوص نیت کے بغیر فتح نہیں دیتا پس جس وقت میرا یہ خط پہنچے۔ فوراً لوگوں کو جمع کر کے جہاد کی ترغیب دیجئے اور مسلمانوں کو سمجھا دیجئے کہ ہر مسلمان اپنی ہر حرکت و سکون میں رب العالمین کی خوشنودی اور کلمہ حق کی تبلیغ کا ارادہ کرے۔''

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس یہ والا نامہ پہنچا تو آپ نے لشکر کو جمع کر کے خلیفۃ المسلمین کا خط پڑھ کر سنایا۔ اور سب کو حکم دیا کہ غسل وطہارت کے بعد دو رکعتیں پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے فتح ونصرت کی دعا کریں سارے لشکر نے اس حکم کی تعمیل کی اور نماز ودعاء کے بعد اللہ تعالیٰ کی امداد کے بھروسہ پر ایک ہلہ کیا۔ تو میدان ان کے ہاتھ تھا۔ اور دشمن کی وہ زبردست طاقت جس نے تین مہینہ کی مدافعت سے شہر کا داخلہ ناممکن کر دیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ایسی حالت ہوئی کہ اس کا کوئی نام ونشان باقی نہ تھا۔

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے۔ جس کو عام مورخین نے لکھا ہے۔ اس میں ہمارے لئے درس عبرت ہے کہ مسلمانوں کی ناکامی کا سبب حب دنیا اور قلت تعلق مع اللہ (یعنی دنیا کی محبت اور اللہ سے بے تعلقی) کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

پس ضروری ہے کہ مسلمان ہر حکم الٰہی کی پابندی کو اپنے ذمہ لازم اور دوسروں کو نرمی سے سمجھانا اور بتلانا اپنا فرض منصبی سمجھیں۔ خدا کی نافرمانی اور گناہوں کو چھوڑو۔ اپنی صورتیں ایسی بنالو کہ دور سے دیکھنے والا پہچان لے کہ یہ مسلمان ہیں۔ اور اپنے اخلاق اسلامی اخلاق بنالو کہ ہر مخالف کے نزدیک بھی آپ کی اخلاقی شان ممتاز ہو۔ آج سے خدا کے فرمانبردار بن جاؤ۔ پھر دیکھو غیبی تائید کیسے تمہارا ساتھ دیتی ہے۔ اور دوسری قوموں پر تمہارے رعب کا سکہ بیٹھتا ہے۔

اصلاح المسلمین ارشادات حکیم الامت ص ۵۳۱ الافاضات الیومیہ ص ۳۵۰

باطنی قوت باطنی طاقت

جو لوگ صرف ظاہری ساز وسامان پر نظر رکھتے ہیں اور کامیابی کا راز اسی میں پوشیدہ جانتے ہیں ان کو غور کرنا چاہئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس کون سا لاؤ لشکر اور ساز وسامان تھا۔ اور فرعون جیسے متکبر وعظیم الشان بادشاہ کے پاس کس چیز کی کمی تھی۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کارساز حقیقی رب العالمین پر توکل کر کے اس کے ارشاد کے ماتحت فرعون سے مقابلہ کرنے جاتے ہیں اور اپنے ساتھ صرف اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو لیتے ہیں اور ان کو بھی اس خیال سے لیتے ہیں کہ وہ فصیح البیان ہیں اچھی شستہ تقریر

کریں گے اور میری تائید وتصدیق کریں گے کیونکہ تائید سے دل بڑھتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول نقل فرمایا۔

فارسله معی الایه

غرض حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے مقابلہ کے لئے تنہا تیار ہو گئے۔ صرف تائید کے لئے حضرت ہارون علیہ السلام کو ساتھ لے کر اس کے بھرے اور پر شوکت دربار میں پہنچ گئے۔ اور خوب کڑک کر بلا جھجکے گفتگو فرمائی۔ فرعون کی ہمت نہیں ہوئی کہ ان کو قتل کرادے۔ یا گرفتار کرادے۔ یا اور کوئی مقدمہ قائم کرادے۔ صرف زبانی گفتگو میں اتنا ضرور کہا **انی لاظنک یموسی مسحوراً**" یعنی اے موسیٰ میرے خیال میں تو ضرور تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ترکی بہ ترکی جواب دیا **وانی لا ظنک یفرعون مثبوراً** یعنی اے فرعون میرے خیال میں ضرور تیری کم بختی کے دن آ گئے ہیں۔ مگر اس کے باوجود بھی فرعون کو قتل وغیرہ کی ہمت نہ ہوئی۔ اور کیسے ہوتے اللہ کا وعدہ تھا **و نجعل لکما سلطاناً الایۃ** یعنی ہم دونوں کو خاص شوکت عطا کرتے ہیں جس سے تم پر ان لوگوں کو دسترس نہ ہوگی۔ تم دونوں اور تمہارے پیروکار ہی غالب ہوں گے۔

اب غور کیجئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام میں یہ قوت وشجاعت یہ ہمت و جرأت یہ سطوت وشوکت کس مادی سامان کی وجہ سے تھی۔ ان کے پاس توپ و بندوق نہ تھی، ہوائی جہاز اور تباہ کن گیس ٹینک نہ تھے۔ یہ قوت صرف حقانیت اور تعلق مع اللہ کی تھی۔ یہ تقویٰ اور احکام خداوندی کی اطاعت کا ثمرہ تھا۔ (اسعد الابرار ملفوظات حضرت تھانوی ص ۳۶۸)

خدائی فوج کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی نصرت

اللہ تعالیٰ کی ایک فوج ہے یعنی فرشتے جن کو نہ گھوڑوں کی حاجت ہوتی ہے نہ اسلحہ کی ضرورت، نہ رسد کی محتاج ہوتی ہے نہ کمک کی منتظر اللہ تعالیٰ جب چاہتے ہیں اس کامیاب فوج کے ذریعے مسلمانوں کی نصرت فرما کر ظفرمندی (وکامیابی) کا تاج ان کے سر پر رکھ دیتے ہیں۔ اور اس فوج کے ذریعہ سے نصرت اب بھی (آج کے دور میں بھی) ہوتی ہے اور بہت مرتبہ اس کا ظہور ہوا ہے۔

ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا کہ لاکھ سے زیادہ تعداد میں ہندوؤں نے ضلع اعظم گڑھ میں

مٹھی بھر مسلمانوں پر حملہ کر دیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اس ناگہانی معرکہ میں مسلمانوں کو خاطر خواہ کامیابی عطا فرمائی تھی۔ بعض لوگوں نے بیان کیا کہ مقابلہ کے وقت جہاں تک نظر جاتی تھی سبز پوش مسلمان ہی نظر آتے تھے یہ سبز پوش لوگ غالباً فرشتے تھے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے فرشتوں کی جماعت کو اپنے خاص بندوں کی حفاظت کے لئے بھیجا اور ان کو صرف کفار پر ظاہر کر دیا۔ مسلمانوں سے پوشیدہ رکھا تاکہ وہ پوری ہمت سے جدوجہد کو جاری رکھیں اور ان کی شان توکل میں کمی نہ آنے پائے۔ اور پھر آخرت میں بڑا اجر حاصل کریں۔

مدد کے لئے فرشتوں کے نازل ہونے کا مدار تقویٰ پر ہے، چنانچہ ارشاد ہے۔

ان تصبروا وتتقوا ویاتوکم من فورهم هذا یمددکم ربکم بخمسة الاف من الملئکة مسومین.

"یعنی اے مسلمانو اگر تم کفار کے مقابلہ میں استقلال سے کام لوگے اور متقی بنے رہو گے اور وہ تم پر اک دم ٹوٹ پڑیں تو تمہارا پروردگار تمہاری امداد پانچ ہزار خاص وضع کے فرشتوں سے فرمائے گا۔ (اسعد الابرار ملفوظات حضرت تھانویؒ ملحقہ "سفرنامہ لاہور مطبوعہ لاہور ص ۳۶۶)

تقویٰ کی ضرورت

۱:۔ تقویٰ سے اللہ تعالیٰ کا فضل شامل ہو جاتا ہے۔ اور سب مادی وطاغوتی طاقتیں حق تعالیٰ کے سامنے پاش پاش ہو جاتی ہیں۔ تقویٰ کی وجہ سے ہر قسم کی کامیابی بندہ کو نصیب ہوتی ہے۔ قوت کی اصل روح تعلق مع اللہ ہی ہے۔

دیکھئے اگر ضلع کا کلکٹر کسی کا حامی و مددگار ہو تو وہ کس قدر بے خوف اور جری ہو جاتا ہے۔ اور کمشنر سے بھی تعلق ہو تو قوت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ بادشاہ کے تعلقات کو اسی پر قیاس کر لیجئے۔ اور جس کا تعلق رب العالمین، احکم الحاکمین بادشاہوں کے بادشاہ سے ہو اس کی طاقت کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔

۲:۔ مسلمانوں کی ترقی اور کامیابی کا راز اعمال صالحہ اور احکام شرعیہ پر عمل کرنے میں ہے۔ لہٰذا اس پر پابندی کیجئے اور رحمت خداوندی سے ثمرات ونتائج کے امیدوار رہئے۔

یقین کیجئے کہ مسلمانوں کی ترقی اور کامیابی رضائے الٰہی کے ساتھ وابستہ ہے بغیر رضاء الٰہی کے ہر قسم کی ترقی تنزلی ہے۔ اور رضاء الٰہی کا حاصل ہونا اسلامی احکام کی پابندی ہی پر موقوف ہے۔

اب صرف یہ بات رہ گئی کہ تقویٰ اور تعلق مع اللہ کیسے حاصل ہو۔تو سنئے تعلق مع اللہ اللہ تعالیٰ کے ظاہری و باطنی احکام پر اخلاص کے ساتھ عمل کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

ہر شخص کو چاہئے حتی الامکان احکام شرعیہ کی ظاہراً و باطناً پابندی کرے خدائے عزوجل کے سامنے گریہ وزاری کرے، گڑگڑائے اس طرز عمل سے انشاءاللہ تعالیٰ بہت جلد مسلمانوں کی حالت درست ہونے لگے گی اور مطلوب ترقی تک پہنچنا دشوار نہ رہے گا۔ (اسعد الابرار ص ۳۵۹)

ناقابل انکار حقیقت

آج کل لوگوں میں مادہ پرستی کا غلبہ ہے۔ مادی ترقی ہی کو ترقی سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ مادی وسائل پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ اوران پر ناز کیا جاتا ہے لڑائی میں بھی مادی ہتھیار اور سامان جنگ کو نصرت و کامیابی کا سبب خیال کیا جاتا ہے۔ مالک حقیقی رب العالمین پر نظر نہیں کی جاتی۔

دیکھئے ابتدائے اسلام میں جتنے جہاد ہوئے ان میں عموماً کفار کے پاس ہر قسم کے ہتھیار کافی تعداد میں موجود تھے اور مسلمان ان کے لحاظ سے بالکل بے سروسامان اور خالی ہاتھ کہے جانے کے مستحق تھے۔ غزوہ بدر میں اسلامی لشکر کے پاس صرف آٹھ تلواریں تھیں گو نیزے وغیرہ اتنے کم نہ تھے۔ اور جنگ دست بدست ہوئی جس میں تلوار زیادہ کارآمد ہوتی ہے اس پر طرہ یہ کہ کفار تعداد میں مسلمانوں سے تین گنا تھے اور سب کے سب ہتھیار بند تھے۔ اور اس کے باوجود مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے کامیاب فرمایا کامیابی و فتح مندی نے ان کے قدم چومے۔

بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سب غزوات میں کامیاب تر غزوہ بدر ہی کا ہے کیونکہ اس سے کفار کے حوصلے ہمیشہ کے لئے پست ہو گئے تھے اوران کی سطوت وشوکت (غلبہ) ٹوٹ گیا تھا۔

تو اب غور کیجئے کہ یہ نصرت مادی ترقی کا نتیجہ تھی یا ایمان واخلاص کی برکت تھی۔

(اسعد الابرار سفرنامہ لاہور مطبوعہ لاہور ص ۳۶۵)

مسلمانوں کے مغلوب ہونے کی اصل وجہ

ایک مرتبہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب (نوراللہ مرقدہٗ) نے فرمایا کہ ترمذی میں یہ حدیث لن یغلب اثنا عشر الفاً عن قلتہ "یعنی بارہ ہزار مسلمانوں کا لشکر قلت تعداد

(یعنی اقلیت) کی وجہ سے کبھی دشمنوں کے مقابلہ میں مغلوب نہ ہوگا'' اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ یہ بات یقینی طور سے ثابت ہے کہ بارہ ہزار کیا، بارہ ہزار سے کہیں زائد تعداد کے لشکر اپنے دشمنوں سے شکست کھا گئے (اور آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ بارہ ہزار سے کہیں زائد مسلمانوں کا لشکر اپنے دشمنوں سے مغلوب ہے پھر اس حدیث کا کیا مطلب ہے؟)

حضرت مولانا کی برکت سے میرے ذہن میں جواب آ گیا۔

میں نے عرض کیا کہ حدیث شریف کا مضمون بالکل بے غبار ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عن قلة فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ قلت (یعنی تعداد کی کمی) کی وجہ سے مغلوب نہ ہوگا "عن علته" نہیں فرمایا کہ کسی اور سبب سے بھی مغلوب نہ ہوگا۔ لہٰذا جہاں بارہ ہزار یا بارہ ہزار سے زائد لشکر شکست کھا گئے اس کی وجہ قلت (تعداد کی کمی) نہیں بلکہ کوئی دوسری علت ہوگی۔ چنانچہ اس کی تائید کتب حدیث وتاریخ سے بھی ہوتی ہے بلکہ قرآن شریف میں بھی غزوہ حنین میں اولاً مغلوب ہونا صراحۃً مذکور ہے حالانکہ غزوہ حنین میں مسلمان بارہ ہزار تھے لیکن پھر بھی پہلے مغلوب ہو گئے اور اس کی وجہ قلت نہیں تھی بلکہ ایک قلبی مرض یعنی خود پسندی وعجب تھا جس کا ذکر قرآن شریف میں ہے۔

ولقد نصر کم اللہ فی مواطن کثیرۃ ویوم حنین اذا عجبتکم کثرتکم

''یعنی حق تعالیٰ نے بہت سے مقامات پر تمہاری مدد فرمائی، اور غزوہ حنین میں بھی جب تم اپنی کثرت پر نازاں تھے۔''

حاصل یہ کہ مسلمانوں میں غزوہ حنین میں عجب وغرور پیدا ہو گیا تھا کہ ہم اتنے زائد ہیں اسی عجب کی وجہ سے شکست ہوئی اور جب اس گناہ سے توبہ کر لی اور معافی مانگ لی تو اسی میدان میں یہ ہزیمت خوردہ (شکست کھایا ہوا) لشکر غالب آ گیا جس کا ذکر اس آیہ کریمہ میں ہے۔

ثم انزل اللہ سکینته

اُصول وحُدودا عظم ضبط کے ساتھ کام کرنیکی ضرورت

ہر کام اصول سے ہوسکتا ہے، بے اصول تو گھر کا انتظام بھی نہیں ہوسکتا ملک کا کیا انتظام ہوگا۔ ہماری ہمسایہ قوم کس ہوشیاری اور چالاکی سے کام کر رہی ہے۔ یہ ساری بے اصولیاں اور بدانتظامیاں مسلمانوں ہی کے حصہ میں آ گئی ہیں جس طرف کو ایک چلا اسی

طرف کو سب چل دیئے۔

آج سے پہلے بھی تو اسلام اور مسلمانوں پر اس سے بڑے بڑے حوادث پیش آئے ہیں۔اس وقت اس کا عشر عشیر (دسواں حصہ) بھی نہیں۔مگر انہوں نے اس حالت میں بھی اسلام اور احکام اسلام کو نہیں چھوڑا۔

سلف کے کارناموں کو پیش نظر رکھ کر کچھ تو غیرت آنا چاہئے کہ تم تو معمولی معمولی باتوں میں احکام اسلام ترک کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہو۔ وہ حضرات عین قتال کے وقت میں بھی حدود کی حفاظت اور رعایت فرماتے تھے جس پر آج ہم کو فخر ہے۔

یہاں تک نوبت آگئی ہے کہ زبانوں پر یہ آتا ہے یہ مسائل کا وقت نہیں کام کا وقت ہے کام کرنا چاہئے۔ میں کہتا ہوں اگر دین نہ رہا اور احکام اسلام کو پامال کرنے کے بعد کوئی کام بھی کیا تو وہ کام پھر دین کا نہ ہوگا۔کیا یہ دین کی خیر خواہی اور ہمدری کی جاسکتی ہے؟

خلاصہ یہ کہ اصول کے تحت کام کرو۔ جوش سے کام مت لو ہوش سے کام لو جوش کا انجام خراب نکلے گا۔جوش سے اول تو کام نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو اس کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔

حدود شرعیہ کی حفاظت رکھو۔ احکام اسلام سے تجاوز نہ ہو اصل چیز حدود کی رعایت ہے پھر اس میں اگر کامیابی نہ ہو تو صبر کریں۔ (الافاضات الیومیہ ص ۹۹،۱۲۱،۱۲۲،۱۳۰)

افسوس کا مقام

افسوس مسلمان مصیبت کے وقت سیاست میں دوسری قوموں کی دست نگری کرتے ہیں۔ حالانکہ سیاست میں بھی شریعت کے مکمل احکام ان کے پاس موجود ہیں۔اور اسلامی سیاست تو وہ چیز ہے جس سے دنیا بھر کے سیاست داں سبق لیتے ہیں۔مگر مسلمان ہیں کہ دوسروں کے محتاج ہیں۔

آج کل مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ اپنے گھر کے جواہرات سے بے خبر ہیں اور دوسروں کی کوڑیوں کے محتاج ہیں۔

مسلمانوں نے بڑی غلطی کی۔ کہ ان (حالات) میں شریعت کی تعلیم کو بالکل چھوڑ دیا۔

واللہ! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم شریعت کو اختیار کرلو۔تشویش (پریشانی) تمہارے پاس بھی نہ ہوگی۔ گو تشویشناک کیسے ہی واقعات پیش آئیں۔ کیونکہ متبع شریعت کا حال یہ ہوتا

ہے کہ...... اس کی نظر ہر واقعہ اور ہر حالت میں حق تعالیٰ پر ہوتی ہے۔ اس کے سوا کسی پر نظر نہیں ہوتی۔ وہ جانتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے محبوب کی طرف سے ہو رہا ہے۔ پھر تشویش کیسی؟

بس اس کو تو یہ فکر ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ راضی رہیں۔ پھر دنیا میں جو چاہے ہوتا رہے۔ چاند سورج بھی نکلیں یا نہ نکلیں اسے اس کی پرواہ نہیں ہوتی۔

اس شخص کو مصیبت کے وقت یہ فکر تو ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ مجھ سے ناراض تو نہیں ہے۔ کہیں ناراضی کی وجہ سے تو یہ سزا نہیں دی۔ پھر جب غور کر کے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ ناراض نہیں ہے تو اب اس کا دل مضبوط اور منشرح ہو جاتا ہے اور ہر قسم کی تکلیف میں اس کو راحت نظر آتی ہے۔ اور ایسے حالات میں گو وعدہ نہیں مگر اکثر یہ ہے کہ ایسے لوگ ظاہری واقعات تشویش سے بھی محفوظ رہتے ہیں۔ اور باوجود قلت جماعت وقلت سامان کے غالب اور فائز رہتے ہیں۔ (حقیقۃ الصبر ص ۱۴۰، ۱۴۳)

ہماری انجمنوں کی ناکامی کا سبب

آج کل جو انجمنیں قائم ہوتی ہیں اور ناکام رہتی ہیں اس کا زیادہ تر سبب یہی ہے کہ یہ زمانہ مل کر کام کرنے کا نہیں ہے کیونکہ ہر شخص دوسروں سے اپنی رائے کا اتباع کروانا چاہتا ہے۔ اسی لئے انجمنوں کا کام نہیں چلتا کیونکہ انجمن کے اراکین جو دوسروں سے اپنا اتباع کرانا چاہتے ہیں اکثر ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے اخلاق کی اصلاح تک بھی نہیں ہوئی ان میں کوئی کسی سے چھوٹا بن کر رہنے کو گوارا نہیں کرتا۔ اس لئے بہت جلد اس میں اختلاف ہو جاتا ہے پھر ہر ایک اپنی رائے پر ضد کرتا ہے تو چار دن ہی میں انجمنوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ (الانسداد مجالس حکیم الامت ص ۵۱۰)

افسوس! ہم دین کا کام سمجھ کر بھی کوئی کام کرتے ہیں تو اس کو بھی دنیا کے طریقے پر کرتے ہیں.......... اس وقت دردمندان شریعت کی حالت یہ ہے کہ وہ بار بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود (اور آپ کی تعلیم کو) یاد کر کے روتے ہیں۔ کہ ہائے امت میں کیسا انقلاب ہو گیا ہے۔ مسلمان کیا تھے اور کیا ہو گئے ان کا کوئی کام بھی تو ڈھنگ کا نہیں رہا۔

(السوال ص ۲۸، مجالس حکیم الامت ۵۱۴)

ہماری ناکامی کے اسباب

ہمارے بھائیوں میں اتباع کا مادہ نہیں اگر دین بھی کامل نہ ہو تو یہ مادہ تو ہو کہ کسی کی اتباع کریں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ یہ برباد ہیں۔

اور ایک سبب یہ ہے کہ ان میں نظم اور اصول کی پابندی نہیں ہے اگر یہ کام کریں اور انتظامی مادہ بھی ان میں ہو تو ادھر تو انتظام ادھر دین۔ پھر تو کھلی نصرت ہوگی۔ صحابہ کرام کے زمانہ میں قیصر و کسریٰ کے مقابلہ میں مسلمانوں کی کیا جمعیت تھی۔ (اور کتنی ان کی تعداد تھی) مگر اہل دین تھے اور منظم تھے۔ اگر دین کے ساتھ انتظام صحیح ہو تو پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔ باقی غیر منظم صورت میں اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ (الافاضات الیومیہ ص ۴۶/۱)

عوام کی بدحالی

عوام کی حالت یہ ہے کہ جس نے مرضی کے موافق فتویٰ دے دیا یا کوئی عالم یا لیڈران کے ساتھ ہولیا۔ اس میں سب کمالات ہیں اس کو عرش پر پہنچادیں گے۔ اگر کسی نے مرضی کے خلاف کوئی بات کہہ دی تو تحت الثریٰ میں اس کو جگہ ملنا مشکل ہے۔ (الافاضات الیومیہ ص ۱۳۰/۱)

دوسری قوموں کی ترقی اور ہماری ناکامی کے اسباب

غیر قوموں کو جو ترقی ہوئی ہے اس کے دوسرے اسباب ہیں وہ ان کی خاص صفات ہیں جو انہوں نے آپ ہی کے گھر سے لی ہیں۔ مثلاً منظم ہونا۔ مستقل مزاج ہونا، وقت کی پابندی ہونا، متحمل (یعنی برداشت کی صلاحیت) ہونا، انجام کو سوچ کر کام کرنا، صرف جوش سے کام نہ کرنا، ہوش سے کام لینا، آپس میں اتحاد و اتفاق کرنا ایک دوسرے کے راز کو چھپانا۔

یہ سب باتیں وہ ہیں جن کی اسلام نے تعلیم دی ہے اور ان احکام میں یہ خاصیت ہے کہ ان کے اختیار کرنے سے ترقی ہوتی ہے۔ خواہ کوئی بھی اختیار کرے۔

اب مسلمانوں نے تو ان احکام پر عمل کرنا چھوڑ دیا۔ نہ ان میں اتحاد و اتفاق ہے، نہ راز داری کا مادہ ہے، نہ انتظام ہے، نہ وقت کی پابندی ہے، نہ انجام بینی ہے، جو کام کرتے ہیں جوش سے کرتے ہیں، ہوش سے نہیں کرتے۔ اس لئے ان کو تنزل ہے۔ اور غیر قوموں نے

ان کے گھروں سے چرا کر ان باتوں پر عمل شروع کر دیا تو ان احکام کی خاصیت ظاہر ہوئی کہ ان کو ترقی ہونے لگی۔ (الصبرة بذبح البقرة - اشرف الجواب - معارف حکیم الامت ص ۶۰۷)

آپسی اختلاف کا نقصان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (آپسی اختلاف اور) نا اتفاقی کا نقصان بتلایا ہے فرماتے ہیں۔

ایاکم وفساد ذات البین فانها هی الحالقة

یعنی اپنے کو باہمی فساد سے بچاؤ۔ کیونکہ باہمی فساد مونڈنے والی چیز ہے آگے فرماتے ہیں۔

لا اقول تحلق الشعر بل تحلق الدین

میں یہ نہیں کہتا کہ اس کے سر کے بال منڈ جاتے ہیں بلکہ یہ کہتا ہوں کہ اس سے دین منڈ جاتا ہے۔ اور منڈنا کسے کہتے ہیں؟

منڈنا یہ ہے کہ خربوزہ کا سا سر نکل آئے بال کا نشان تک نہ رہے۔ تو حاصل یہ ہوا کہ آپسی فساد سے دین کا بالکل صفایا ہو جاتا ہے۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نا اتفاقی اور باہمی فساد کے نقصان کو بتلا دیا ہے۔ اور واقعی اس سے زیادہ کیا نقصان ہوگا کہ اس سے دین کا بالکل صفایا ہو جاتا ہے۔ مگر قربان جایئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ آپ کے عتاب میں بھی رحمت ہے۔

گو اس مقام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپسی فساد پر بہت بڑی وعید بیان فرمائی ہے مگر ساتھ ساتھ اس میں امید کی بھی جھلک ہے۔ بالکل نا امید نہیں کیا کیونکہ آپ نے فساد کو حالقہ فرمایا ہے کہ یہ دین کو مونڈ دیتا ہے اور مونڈنے سے اس وقت تو اوپر سے صفایا ہو جاتا ہے۔ مگر اندر جڑ باقی رہ جاتی ہے...... آپ نے ڈرایا دھمکایا بھی اور یہ بھی بتلا دیا کہ نا امید مت ہونا (آپسی اختلاف) فساد سے دین کی جڑ نہیں جاتی اگر کوشش کرو گے تو جڑ سے شاخ اور شاخ سے پھل بھی نکل آئیں گے۔ (وعظ الارتباط۔ ارشادات حکیم الامت ص ۵۰۷)

ناجائز کام پر اتفاق نہیں

اگر کسی جماعت نے معصیت (غلط کام) پر اتفاق کیا ہو تو ان کی مخالفت اور ان سے علیحدگی شرعاً مطلوب ہے۔ یا اتفاق تو معصیت پر نہ ہوا تھا لیکن اتفاق کے بعد وہ لوگ

معاصی (غلط کام) کرنے لگے تو اس وقت دینداروں کو ان سے الگ ہونا چاہئے۔

مگر افسوس ہے کہ آج کل جہاں دیندار اور بے دین لوگ کسی کام میں اتفاق کرتے ہیں۔ وہاں بے دین تو اپنے طریقہ پر پختہ ہوتے ہیں۔ اور نہ معلوم دیندار کیوں ڈھیلے ہو جاتے ہیں۔ بددین تو وہی کرتے ہیں جو ان کے مزاج کے موافق ہو اور ان کی رائے میں مفید ہو۔ اور دیندار باوجود جان لینے کے کہ یہ کام ہمارے مذہب میں ناجائز یا حرام ہے۔ یا یہ طریقہ ہمارے نزدیک نقصان دہ ہے مفید نہیں۔ یا یہ کام ہماری جماعت کے مزاج کے خلاف ہے پھر بھی یہ بے دینوں کی ہاں میں ہاں ملائے جاتے ہیں۔ تا کہ اتفاق میں فتور (خرابی) نہ آئے۔

سبحان اللہ! اتفاق تو جانبین سے ہوتا ہے۔ جب دوسری جماعت آپ کے جذبات کی رعایت نہیں کرتی تو اب وہ اتفاق ہی کہاں رہا۔ بس یہ کہو کہ تم ان کی خوشامد کر رہے ہو۔ اگر اتفاق ہوتا تو دوسرے بھی تمہاری کچھ رعایت کرتے۔ مگر لوگوں نے آج کل خوشامد کا نام اتفاق رکھ لیا ہے اس لئے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ مخلوق طعنہ دے گی کہ انہوں نے اتفاق میں رخنہ ڈال دیا۔

میں کہتا ہوں تم اس طعنہ سے کیوں ڈرتے ہو۔ صاف کہہ دو کہ ہاں ہم نے اتفاق کو توڑ دیا۔ اس لئے کہ اتفاق ہر حال میں مطلوب و محمود نہیں بلکہ بعض دفعہ نا اتفاقی بھی مطلوب ہے جب کہ اتفاق سے دین کو نقصان پہنچ رہا ہو۔ (وعظ الانسداد، اصلاح المسلمین ص ۵۱۳)

اتفاق قائم کرنے کا طریقہ

آج کل جو تقریروں میں کہا جاتا ہے کہ اتفاق کرو۔ اتفاق کرو اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ سب میرے ساتھ اتفاق کریں۔ ہر شخص اپنی رائے پر اتفاق کی دعوت دیتا ہے۔ اور اس طرح قیامت تک اتفاق نہیں ہو سکتا بلکہ اتفاق قائم کرنے کی صورت یہ ہے کہ ہر شخص اس بات کے لئے آمادہ ہو کہ اگر کوئی میری اتباع نہ کرے گا تو میں اس کی اتباع کروں گا۔

اتفاق کی جڑ تواضع ہے اس کے بغیر اتفاق نہیں ہو سکتا۔ اور آج کل اتفاق کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص دوسرے کو اپنے سے متفق اور اپنی رائے کا تابع بنانا چاہتا ہے۔ اگر وہ دوسرا بھی ایسا ہی چاہے تو اتفاق کیسے ہوگا۔ اتفاق تو محض تواضع سے ہوگا۔ ہر شخص دوسرے کی

موافقت اور تقلید کے لئے تیار ہو ورنہ اتفاق دشوار ہے۔ اور اگر ہوا بھی تو محض زبانی اور کاغذی ہوگا۔ (الارتباط، ارشادات حکیم الامت ص ۵۰۷، ۵۱۱ وعظ الانسداد)

فرمایا اتحاد و اتفاق کی بنیاد ہمیشہ دین کی حدود پر قائم کرو اور کسی عالم سے مشورہ کر کے کام کرو۔ یہ اتحاد انشاء اللہ مضبوط ہوگا۔ اور یہ اتحاد اس وقت باقی رہے گا جب تقویٰ کی رعایت ہوگی۔ کیونکہ جب تقویٰ کی رعایت ہوگی تو خدا کا خوف ہوگا۔ اور دوسروں کے حقوق ادا کرنے کا خیال ہوگا۔ جب دوسروں کے حقوق ادا ہوتے رہیں گے تو پھر نا اتفاقی پیدا نہیں ہوگی۔ (شریعت وسیاست ص ۲۱)

باہمی اصلاح اور اتحاد و اتفاق

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اگر مسلمانوں میں سے دو جماعتیں لڑنے لگیں تو ان کے درمیان اصلاح کرو۔ پھر بھی اگر ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ لوٹ آئے خدا تعالیٰ کی طرف (یعنی حق وانصاف کی طرف) اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک تو یہ کہ اول لڑائی کرنے والوں میں صلح کی کوشش کرو۔ دوسری یہ کہ اگر پھر بھی ایک ظلم پر کمر باندھے تو مظلوم کو تنہا مت چھوڑ دو بلکہ اس کی مدد کرو اور ظالم کے ظلم کو دفع کرو۔ (فروع الایمان ص ۷۸)

بستی کے کسی ایک بااثر دیندار کو یا بااثر دینداروں کی جماعت کو اپنا بڑا بنالیا جائے جن کا کام یہ ہو کہ لوگوں میں اتحاد و اتفاق قائم رکھیں اور جب کسی معاملہ میں جھگڑا ہو (یا کوئی بھی اہم معاملہ و حادثہ پیش آئے) اس کا شریعت کے موافق علماء سے پوچھ کر فیصلہ کر دیں (اعلان کریں) اور سب اس فیصلہ کی تائید کریں (اور اس کے موافق کارروائی کریں)

سب مسلمانوں کو باہم اتحاد و اتفاق سے رہنے کی اور گالی گلوچ، لڑائی جھگڑا بند کرنے کی تاکید کی جائے۔ (تفہیم المسلمین ص ۶)

حق کا تقاضہ یہ ہے کہ جب دو جماعتوں یا دو شخصوں میں اختلاف ہو تو پہلے یہ معلوم کیا جائے کہ حق پر کون ہے اور ناحق پر کون جب حق متعین ہو جائے تو حق والے سے کچھ نہ کہا جائے اور باطل والے کو اس کی مخالفت سے روکا جائے۔ (تفہیم المسلمین ص ۶)

صلح کرانے کا یہ طریقہ نہیں جو آج کل رائج ہے کہ دونوں فریق کو کچھ کچھ دبایا جاتا ہے

یہاں تک کہ جس کا حق ہواس کو بھی دبایا جاتا ہے بلکہ صلح کرانے کا طریقہ یہ ہے کہ جو ناحق پر ہواس کو دبایا جائے............ الغرض حق کی بنیاد پر صلح کراؤ اور اگر اس پر راضی نہ ہو تو سب مل کر غلط بنیاد کو ڈھادو۔ (ملفوظات کمالات اشرفیہ ص ۲۷)

نظم واتحاد باقی رکھنے کی اہمیت

فرمایا کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا باغیوں نے محاصرہ کرلیا یعنی گھیرلیا) تو آپ کے لشکریوں میں سے ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا، کہ باغیوں کا سردار نماز پڑھا رہا ہے، ہم لوگ اس کے پیچھے نماز پڑھیں یا نہیں؟ آپ نے فرمایا کہ پڑھ لو۔ اس فتوے کی بنیاد (اور مقصد) وہی نظم کی حفاظت تھی۔

اسی طرح شرعی حکم ہے کہ اگر کوئی شخص عید کا چاند دیکھے اور حاکم شرعی اس کو قبول نہ کرے۔ تو اس کو روزہ رکھنا واجب ہے۔ اور اگر نہ رکھا تو قضاء واجب ہوگی۔ یہ مجال نہیں کہ کوئی شخص تفریق کلمہ کا باعث ہوسکے اگرچہ اس نے اپنی آنکھ سے چاند دیکھا ہو۔ یہ سب انتظام ہی تو ہے۔ اتحاد اور نظم کے باقی رکھنے کا اس قدر شریعت میں اہتمام کیا گیا ہے۔ (مقالات حکمت ص ۲۰۴ مطبوعہ پاکستان)

اتحاد امت کے لئے مسلکی اختلافات کو ختم کرنے کی ترغیب

ملت بیضاء کی شیرازہ بندی کے لئے اپنے اختلافات کو مٹانا بہت ضروری ہے مگر اس میں کچھ تفصیل ہے وہ یہ کہ جن عقائد میں شرعاً گنجائش ہے اس میں تو دوسروں سے بالکل تعرض نہ کیا جائے۔ جیسے حنفی شافعی کا اختلاف۔ اور جن میں گنجائش نہیں جیسے شیعہ کا اختلاف اس میں سکوت (خاموش رہنا) تو جائز نہیں۔ خصوصاً جب کہ سنی ادھر ہونے لگیں یا سنی کو کوئی ادھر لے جانے لگے اس وقت تعرض ضروری ہوگا۔

لیکن شفقت ومحبت اور خیر خواہی ونرمی سے جیسے اپنا کوئی جوان بیٹا مریض بدپرہیزی کرنے لگے۔ جس طرز سے اس کو بدپرہیزی سے روکا جاتا ہے بس وہ طرز ہونا چاہئے۔ تاکہ آپس میں مداوت (اختلاف) ہوکر دوسری مخالف اسلام قوموں کے مقابلہ میں کمزور نہ ہوجائیں۔

میرا مقصد صرف یہ ہے کہ ملت بیضاء کی شیرازہ بندی (اور اتحاد ملت) کی خاطر اپنے

اختلافات کومٹا کر مسلمانوں کو اس خطرہ سے بچالیں جس کا موجودہ کشمکش کی صورت میں پیش آنا ناگزیر ہو۔ (امدادالفتاویٰ ص ۴/ ۵۱۷)

تین غلطیاں جس کی وجہ سے مسلمان ناکام ہیں

دستورالعمل ، نظام العمل

اس کا سبب چند غلطیاں ہیں:۔

۱:۔ توکل کا غلط استعمال توکل (یعنی اللہ پر بھروسہ کرنا) تو فرض ہے ہر مسلمان کو خدا تعالیٰ سے براہ راست ایسا تعلق رکھنا چاہئے کہ کسی چیز کی پرواہ نہ کرے یہی اعتقاد رکھے کہ جو خدا کو منظور ہوگا وہی ہوگا۔ کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ لیکن توکل کا استعمال (مسلمان) خلاف محل کرتے ہیں۔ (یعنی ظاہری تدبیروں پر ہی ان کا پورا اعتماد ہے یہ پہلی بڑی غلطی ہے)

۲:۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ جو کام کرتے ہیں جوش کے ماتحت کرتے ہیں اگر ہوش کے ماتحت کام کریں۔ تو بہت جلد کامیاب ہوجائیں۔

۳:۔ تیسری غلطی یہ کہ ہر کام کرنے سے پہلے یہ معلوم کرلینا واجب تھا کہ شریعت مقدسہ کا اس کے متعلق کیا حکم ہے۔ پھر اللہ رسول کی بتلائی ہوئی تدبیر پر عمل کرے۔

نظام العمل

صحیح نظام کا حاصل یہ ہوا کہ:۔

۱:۔ جوش کے ماتحت کوئی کام نہ کرے۔ ہوش کے ماتحت کرے۔

۲:۔ اپنی قوت کو ایک مرکز پر جمع کرلیں۔

۳:۔ تیسرے آپس میں اتحاد و اتفاق رکھیں۔

۴:۔ احکام کی پابندی کریں جن میں توکل بھی داخل ہے۔

۵:۔ نیز جو بھی کام کریں اس میں کامیابی کیلئے خدا سے دعا کریں۔ پھر دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ اگر ایسا کریں تو میں دعویٰ کے ساتھ خدا کی ذات پر بھروسہ کر کے کہتا ہوں کہ چند روز میں کایا پلٹ جائے گی۔ بہت جلد مسلمانوں کی مصیبتوں اور تکلیفوں کا خاتمہ ہوجائیگا۔ (شریعت وسیاست ص ۲۷)

کام کرنے کا طریقہ

۱:۔اصل چیز یہ ہے کہ مسلمانوں میں دین پیدا ہو۔
۲:۔ان کی قوت ایک مرکز پر جمع ہو۔
۳:۔ان کا کوئی امیر ہو۔ میں بقسم عرض کرتا ہوں اور خدا کی ذات پر بھروسہ کر کے کہتا ہوں کہ اگر مسلمان مضبوطی کے ساتھ اپنے دین کے پابند ہو جائیں۔ اور تمام آپس کے جھگڑوں کو ختم کر کے متحد ہو جائیں۔ اور اپنی قوت کو ایک مرکز پر جمع کر لیں۔ اور جس کو اپنا خیر خواہ سمجھ کر بڑا بنائیں اس کے کہنے اور مشوروں پر عمل کریں۔ اس کی اتباع سے اعراض نہ کریں تو پھر نہ اس کو کسی کی شرکت کی ضرورت نہ کسی سے خوف نہ ان کا کوئی کچھ بگاڑ سکتا ہے۔ (الافاضات الیومیہ ص۱۲۴/۱)

کیسے لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیئے

میں تو کہتا ہوں کہ جو کام تنہا ہو سکے وہ مجمع کے ساتھ مل کر ہرگز نہ کرو اکثر دیکھا ہے کہ مجمع میں کام بگڑ جاتا ہے دینوی کامیابی بھی اکثر نہیں ہوتی۔ اور اگر کبھی کچھ دنیا مل بھی گئی تو دین کا ستیاناس ہو جاتا ہے اور جو کام تنہا نہ ہو سکے مجمع کے ساتھ ہی ہو سکتا ہو اور اس کے لئے اگر دینداروں کا مجمع میسر ہو جائے تو کرو۔ بشرطیکہ سب دیندار ہوں۔ یا دینداروں کا غلبہ ہو۔
اور اگر غلبہ دنیاداروں کا ہو اور دیندار مغلوب یا تابع ہوں تو ایسے مجمع کے ساتھ کام کرنا واجب نہیں۔ اس وقت آپ اس کام کے مکلّف ہی نہ رہیں گے کیونکہ یہ مجمع بظاہر مجمع ہے۔ اور حقیقت میں یہ تشتت (افتراق جدائیگی) ہے۔
وہی حال ہوگا۔ کہ تحسبھم جمیعاً وقلوبھم شتی (تم ان کو جماعت گمان کرتے ہو۔ حالانکہ ان کے قلوب متفرق ہیں۔)
تو یوں کہنا چاہئے کہ مجمع میسر ہی نہیں۔ پھر جو کام اس پر موقوف تھا وہ واجب یا فرض کیوں کر ہوگا۔ (الانسداد، اصلاح المسلمین ص۵۱۱)

مقاصد کی تحریک کے لئے کیا کرنا چاہئے

حکام سے تو مقابلہ نہیں کرنا چاہئے اس لئے کہ وہ ضرر پہنچا سکتے ہیں۔ اور اپنے مقاصد کی تحریک میں سب سے بہتر اور نافع تدبیر یہ ہے کہ مسلمانوں کو قاعدہ کے موافق کارروائی کرنا چاہئے۔ اور جو واقعہ پیش آئے۔ حکام کو اس کی اطلاع کی جائے اور اس پر جو تجویز کریں۔ اس پر کاربند ہوں۔ اگر پھر کوئی واقعہ خلاف واقع ہو تو حکام بالا (اوپر کے حاکموں) کو اطلاع کریں۔ اگر وہاں سے بھی ناکامی ہو صبر کریں ایسی شورش (اور مقابلہ) نہ کریں کہ نفع سے زیادہ نقصان ہو جائے۔ (الافاضات الیومیہ ص ۱۱۶/۲)

شریعت میں دو ہی صورتیں ہیں۔ قوت کے وقت مقابلہ اور عاجزی کے وقت صبر خدا معلوم۔ یہ تیسری صورت بخوشی گرفتار ہو جانے کی کہاں سے نکالی۔ (الافاضات الیومیہ ص ۱۹/۱)

حکام سے مقابلہ کرنا کوئی عقلمندی نہیں

حکام سے تو مقابلہ نہیں کرنا چاہئے اس لئے کہ وہ نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ میں مسلمانوں سے کہا کرتا ہوں کہ اپنے وقت کے حکاموں کو ناراض نہ کرو یہ طریقہ بہت نقصان پہنچا سکتا ہے.......... ایسا کوئی کام نہ کرنا چاہئے جس میں حاکم کی ناراضگی ہو۔ کیونکہ اس کا انجام قریب بہ ہلاکت ہے اور لمبی مدت تک مسلمانوں کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے اور ایسے خطرات سے نفس کی حفاظت کرنا شرعاً مطلوب ہے۔

بعض نوجوان کہا کرتے ہیں کہ ہم تو جو کچھ کرتے ہیں قانون کے اندر کرتے ہیں خلاف قانون کچھ نہیں کرتے پھر حکام کیا کر سکتے ہیں میں نے کہا قانون ان کے ہاتھ میں ہے جس بات کو تم خلاف قانون نہیں سمجھتے ہو وہ اس کو بھی کسی ترکیب سے خلاف قانون کر دیں گے اور شریعت کا حکم ہے ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ کہ اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ (بیان القرآن ص ۱۰/۱)

مقدمہ تو حاکم کے ہاتھ میں ہوتا ہے جس کے چاہے موافق کر دے۔ حاکم کو مقدمہ کا بدلنا کیا مشکل ہے۔ ہیر پھیر کر وہ جس طرح چاہے بنا دے۔ (التبلیغ ص ۱۴/۸۳، ۸۲)

اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا مومن کی شان نہیں

ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ

اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں مت ڈالو۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مومن کو لائق نہیں کہ اپنے نفس کو ذلیل کرے۔ عرض کیا گیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے کیا مراد ہے۔ فرمایا نفس کو ذلیل کرنا یہ ہے کہ جس بلا کو برداشت نہ کر سکے اس کا سامنا کرے۔ (ترمذی)

فائدہ:۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسا کرنے سے پریشانی بڑھتی ہے۔ اگر حکام کی طرف سے کوئی ناگوار واقعہ (ظلم و استبدا) کا پیش آئے۔ تو تہذیب سے اپنی تکلیف کی اطلاع کر دو اگر پھر بھی حسب مرضی انتظام نہ ہو تو صبر کرو۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔ کہ تمہاری مصیبت دور ہو۔ (حیات المسلمین روح دہم ص ۱۲۵)

وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذرایتم امراً لا تستطیعون تغییرہ فاصبروا حتی یکون اللہ ھو الذی یغیرہ (جمع الفوائد ص ۱۹۸)

ترجمہ:۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم کسی ایسے (ناگوار) معاملہ کو دیکھو جس کے بدلنے (اصلاح) کی طاقت نہ رکھتے ہو تو صبر کرو۔ یہاں تک کہ اللہ ہی اس کو بدل دے۔

شریعت میں دو ہی صورتیں ہیں قوت کے وقت مقابلہ اور عاجزی کے وقت صبر۔

(الافاضات الیومیہ ص ۱۹/۱)

ظاہری قوت کے اعتبار سے جب ہم کچھ نہ کر سکتے ہوں

حدیث میں ایک قصہ آیا ہے کہ ایک دفعہ مکہ میں ایک اونٹ ذبح ہوا تھا آپس میں کفار کا مشورہ ہوا کہ کوئی شخص اس کی آلائش (اوجھڑی) آپ پر رکھ دے ایک بدبخت اٹھا اس وقت آپ نماز پڑھ رہے تھے سجدہ میں تھے اس نے آپ پر وہ آلائش رکھ دی کیونکہ یہ جانتے تھے کہ یہ ایسے رسول ہیں کہ نماز توڑ کر تھپڑ نہیں ماریں گے۔ حضرت فاطمہ کو علم ہوا آئیں اور اس کو

ہٹایا۔اس وقت آپ بچی تھیں۔پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بعد بد عا کی۔

اس قصہ سے معلوم ہوا کہ (اس وقت آپ) مقابلہ میں آکر کچھ نہ کر سکتے تھے۔آپ تو اکیلے تھے وہ جو کچھ چاہتے کر سکتے۔کمیٹیاں ہوتی تھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نکال دیں۔مگر آپ کو خدا نے رعب اتنا دیا تھا کہ کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی۔(روح الجوار ۲۴۵)

(اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت ظاہری قوت کے لحاظ سے کچھ نہ کر سکتے ہوں اس وقت اللہ سے دعا اور صبر کرنا چاہئے)

ہنگامی حالات میں کیا کرنا چاہئے

اور اگر کوئی بات حکام وقت سے کہنے کی ہو تو اپنے بڑوں سے مشورہ کر کے حکام کو اطلاع کر دو۔اب جو کام ان کے کرنے کا ہے وہ خود کریں۔

اگر پھر بھی تم پر کوئی ناگہانی آفت آجائے (ظلم زیادتی ہو) تو وقت پر صبر کرو۔اور اگر کوئی ہنگامہ ہو جائے تو تم کو لازم ہے کہ خود ظلم نہ کرو۔اور اپنی حفاظت کرو۔اس صورت میں غالب تو یہ ہے کہ دوسرا بھی ظلم سے باز آجائے گا اور اگر وہ ظلم ہی کرے تو تم شہید ہی ہو جاؤ گے۔اس میں بھی مسلمان ہی کا نفع ہے۔ (حقیقۃ الصبر ص ۱۳۸)

حکومت کے ظلم کا علاج

اگر حکام ظلم کرنے لگیں ان کو برا مت کہو۔سمجھ جاؤ کہ ہم سے حاکم حقیقی (یعنی پروردگار عالم) کی نافرمانی ہوئی ہے یہ اس کی سزا ہے۔یعنی اپنی حالت درست کر لو۔اللہ تعالیٰ حکام کے قلوب کو نرم کر دیں گے۔(تعلیم الدین ص ۴۱)

اگر حاکم سے کوئی امر خلاف طبع پیش آئے .... اس کی نرم مزاجی کے لئے دعا کرے۔اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا اہتمام کرے تا کہ اللہ تعالیٰ حکام کے دل کو نرم کریں۔

ایک حدیث میں یہ مضمون آیا ہے۔(حقوق الاسلام ص ۱۰)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اللہ ہوں، بادشاہوں کا مالک ہوں۔ان کا دل میرے ہاتھ میں ہے۔پس جو شخص میری اطاعت کرتا ہے میں ان بادشاہوں کا دل اس پر مہربان

کر دیتا ہوں۔ اور جو میری نافرمانی کرتا ہے میں انہیں بادشاہوں کو اس شخص پر عقوبت (سزا کے لئے) مقرر کرتا ہوں۔ تم بادشاہوں کو برا کہنے میں مشغول مت ہو۔ میری طرف رجوع کرو میں ان کو تم پر نرم کر دوں گا۔ (جزء الاعمال ص ۹)

اپنی حفاظت کا سامان اور انتظام رکھنا

ابوالسائب حضرت ابوسعید خدری سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک اجازت لینے والے سے) فرمایا کہ اپنا ہتھیار ساتھ لے لو مجھ کو بنی قریظہ سے (جو کہ یہودی اور دشمن تھے) اندیشہ ہے چنانچہ اس شخص نے ہتھیار لے لیا اور گھر چلا گیا۔ (مسلم)

فائدہ:۔ جس موقع پر دشمنوں سے ایسا اندیشہ ہو اپنی حفاظت کے لئے جائز ہتھیار اپنے ساتھ رکھنے کا اس سے ثبوت ہوتا ہے۔ (حیات المسلمین ص ۱۲۲)

انبیاء علیہم السلام کا مسنون طریقہ تھا کہ ہاتھ میں لاٹھی رکھتے تھے اس واسطے مسلمانوں کو اس سنت پر کاربند رہنا چاہئے۔ (تجدید تعلیم وتبلیغ ص ۱۹۵)

جن اسلحہ کی قانون سے اجازت ہے یا ہو سکتی ہے (ان کو ضرور رکھنا چاہئے)۔

عمرو بن شعیب اپنے باپ سے وہ ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ایک سوار ایک شیطان ہے اور دو سوار دو شیطان ہیں۔ اور تین سوار قافلہ ہے۔ (ترمذی)

فائدہ:۔ یہ اس وقت تھا جب کہ اکے دکے کو دشمن کا خطرہ تھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اپنی ضرورت کا سامان ضروری ہے۔ (حیات المسلمین ص ۱۲۳)

اگر ظالم قوم مسلمانوں کی جان لینے اور حملہ کرنے پر آمادہ ہوں تو مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے

اگر کسی مخالف قوم کی طرف سے کوئی شورش ظاہر ہو تو حکام کے ذریعے اس کی مدافعت کرو۔ خواہ وہ خود انتظام کر دیں۔ خواہ تم کو انتظام کی اجازت دیں۔ اور اگر حکام ہی کی طرف سے کوئی ناگوار واقعہ پیش آئے تو تہذیب سے اپنی تکلیف کی اطلاع کر دو۔ اگر پھر بھی

انتظام نہ ہو تو صبر کرو۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ تمہاری مصیبت دور ہو۔

لیکن اگر کہیں ظالم لوگ چھوڑ دینے پر نہ مانیں اور جان ہی لینے پر آمادہ ہوں تو مسلمانوں کو مقابلہ پر مضبوط ہو جانا ہر حال میں فرض ہے۔ گو کمزور ہی ہوں۔

وھذا من باب القتال حیث تفرض عینا اذا ھجم العدولا من باب الاکراہ خلاصہ یہ کہ حتی الامکان فتنہ فساد کو امن کے ساتھ دفع کریں۔ اور جو کوئی اس پر بھی سر ہی ہو جائے تو پھر مرتا کیا نہ کرتا بقول سعدی۔

چوں دست از ہمہ حیلتے درگست　　حلال است بردن بشمشیر دست
اگر صلح خواہد عدو سر مپیچ　　وگر جنگ جوید عناں پر مپیچ

(حیات المسلمین ص ۱۷۹)

ترجمہ:۔ (جب تم حیلوں سے ہاتھ خالی ہو جائے تو اب ہاتھ میں تلوار اٹھا لینا جائز ہے) اگر دشمن صلح چاہے تو سر مت موڑو۔ اور اگر جنگ ڈھونڈے تو لگام مت پھیرو (بلکہ تیار ہو جاؤ۔)

دفاعی تدابیر اختیار کرنا

جان و مال، عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے مقابلہ کرنا

اپنی جان و مال و دین و آبرو کی حفاظت کے لئے لڑنا درست ہے اگر مارا گیا شہید ہوگا۔ اگر مقابل مارا گیا اس شخص پر کوئی الزام (گناہ) نہیں۔ (تعلیم الدین ص ۳۹)

حدیث میں ہے **من قتل دون عرضہ ومالہ فھو شھید.**

یعنی جو شخص اپنی عزت اور مال کی (حفاظت میں قتل کیا جائے وہ شہید ہے)

(اس حدیث میں) قتل سے مراد خودکشی نہیں بلکہ مراد قتال ہے یعنی لڑو اور جنگ کرو۔ اس نیت سے کہ جان اور ایمان اور مال بچ جائے۔ پھر اس قتال میں اگر جان چلی جائے تو چلی جائے وہ شہادت ہے۔ خود قتل مقصود نہیں بلکہ قتال سے اگر لازم آ جائے (یعنی مقابلہ میں اگر مقتول ہو جائے) تو اس کا جواز نکلتا ہے۔ غرض اس سے مقصود (قتال ہے قتل نہیں اور وہ بھی جب کہ اس قتل کی سب شرطیں پائی جائیں اور موانع مرتفع ہوں جس کی تفصیل کتب فقہ میں

ہے۔(”حاصل یہ کہ اس کی وجہ سے مسلمانوں کا اور زیادہ جانی و مالی نقصان نہ ہو۔ ورنہ بڑے نقصان سے بچنے کے واسطے چھوٹا نقصان برداشت کرنا آسان ہے“)(افاضات الیومیہ ص ۱۱۴/۱)

اگر حکومت ظلم کرے تو تم ظالم نہ بنو

اگر کوئی ہنگامہ ہو جائے (اور حکومت ہی تم پر ظلم کرے) تو تم پر لازم ہے کہ تم خود ظلم نہ کرو اور اپنی حفاظت کرو۔ اس صورت میں غالب تو یہ ہے کہ دوسرا بھی ظلم سے باز آئے گا۔ اور اگر وہ ظلم ہی کرے تو تم شہید ہو جاؤ گے۔ اس میں بھی مسلمان کا نفع ہے۔

شہادت وہ چیز ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کے لئے ہمیشہ دعا کیا کرتے تھے۔ "**اللھم ارزقنی شھادۃ فی سبیلک**" اے اللہ مجھے اپنی راہ میں شہادت نصیب فرما۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تمنا کیا کرتے تھے۔ **وددت ان اقتل فی سبیل اللہ ثم احیی ثم اقتل ثم احیی ثم اقتل ثم احیی.**

ترجمہ:۔ میں تمنا کرتا ہوں کہ اللہ کے راستہ میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں۔ پھر قتل کیا جاؤں۔ مگر اتنی بات پھر کہے دیتا ہوں کہ جان دینا اسی وقت شہادت ہے جب شریعت کے موافق ہو ورنہ خودکشی ہے (جو کہ حرام ہے) (حقیقۃ الصبر ص ۱۳۸)

ظالم سے بدلہ لینے کے حدود

وجزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللہ انہ لا یحب الظالمین. (شوریٰ)

ترجمہ وتشریح:۔ برائی کا بدلہ لینے کے لئے ہم نے یہ اجازت دے رکھی ہے کہ برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔ بشرطیکہ وہ فعل فی نفسہٖ معصیت (یعنی گناہ) نہ ہو پھر انتقام کی اجازت کے بعد جو شخص معاف کردے اور اصلاح کرلے جس سے عداوت جاتی رہے۔ اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے اور جو بدلہ لینے میں زیادتی کرنے لگے تو یہ سن لے کہ واقعی اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

اور جو زیادتی نہ کرے بلکہ اپنے اوپر ظلم ہو چکنے کے بعد برابر کا بدلہ لے لے سو ایسے

لوگوں پر کوئی الزام نہیں۔ الزام صرف ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں، خواہ ابتدا میں یا انتقام کے وقت۔ اور ناحق دنیا میں سرکشی کرتے ہیں۔ ایسوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ (بیان القرآن شوریٰ)

(خلاصہ یہ کہ آیت سے بدلہ لینے کا جواز معلوم ہوتا ہے لیکن) اس عموم سے غیر مشروع (یعنی ناجائز طریقے) مستثنیٰ ہیں۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی کسی کے ساتھ بدفعلی (بدکاری زناوغیرہ) کرے تو بدلہ میں (بدفعلی کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں، اسی طرح ایسی بدقولی بھی مستثنیٰ ہے۔ (امداد الفتاویٰ ص ۴/ ۳۶۵)

مقابلہ کے لئے قدرت کی شرط اور شرعی قدرت کی تعریف

قدرت کی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ جو کام ہم کرنا چاہتے ہیں اس پر تو ہم کو قدرت ہے لیکن اس کے کرنے کے بعد جب خطرات کا سامنا ہوگا ان کے دفع کرنے پر قدرت نہیں۔

دوسرے یہ کہ فعل پر بھی قدرت ہے اور اس کے کر لینے کے بعد جو خطرات پیش آئیں گے ان کی مدافعت پر بھی بظن غالب عادتاً قدرت ہو۔

پہلی صورت استطاعت لغویہ ہے، اور دوسری صورت استطاعت شرعیہ ہے، جس کو اس حدیث نے صاف کردیا ہے من رای منکم منکراً الی اخر الحدیث ظاہر ہے کہ استطاعت باللسان (یعنی زبان سے منع کرنے کی قدرت) ہر وقت حاصل ہے، پھر اس کے انتفا (نہ پائے جانے) کی تقدیر کب محقق ہوگی یعنی اگر کسی فعل کی فرضیت کے لئے محض فعل (یعنی اس کام کو کر لینے) پر قادر ہونا کافی ہو اور اس سے جو خطرات پیش آنے والے ہوں ان کی مدافعت پر قادر ہونا شرط نہ ہو تو زبان سے انکار کرنا ہر حالت میں فرض ہونا چاہئے کیونکہ زبان کا چلانا ہر وقت ہماری قدرت میں ہے۔ پھر وہ کون سی صورت ہوگی جس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر زبان سے مٹانے کی قدرت نہ ہو تو دل سے مٹادے (یعنی برا سمجھے)۔

اس سے ثابت ہوا کہ استطاعت (قدرت) سے مراد یہ ہے کہ اس فعل (کام) پر قدرت ہونے کے ساتھ اس میں ایسا خطرہ بھی نہ ہو جس کی مدافعت (دفع کرنا) مقابلہ کرنا

بظن غالب عادتاً ناممکن ہوایک شرط یہ بھی ہے کہ اس دفاع کے بعداس سے زیادہ شر میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ مدافعت (مقابلہ) کی فرضیت کے لئے پہلی استطاعت کافی نہیں بلکہ دوسری استطاعت شرعیہ شرط ہے۔ (افادات اشرفیہ ورسائل سیاسیہ ص۱۰)

اگر کامیابی کی توقع غالب نہ ہوتو ایسے افعال (یعنی مقابلہ کرنا) جائز نہیں نہ ان میں اجر ہے۔ (التبلیغ ص۱۴۹/۶)

بہادری دکھانا ہر موقع پر کمال نہیں

بہادری ہر موقع میں کمال نہیں، اور جان دینا ہر وقت دین کا کام نہیں بلکہ جس وقت خدا کا حکم ہواس وقت جان دینا دین ہے ورنہ اتباع نفس ہے اگر کسی موقع میں خدا تعالیٰ جان دینے سے منع کردیں، اس وقت جان کی حفاظت فرض ہے۔

دیکھو شریعت نے ایک وقت میں نماز کو حرام کیا اور پاخانہ میں جانا فرض کیا ہے۔ اس وقت نماز پڑھنے سے گناہ ہوگا۔ اور پاخانہ میں جانے سے ثواب ہوگا۔ فقہاء نے صاف تصریح کی ہے کہ پیشاب پاخانہ کے تقاضہ کے وقت نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اور پیشاب پاخانہ سے فارغ ہونا واجب ہے۔

اب جو سچے مسلمان ہیں وہ ہر وقت حکم کا اتباع کرتے ہیں خواہش نفس کا اتباع نہیں کرتے ایک وقت ان کا جی چاہتا ہے کہ نماز پڑھیں مگر شریعت حکم دیتی ہے کہ پاخانہ جاؤ تو وہ شریعت کے حکم کو نفس کی خواہش پر مقدم کریں گے اس میں ان کی جماعت فوت ہو جائے اور لوگ ملامت کریں مگر ان کو ملامت و بدنامی کی پرواہ نہیں ہوتی۔

اسی طرح اگر کسی وقت بہادری کا جوش ہو اور دین کے لئے جان دینے کا تقاضا ہو مگر شریعت اجازت نہ دے تو وہ اپنے تقاضے کو روک لیں گے اور شریعت کے حکم کا اتباع کرکے جان کی حفاظت کریں گے۔ گو اس میں ان پر چاروں طرف سے ملامت (بدنامی) ہو کہ بڑا بزدل ہے جان دینے سے ڈرتا ہے جیل خانہ جانے سے گھبراتا ہے مگر سچے مسلمان اس کی پرواہ نہیں کرتے۔ (ان کی شان یہ ہوتی ہے کہ) "ولا یخافون لومۃ لائم" (وہ کسی کی ملامت سے ڈرتے نہیں) سچے مسلمان کو اللہ کی رضا کے سامنے بدنامی اور رسوائی کی پرواہ کبھی نہیں ہوتی۔

موت سے نہ ڈرنا کب قابل تعریف ہے

موت سے نہ گھبرانا (نہ ڈرنا) اسی وقت محمود ہے۔ جب حق تعالیٰ کی محبت (اور اتباع دین وشریعت کے تابع) ہو ورنہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو گناہوں میں مبتلا ہونے کے باوجود یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ایسے بہادر ہیں ویسے بہادر ہیں ہم جیل خانے سے نہیں ڈرتے، ہم کو موت کا ڈر نہیں، سو چونکہ اس کا منشاء محض اتباع نفس اور دعویٰ ہے اس لئے کوئی کمال نہیں بلکہ مذموم جرأت مندی ہے مخلص ڈینگیں نہیں مارا کرتا، دعوے کرنا اور ڈینگیں مارنا اتباع نفس کی علامت ہے۔ اور یہ کوئی کمال نہیں ایسے مشہور لوگ تو کفار میں بھی ہوتے ہیں ان کو بھی جیل خانے کا خوف نہیں ہوتا، نہ موت کا اندیشہ، اگر یہ کچھ کمال ہے تو ان کافروں کو بھی صاحب کمال کہنا چاہئے جو کہ موت سے نہیں ڈرتے، پھانسی کے وقت بعض کفاروں نے بھی جرأت ظاہر کی ہے، مگر ظاہر ہے کہ کفر کے ساتھ کوئی دینی کمال جمع نہیں ہوسکتا۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ یہ تہوار (لاپرواہی سے، بہادری دکھانا) دینی کمال نہیں۔ دینی کمال بس یہ ہے کہ جہاں خدا کہے وہاں خوشی سے جان دو ورنہ اپنی جان کو آرام دو، خدا کی مرضی کے موافق جب آدمی جان دیتا ہے تو اس کو عین موت کے وقت بھی راحت نصیب ہوتی ہے۔ (تقلیل الاختلاط ص ۳۱۰)

محض جان دے دینا کوئی کمال نہیں

جان دینا تو کوئی مشکل نہیں مگر یہ تو اطمینان ہو کہ اپنے مصرف پر گئی جان بھی دی اور خلجان مول لیا کہ جس کام کے لئے جان دی ہے وہ دین ہے یا نہیں۔ یوں ہی بیٹھے بٹھائے جا کر جان دے دینا کون سی انسانیت ہے۔ (الافاضات الیومیہ ص ۱/۱۲۲)

جان خدا کی امانت ہے اگر ہماری ہوتی لا تقتلوا انفسکم (خودکشی نہ کرو) کا حکم نہ ہوتا۔ مال جو کہ کمایا ہوا ہے وہ بھی ہمارا نہیں جان ہماری کیوں ہوتی۔ خدا کے لئے جان کیا چیز ہے۔ مگر یہ تو اطمینان ہو کہ یہ یقیناً خدا کے واسطے صرف ہوئی، تذبذب (شک) کی حالت میں جان دینا کیوں جائز ہوگا ہم کو تو حکم ہے کہ تذبذب کی حالت میں جب کہ کفار کی اباحت دم (یعنی ان کی جان لینے کے جواز) میں تردد ہو کفار کی بھی جان نہ لیں۔ (الافاضات الیومیہ ص ۱/۴۶)

جان ہماری ملک نہیں کہ جس طرح چاہیں تصرف کریں

مسلمانو! یہ جان خود اپنی نہیں ہے کہ جس طرح چاہیں آپ اس میں تصرف کریں، بلکہ خدا تعالیٰ کی امانت ہے اس کو خدا کے حکم کے بغیر صرف کرنا جائز نہیں اور اسی بنا پر خودکشی سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ ولا تقتلوا انفسکم (کہ اپنے آپ کو قتل نہ کرو)۔

اللہ والوں کو یہ مسئلہ پوری طرح منکشف ہوگیا ہے کہ یہ جان ہماری نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی چیز ہے اس لئے وہ اپنی جان کی بہت حفاظت کرتے ہیں۔ اور کوئی کام خدا کی رضا کی نیت کے بغیر نہیں کرتے۔ چنانچہ ان کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ یہاں اللہ تعالیٰ جان دینا پسند کرتے ہیں۔ تو وہ سب سے زیادہ جان دینے میں دلیر ہوتے ہیں۔ اور جب یہ معلوم ہو جائے کہ یہاں جان دینا خدا کو پسند نہیں تو وہ سب سے زیادہ اپنی جان کی حفاظت کرتے ہیں۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کو اپنے جسم اور روح سے بہت محبت ہے حالانکہ حقیقت میں ان کو خدا سے محبت ہے اور اس وجہ سے خدا کی ہر چیز سے محبت ہے۔...... ان کو اپنے اعضاء سے محض اس لئے محبت ہے کہ یہ خدا کی امانتیں ہیں اور ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی مرضیات کی تعمیل ہوتی ہے۔ اور کوئی وجہ نہیں۔ (الحد ودوالقیود ص ۱۵۶/۱۵)

دشمن سے مقابلہ کی تیاری کا حکم

واعدو الھم مااستطعتم من قوۃ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور ان (دشمنوں) کے لئے جس قدر تم سے ہو سکے قوت تیار کرو۔ (انفال آیت ۶۰)

فائدہ:۔ اس میں قوت کی حفاظت کا صاف حکم ہے۔

مسلم شریف میں عقبہ بن عامر کی روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تفسیر تیر اندازی کے ساتھ منقول ہے۔ اور اس کو قوت اس لئے فرمایا کہ اس سے دین اور دل میں بھی مضبوطی ہوتی ہے اور اس میں جو دوڑنا بھاگنا پڑتا ہے تو بدن میں بھی مضبوطی ہوتی ہے۔ اور یہ اس زمانہ کا ہتھیار تھا اس زمانہ میں جو ہتھیار ہیں وہ تیر کے حکم میں ہیں۔

عقبہ بن عامر سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ تیر اندازی بھی کیا کرو۔ (ترمذی۔ابن ماجہ)

فائدہ:۔ سواری سیکھنا بھی ایک ورزش ہے جس سے قوت بڑھتی ہے۔ ان ہی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ جس نے تیر اندازی سیکھی پھر چھوڑ دی وہ ہم میں سے نہیں۔ یا یہ فرمایا کہ اس نے نافرمانی کی۔

فائدہ:۔ اس سے کس قدر قوت کی حفاظت کی تاکید معلوم ہوتی ہے۔ جب قوت اللہ کے نزدیک ایسی پیاری چیز ہے تو اس کو باقی رکھنا اور جو چیزیں قوت کم کرنے والی ہیں ان سے احتیاط رکھنا یہ سب مطلوب ہوگا۔

قوت بڑھانے میں ورزش کرنا، دوڑنا، پیادہ چلنے کی عادت ڈالنا، جن اسلحہ (ہتھیار) کی قانون سے اجازت ہے یا اجازت حاصل ہوسکتی ہے ان کی مشق کرنا یہ سب داخل ہیں۔ مگر حد شرع و حد قانون سے باہر نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ اس سے جمعیت (یکسوئی) اور راحت جو کہ شرعاً مطلوب ہے۔ برباد ہوتی ہے۔

حضرت فضالہ بن عبید سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو زیادہ آرام طلبی سے منع فرماتے تھے اور ہم کو حکم دیتے تھے کہ کبھی کبھی ننگے پاؤں بھی چلا کریں۔ (ابوداؤد)

اس سے ثابت ہوا کہ پیدل چلنے کی عادت رکھے زیادہ آرام طلب نہ ہو۔ مضبوطی، جفاکشی کی عادت ڈالے۔ (حیات المسلمین روح دہم ص ۱۲۳)

ایمان درست کرنے میں قوت کی تیاری بھی داخل ہے

سوال:۔ قرون اولی میں غیر قوموں پر مسلمانوں کا غلبہ اس لئے تھا کہ...... دونوں کے آلات حرب (یعنی مقابلہ اور جنگ کے ہتھیار) ایک ہی قسم کے تھے مگر ہمارے زمانہ میں اگر روحانی قوت حاصل ہوجائے تو بغیر روپے کے وہ آلات واسباب کہاں سے مہیا ہوسکتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا کہ ہم محض اپنا ایمان درست کر کے غلبہ پالیں گے کیوں کر درست ہوسکتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر ترقی چاہنے والوں کا کیا جواب ہوگا جو آلات واسباب کو ایمان پر بھی مقدم سمجھتے ہیں۔

الجواب:۔ ایمان کے درست کرنے میں اعداد قوت بقدر استطاعت (یعنی اپنی کوشش کی حد تک بقدر ممکن قوت کی تیاری کرنا یہ) بھی داخل ہے اور اس اعداد (تیاری) کے لئے جتنے مال کی ضرورت ہے اس کا جمع کرنا بھی اسی میں داخل ہے کہ امیر المومنین سے بقدر تحمل وصول کرے۔ اور اللہ کی عادت یہی ہے کہ اتنی بڑی جماعت میں ایسے لوگ ضرور ہوں گے۔ اگر بالفرض نہ ہوں تو جتنا مال ہو سکے اس سے زراعت تجارت کا انتظام واجب ہوگا اور یہ سب ایمان کے درست کرنے میں داخل ہے۔ (امداد الفتاویٰ صف ۶/ ۲۱۷)

مسلمانوں کی فلاح وکامیابی کا دستور العمل

اب میں ان احکام کو بیان کرتا ہوں جن پر فلاح وکامیابی کو موقوف کیا گیا ہے اور وہ چار چیزیں ہیں۔ (جن کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔)

یایھا الذین امنوا اصبروا وصابروا ورابطوا واتقوا اللہ لعلکم تفلحون.

ترجمہ وتشریح:۔ اے ایمان والوں تکلیف پر خوب صبر کرو۔ اور جب کفار سے مقابلہ ہو تو مقابلہ میں صبر کرو۔ اور مقابلہ کے احتمال کے وقت مقابلہ کے لئے مستعد رہو۔ اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ اور حدود شرع سے نہ نکلو تاکہ تم پورے کامیاب ہو۔

۱:۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ اعمال دو قسم کے ہیں ایک تو وہ جن کا وقت آ گیا۔

۲:۔ ایک وہ جن کا وقت نہیں آیا۔

سو یہاں ایک حکم پہلی قسم کے متعلق ہے اور ایک حکم دوسری قسم کے متعلق ہے۔

پہلی قسم کے متعلق تو اصبروا ہے یعنی جس عمل کا وقت آجائے اس وقت صبر سے کام لو، یعنی پابندی اور استقلال سے رہو۔ حق تعالیٰ نے اس میں اعمال حاضرہ میں مستقل رہنے کا حکم فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دینداری کے یہی معنی ہیں کہ ہر کام کو پابندی اور استقلال سے کیا جائے۔

آج کل لوگ ولولے اور جوش میں بہت سا کام شروع کر دیتے ہیں پھر نباہ نہیں ہوتا۔ تو یہ دینداری کامل نہیں ہے۔ اسی لئے خدا تعالیٰ نے اتنا ہی کام بتلایا۔ جس پر نباہ ہو سکے۔ واجبات، فرائض وسنن موکدہ پر نباہ دشوار نہیں۔ اس سے زیادہ کام کرنے میں البتہ بعض لوگوں سے نباہ

نہیں ہوتا۔ تو ان کو اپنے ذمہ اتنا ہی کام بڑھانا چاہئے جس پر نباہ اور دوام (پابندی) ہو سکے۔ تو ''اصبروا'' کا حکم ان اعمال کے متعلق ہے جن کا وقت آ گیا ہے۔ (سبیل النجاح دین و دنیا ص ۶۴۳)

پھر ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق صرف اپنی ذات سے ہے دوسرے وہ جن کا تعلق دوسروں سے بھی ہے ان کے متعلق ''صابروا'' فرمایا ہے کہ دوسروں کے ساتھ صبر و استقلال سے کام لو۔ بعض لوگ اپنے ذاتی کام تو کر لیتے ہیں۔ مثلاً نماز وغیرہ مگر دوسروں کے متعلق باہمت نہیں ہوتے۔ اور کچھ لوگ ہمت بھی کرتے ہیں۔ تو وہ اسی وقت رہتی ہے جب تک کوئی دوسرا مقابل نہ ہو اور اگر کوئی مقابل ہوا تو پھر مستقل نہیں رہتے۔ اس کے متعلق ''صابروا'' میں یہ حکم ہے کہ دوسروں کے مقابل میں بھی ثابت قدم رہو۔

اسی طرح اگر کبھی اعداء اللہ (اللہ کے دشمن) دین میں مزاحمت کرنے لگیں تو ان کے مقابلہ میں بھی مستقل رہنے کا ''صابروا'' میں حکم ہے۔

غرض ایک وہ افعال ہیں جن میں کسی سے مقابلہ نہیں کرنا پڑتا۔ ان پر استقلال پابندی کرنے کا حکم تو اصبروا میں ہے۔ اور جن میں دوسروں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور ان میں ثابت قدم رہنے کا حکم صابروا میں ہے۔ یہ تو وہ افعال تھے جن کا وقت آ گیا ہے۔

اور ایک وہ افعال ہیں جن کا ابھی وقت نہیں آیا ان کے متعلق حکم رابطوا میں ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ان کاموں کے لئے تیار و مستعد رہنا چاہئے۔ کیونکہ لغت میں رباط کے معنی دشمن کے مقابلہ میں سرحد پر گھوڑے باندھنا ہے یعنی مورچہ بندی اور ظاہر ہے کہ مورچہ بندی حفظ ماتقدم (یعنی پیشگی حفاظت) کے لئے اور پہلے سے مقابلہ کو تیار و مستعد رہنے کے لئے کی جاتی ہے۔ عام لغت کے موافق ایک تفسیر تو رباط کی یہ ہے

دوسری ایک تفسیر حدیث میں آئی ہے۔ **انتظار الصلوٰۃ بعد الصلوٰۃ** یعنی ایک نماز پڑھ کر دوسری نماز کے منتظر رہنا۔ حضور نے اس کے متعلق بھی فرمایا **فذالکم الرباط فذالکم الرباط** یہی رباط ہے۔

اس تفسیر اور پہلی تفسیر میں کچھ منافات نہیں بلکہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ ''رباط'' (یعنی پیشگی حفاظت) ظاہری دشمن کے ساتھ خاص نہیں بلکہ

جیسے ظاہر دشمن کے مقابلہ میں رباط (حفاظت کا بندوبست) ہوتا ہے۔اسی طرح کبھی باطنی دشمن یعنی نفس وشیطان کے مقابلہ میں بھی رباط ہوتا ہے۔

وہ ظاہری مجاہدہ کا رباط ہے۔اور یہ مجاہدہ باطنی کا ''رباط'' ہے اسی کو ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح ارشاد فرمایا ہے۔

المجاهد من جاهد نفسه والمهاجر من هجر الخطايا والذنوب

یعنی مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس کے مقابلہ میں مجاہدہ کرے۔

بس دین کا خلاصہ یہ ہے کہ جن کاموں کا وقت آ گیا ہے ان کو استقلال یا پابندی سے ادا کیا جائے۔اور جن کا وقت نہیں آیا ان کے لئے تیار رہے کسی وقت بے فکر ہو کر نہ بیٹھے۔ اب ایک قسم رہ گئی یعنی اعمال باطنہ اس کے متعلق فرماتے ہیں **واتقوا الله** خدا سے ڈرتے رہو یہ تمام اعمال کی جڑ ہے۔

اس بیان سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ لوگ اس وقت کامیابی کی طلب میں کدھر الٹے جا رہے ہیں۔اور فلاح کامیابی کا جو اصلی طریقہ ہے۔اس پر توجہ نہیں۔

آج کل لوگ کفار کا طریقہ اختیار کر کے فلاح حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر اس کا انجام فلاح نہیں کفر سے نزدیک ہونا ہے فلاح کا طریقہ اگر ہے تو یہی ہے (جو قرآن سے بیان کیا گیا) جس سے معلوم ہوا کہ دین ہی فلاح کا طریقہ ہے اور اگر دین نہیں تو خدا کی قسم ساری دنیا کی بھی سلطنت حاصل ہو جائے تو بھی فلاح نہ ہوگی یعنی راحت واطمینان جو اصل ہے فلاح کی۔(سبیل النجاح، دین ودنیا ص ۶۳۱)

جہاد کی ضرورت

فرمایا جیسے یہ غلط ہے کہ نماز روزہ کو کامیابی میں کیا دخل ہے اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ نماز روزہ کامیابی کے لئے کافی ہے بلکہ دلائل اس کے شاہد ہیں کہ خالی نماز روزہ سے کبھی کامیابی نہیں ہوتی اور نہ ہو سکتی ہے۔ بلکہ ایک دوسری چیز کی بھی ضرورت ہے۔اور وہ چیز قتال وجہاد ہے۔

کیا مکہ مکرمہ میں نماز روزہ نہ تھا۔ بھلا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بڑھ کر کس کا نماز روزہ ہو سکتا ہے مگر اس کے باوجود دیکھ لیجئے کہ مکہ مکرمہ کے اندر مسلمان اتنے

دنوں تک رہے لیکن یہ غلبہ نہ ہوا جب ہجرت ہوئی قتال ہوا اس وقت غلبہ حاصل ہوا۔ تمام تاریخ اسلامی اٹھا کر دیکھ لو کہیں اس کی نظیر نہ ملے گی کہ خالی نماز روزہ سے مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا ہو۔ البتہ ضروری نماز روزہ بھی ہے۔

غلبہ کی حیثیت سے نماز روزہ اور قتال میں فرق یہ ہے کہ نماز روزہ تو غلبہ کی شرط ہے اگر نماز روزہ اور اطاعت ہوگی تو غلبہ ہوگا اور جہاد غلبہ کی علت ہے۔ گو نماز روزہ فرض عین ہے اور جہاد فرض کفایہ ہے مگر غلبہ کی علت جہاد ہی ہے۔

پس ثابت ہوا کہ مسلمانوں کا غلبہ دونوں ہی چیزوں پر موقوف ہے اور یہ میری رائے آج سے نہیں ہمیشہ سے ہے۔ کہ جب تک طاعت کے ساتھ قتال و جہاد نہ ہوگا اس وقت تک مسلمانوں کو فلاح میسر نہیں ہوسکتی۔ (از حکیم الامت آثار رحمت ص ۱۰۴ طبع لاہور)

مکی زندگی میں جہاد کیوں نہیں فرض ہوا

حضرت حکیم الامتؒ نے احقر مؤلف سے ارشاد فرمایا کہ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ باوجود یہ کہ (جہاد) قتال کے بغیر صحابہ کو نہ غلبہ ہوسکتا تھا نہ ہوا۔ مگر تیرہ برس **مکہ معظمہ** میں گزر گئے اور مسلمانوں کو سخت سے سخت ایذائیں پہنچیں لیکن قتال کی اجازت نہ ہوئی اور نہ اس کا حکم آیا۔ یہاں تک کہ جب مسلمانوں کو ہجرت کی اور قتال کی اجازت ہوگئی تو اس کی وجہ کیا ہے کہ قتال کی اس قدر تو ضرورت تھی مگر جب تک کہ ہجرت نہ ہوئی اس وقت تک قتال کی اجازت نہ ہوئی۔

احقر نے عرض کیا کہ حضور کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ ھجرت کے قبل مسلمانوں کے پاس ہتھیار اور سامان نہ تھا؟ فرمایا اجی ہتھیار تو خود مقابل ہی سے لے لیجاتے ہیں، اس زمانہ کے قریب ہی کا قصہ ہے کہ مہدی سوڈانی کو دیکھو کہ وہ لوگ بھی کہ باوجود یہ کہ ان کے مقابل کے پاس ہر قسم کا سامان تھا اور ان کے پاس نہ تھا مگر وہ مقابل کے پاس پہنچ کر ان کے ہتھیار چھین کر ان ہی سے لڑتے ہیں اور جب اس زمانہ کے لوگوں کا یہ حال ہے تو صحابہ کا تو کہنا ہی کیا۔ قلت سامان تو (مکہ میں جہاد کا حکم نہ ہونے کی) وجہ تھی نہیں۔ محققین نے اس کی تصریح کی ہے۔

احقر نے عرض کیا کہ پھر کیا وجہ تھی؟ ارشاد فرمایا کہ۔

گو قلت سامان کے علاوہ وہ دوسرے بھی مصالح ہوں گے مگر میرے نزدیک اس کی

وجہ یہ تھی کہ مکہ میں مسلمانوں کا کوئی مرکز نہ تھا۔ اور جہاد کے لئے مرکز ضروری ہے اور ہجرت کے بعد مسلمانوں کو مدینہ پہنچ کر مرکز حاصل ہو گیا بس یہ وجہ تھی کہ ہجرت سے قبل مکہ میں قتال کی اجازت نہ ہوئی۔ اور مدینہ پہنچ کر اجازت ہو گئی۔ (شریعت وسیاست ص ۴۴)

جہاد کی بنیادی شرائط

۱:۔ جہاد کے لئے مرکز ضروری ہے۔ لہٰذا سخت ضرورت ہے کہ مسلمانوں کا کوئی مرکز قائم ہو۔

۲:۔ دوسری چیز یہ ہے کہ کوئی امیر المومنین ہو خواہ وقتی ہی ہو، اور جس کو امیر المومنین بنایا جائے اس کے اندر تین صفات ہوں۔

۳:۔ تدین (یعنی دینداری)

۴:۔ دوسرے سیاست سے واقف ہو۔

۵:۔ تیسرے یہ کہ اس کے اندر ہمت ہو۔

اب مشکل یہ ہے کہ بعض کے اندر تدین تو ہے مگر سیاست سے واقفیت نہیں اور بعض کے اندر ہمت نہیں۔ امیر کے اندر ان تینوں صفات کا ہونا ضروری ہے۔ اس کام میں ضرورت ہے اتفاق کی .... اس کے لئے ارادت کافی نہیں، قہر وقوت کی ضرورت ہے اور وہ قوت امیر المومنین ہے اور اس وقت مسلمانوں کا کوئی امیر یا سردار نہیں جو ان کی قوت کو ایک مرکز پر جمع رکھ سکے جو روح ہے اس کام کو کرنے کی سب سے بڑا اور اہم مسئلہ یہ ہے۔ (الافاضات ص ۱۱۹)

☆ نصب خلیفہ (یعنی امیر المومنین مقرر کرنا) واجب ہے لیکن واجب کے لئے قدرت شرط ہے۔ اور قدرت اس وقت مفقود ہے اس واسطے گو عالم اس وقت خلیفہ سے خالی ہے لیکن بایں حالات خلیفہ کے نہ ہونے سے کوئی گناہ نہیں۔ (الکلام الحسن ص ۱۵)

اگر کامیابی کی توقع غالب نہ ہو تو ایسے افعال جائز نہیں۔ نہ ان میں اجر ہے۔ (واعظ التفسیر ۱۴۹)

☆ (اس کام میں) ضرورت ہے اتفاق کی حدوثاً بھی، بقاءً بھی (یعنی ابتداً بھی اور دواماً بھی) اول تو مجھ کو حدوث اتفاق ہی میں کلام ہے۔ لیکن علی سبیل التنزل اگر مان بھی لیا جائے تو بقاء کا کون ذمہ دار ہے اسی لئے کہ بقاء کے لئے ارادت کافی نہیں۔ قہر وقوت کی ضرورت ہے اور وہ قوت امیر المومنین ہے اور اس وقت مسلمانوں کا کوئی امیر یا سردار نہیں جو

ان کی قوت کو ایک مرکز پر جمع رکھ سکے، جو روح ہے اس کام کے کرنے کی۔

خلاصہ یہ کہ مسلمانوں کا کوئی امیر المومنین ہو سب سے بڑا اور اہم مسئلہ یہ ہے۔ (الافاضات الیومیہ ص ۱۱۹)

شعائر اسلام، مقامات مقدسہ، مساجد، مقابر کی حفاظت مسلمانوں کے ذمہ ضروری ہے

کفار کی مدافعت مطلقا اہل اسلام سے اور خصوصاً سلطنت اسلامیہ اور پھر خصوصاً شعائر اسلام سے جن میں مقامات مقدسہ خصوصا حرمین شریفین اور دیگر مساجد بھی داخل ہیں (ان سب کی حفاظت) سب مسلمانوں پر فرض ہے کبھی علی العین (یعنی ہر فرد پر) کبھی علی الکفایہ جیسے حالات ہوں۔

مگر اس کی فرضیت کے کچھ شرائط بھی ہیں جو کتب فقہ میں مذکور ہیں ان شرائط میں سے ایک شرط استطاعت بھی ہے (یعنی قدرت و طاقت) اور استطاعت سے مراد استطاعت لغویہ نہیں استطاعت شرعیہ ہے جس کو اس حدیث نے صاف کر دیا۔

من رای منکم منکراً فلیغیره بیده (جو کسی منکر کو دیکھے اسے چاہئے کہ وہ اس کی اصلاح کر دے اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے اصلاح کر دے، اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے برا سمجھے۔

ظاہر ہے کہ زبان سے طاقت ہر وقت حاصل ہے پھر اس کے نہ پائے جانے کی صورت کب ہو گی۔ اس سے ثابت ہوا کہ استطاعت سے مراد یہ ہے کہ اس میں ایسا خطرہ نہ ہو جس کی مقاومت (یعنی مقابلہ کرنا بظن غالب عادۃً ناممکن ہو۔

اسی طرح ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس دفاع کے بعد اس سے زیادہ شر میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اور اگر ایسا خطرہ ہو تو پھر وجوب تو ساقط ہو جائے گا۔ باقی جواز میں تفصیل ہے۔ یعنی واجب تو نہ ہو گا اور بعض صورتوں میں جائز بھی نہیں ہو گا۔ اور بعض صورتوں میں جائز بلکہ مستحب ہو گا۔ اور جواز وعدم جواز یا مستحب کی بنیاد اجتہاد و رائے پر ہے۔ پس اس میں

اختلاف کی گنجائش ہے اور جواز یا استحباب پر متفق ہونے کے باوجود ایک نے رخصت پر عمل کیا دوسرے نے عزیمت پر تو کسی کو اس پر ملامت کرنے کا حق نہیں۔ ان سب کے شرعی دلائل کتب فقہ کے حوالہ جات اصل کتاب ص ۱۵ میں ملاحظہ فرمائیں۔

سرکاری عہدے اور ملازمتیں حاصل کرنے کی ضرورت

اس وقت مسلمانوں کے لئے مناسب ہے کہ وہ ایسی حکومتیں (اور عہدے) قبول کرلیا کریں اور یہ اس قاعدہ میں داخل ہے کہ اشد المفسدین کو دفع کرنے کے لئے اخف المفسدین (یعنی بڑے مفسدہ اور نقصان سے بچنے کے لئے چھوٹے مفسدہ اور چھوٹے نقصان کو) اختیار کرلیا جاتا ہے۔ اور ہے تو یہ بھی برا اور غلط لیکن دوسرے مفسدہ کے بہ نسبت پھر بھی اخف (ہلکا) ہے اور وہ بڑا مفسدہ یہ ہے کہ ہماری قوم (مسلمان) بالکلیہ دوسروں سے مغلوب نہ ہوجائے۔ کیونکہ اگر ہم بھی حاکم ہوں گے تو ہم پر ظلم کم ہوگا۔ پس اس نیت سے اگر عہدہ لے لے تو اس میں بڑی مصلحت (حسن العزیز ص ۱۵۸ ج ۳)

(الغرض اس قسم کے عہدوں کو) اگر مضرت (نقصان) کو دفع کرنے کی غرض سے اختیار کیا جائے تاکہ امت مسلمہ پر کفار کی طرف سے جو مظالم اور مضرتیں (مصیبتیں و دشواریاں) پہنچتی ہیں اہل مناصب (یعنی یہ عہدیدار) بقدر امکان اگر ان کو دفع نہ کرسکیں تو کم از کم تقلیل و تخفیف (یعنی کمی تو) کرسکیں تو اس صورت میں جواز کی گنجائش ہے۔

سوال:۔ خفیہ پولیس کی ملازمت جائز ہے یا نہیں؟

جواب:۔ اس نیت سے جائز ہے کہ میں لوگوں کو نقصان سے بچاؤں گا یا اس نیت سے کہ دوسرا جو نقصان پہنچاتا ہے اس سے کم پہنچے گا (یعنی اس کے مقابلے میں مجھ سے نقصان کم پہنچے گا۔ دوسروں سے زیادہ پہنچے گا۔ (حسن العزیز ص ۴/ ۱۶۰)

ناجائز ملازمتوں کے حاصل کرنے کے مسئلہ میں تفصیل

اس مسئلہ میں تفصیل ہے جو لوگ ان حکومتوں (ناجائز منصب اور عہدوں) کو اختیار کرتے ہیں۔ دیکھنا چاہئے کہ ان کے قبول کرنے سے خود ان کو یا عام مسلمانوں کو کوئی شدید

نقصان لاحق ہونا غالب ہے یا نہیں؟

دوسری صورت میں (یعنی جب کہ نقصان غالب نہ ہوا) ان حکومتوں (عہدوں) کا قبول کرنا جائز نہیں۔ اور اول صورت میں دیکھنا چاہئے کہ آیا اس شخص کی نیت اس نقصان کے دفع کرنے کی ہے (جس کا مسلمانوں کو خطرہ ہوتا رہتا ہے) یا محض مال و جاہ کے نفع حاصل کرنے کی نیت ہے پہلی نیت ہو تو جواز کی گنجائش ہے اور دوسری نیت ہو تو ناجائز۔

پس کل تین صورتوں میں سے صرف ایک صورت میں (یعنی جب کہ ضرر دفع کرنے کی نیت سے منصب حاصل کیا جائے۔ اس میں) جواز کی گنجائش ہوئی (باقی دو صورتوں میں نہیں) اور آیت کا محمل (**ومن لم یحکم بما انزل فاولئک هم الظالمون** (اس آیت کا مصداق) بقیہ دو صورتیں ہوں گی (نہ کہ پہلی) خصوصاً اگر جائز و مستحسن سمجھے تو کفر ہے۔ البتہ اگر دو ناجائز صورتوں میں بھی سلطنت کی طرف سے مجبور کیا جائے اور عذر قبول نہ کیا جائے تو پھر ان میں بھی گنجائش ہے لیکن ہر حال میں جہاں تک ممکن ہو خلاف شریعت سے بچنے کی کوشش کرے۔ (امداد الفتاویٰ سوم)

غیر مسلموں کے حقوق اور ان کے ساتھ حسن سلوک

بعض حقوق محض مشارکت نوعی کی وجہ سے ثابت ہو جاتے ہیں یعنی صرف آدمی ہونے کی وجہ سے ان کی رعایت واجب ہوتی ہے۔ گو مسلمان نہ ہوں وہ یہ ہیں۔

۱:۔ بے گناہ کسی کو جانی یا مالی تکلیف نہ دیں۔

۲:۔ شرعی وجہ کے بغیر کسی کے ساتھ بدزبانی نہ کرے۔

۳:۔ اگر کسی کو مصیبت فاقہ مرض میں مبتلا دیکھے اس کی مدد کرے کھانا پانی دے دے اور علاج معالجہ کر دے۔

۴:۔ جس صورت میں شریعت نے سزا کی اجازت دی ہے اس میں بھی ظلم و زیادتی نہ کرے، اس کو ترسائے نہیں۔

کفار کے ساتھ تعلق رکھنے کی تین صورتیں

کفار کے ساتھ تین قسم کے معاملے ہوتے ہیں، موالات یعنی دوستی مداراۃ، یعنی

ظاہری خوش خلقی، مواسات یعنی احسان اور نفع رسانی ان کی تفصیل یہ ہے کہ:

ا:۔ موالات (یعنی قلبی دوستی) تو کسی حال میں جائز نہیں۔

۲۔ اور مدارات تین حالتوں میں درست ہے۔ ایک دفع ضرر (یعنی نقصان سے بچنے) کے واسطے، دوسرے اس کافر کی مصلحت دینی یعنی ہدایت کی توقع کے واسطے، تیسرے اکرام ضیف (یعنی مہمان کے احترام) کے لئے۔

۳:۔ مواساۃ (یعنی کفار کے ساتھ حسن سلوک) اور ان کو نفع پہنچانے کا حکم یہ ہے کہ اہل حرب (یعنی جن سے لڑائی ہے جو لڑنے مرنے والے ہیں ان) کے ساتھ ناجائز ہے اور غیر اہل حرب کے ساتھ جائز ہے۔

کافروں کی مدد کرنے کے متفرق احکام

موالات بمعنی نصرت یعنی کفار کی مدد کرنا اگر اسلام کے حق میں مضر (یعنی نقصان دہ) ہو تو مطلقاً ناجائز ہے خواہ نقصان کا ارادہ ہو یا نہ ہو۔ اور جس مدد سے اسلام کو نقصان نہ ہو مگر وہ خود ناجائز ہو (جیسے شراب جوئے وغیرہ میں کافر کی مدد کرنا) اس میں بھی نصرت ناجائز ہے۔ اور اگر اس مدد سے اسلام کا نقصان بھی نہ ہو اور وہ فعل مباح (یعنی جائز) بھی ہو اگر بلا اجرت کے ہے تو اس کا حکم مواساۃ کا ہے جس کا حکم ابھی گزر چکا۔

موالات اور کفار سے تعلقات رکھنے کے متفرق احکام

ا:۔ ''حقیقی موالات'' یعنی قلبی دوستی ہر کافر سے مطلقاً حرام ہے اس میں ذمی (جو اسلامی حکومت کی ماتحتی میں رہتے ہوں) حربی محارب مسالم (یعنی لڑنے والے کفار اور صلح وامن کے ساتھ رہنے والے کفار، اس حکم میں سب برابر ہیں۔

۲:۔ ''صوری موالات'' بمعنی ظاہری دوستی یعنی ایسا برتاؤ جیسا دوستوں سے ہوتا ہے جس کو ''مدارات'' کہتے ہیں، اپنی مالی مصلحت ونفع کے لئے تو درست نہیں خصوصاً جب کہ دینی نقصان کا بھی خطرہ ہو تو بدرجہ اولیٰ یہ اختلاط حرام ہوگا۔

البتہ یہی مدارات رفع مضرت (یعنی نقصان سے بچنے اور دور کرنے کے لئے)

درست ہے۔اسی طرح ہدایت کی توقع کے لئے بھی مدارات کرنا درست ہے۔

۳:۔مواسات یعنی احسان ونفع رسانی (یعنی کفار کونفع پہنچانا) اہل حرب کے ساتھ (یعنی لڑنے مرنے اور مسلمانوں کونقصان پہنچانے والے کافروں کے ساتھ) ناجائز ہے اور غیر اہل حرب (یعنی جو ایسے نہ ہوں) ان کے ساتھ جائز ہے۔

۴:۔حربیوں (یعنی لڑنے والے کفار کے ساتھ) کسی خاص موقع پر احسان کرنے میں اسلام کی مصلحت ہو، یا اس کے اسلام کی توقع ہو تو یہ صورت اس سے مستثنیٰ ہے (یعنی ایسے وقت حربیوں کے ساتھ احسان کرنا بھی درست ہے)۔

اسی طرح کسی حربی کی اضطراری حالت ہو مثلاً بھوک پیاس یا گر جانے سے ہلاکت کے قریب ہو تو یہ صورت بھی مستثنیٰ ہے (یعنی عام حالات میں ایسے حربی کافر کی جان بچائی جائے گی۔البتہ خاص حالات یعنی لڑنے کی حالت میں نہیں)

نوٹ:۔دلائل وفقہی عبارات اصل کتاب میں ملاحظہ فرمائیں۔

افادات اشرفیہ ص ۱۱۱ اشرف السوانح ص (۳/۱۷۱)

کافروں کے ساتھ ہمدردی حسن سلوک کی ترغیب

سوال:۔خیر خیرات کے ذریعہ غیر قوموں کے ساتھ (یعنی کافروں کے ساتھ) سلوک کرنا درست ہے یا نہیں؟

فرمایا اس میں تفصیل ہے وہ یہ کہ صدقات واجبہ (مثلاً زکوٰۃ) میں اہل اسلام کی تعیین ہے وہ تو غیر مسلم کو دینے سے ادا ہی نہیں ہوتے۔

اور صدقات نافلہ میں حاجت پر مدار ہے۔مسلم اور غیر مسلم میں اول وجہ ترجیح حاجت ہے (یعنی جو زیادہ حاجت مند ہوگا وہ مقدم ہوگا) مثلاً ایک کافر مرا جاتا ہے اور ایک مسلمان بھی موجود ہے جس کو اتنی حاجت نہیں تو ایسے موقع پر یہ چاہئے کہ مسلمان کو چھوڑ کر اس کافر کو کھلایا جائے۔

حاجت وضرورت کے وقت ترجیح اہل حاجت کو ہے خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔یہ اسلام کے صدق اور غیر متعصب ہونے کی دلیل ہے کہ کافر جو مسلمانوں کا دشمن ہے اس کو کھلائیں

مجاہدہ اسی کو کہتے ہیں۔ (حسن العزیز ص ۴/۴/۲۷)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ صدقات مطلقاً (یعنی نافلہ بھی) غیر مسلم کو نہ دیئے جائیں بہت سے صحابہ کفار کو اس مصلحت سے خیرات نہ دیتے تھے کہ شاید اسی تدبیر سے کچھ لوگ مسلمان ہو جائیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی رائے دی تھی۔ اس پر آیت اتری لیس علیک ھداھم ولکن اللہ یھدی من یشاء

اس آیت میں دونوں طرح کے خطاب کر کے ارشاد فرماتے ہیں کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کافروں کو ہدایت پر لے آنا کچھ آپ کے ذمہ فرض واجب نہیں، یہ تو خدا تعالیٰ کا کام ہے جس کو چاہیں ہدایت پر لے آئیں.......... اور اے مسلمانو! جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اپنے فائدہ کی غرض سے کرتے ہو۔ حق تعالیٰ کی رضامندی کے سوا کسی اور غرض سے خرچ نہیں کرتے۔ اور یہ غرض ہر حاجت مند، ضرورت مند، کی حاجت پوری کرنے سے حاصل ہوتی ہے پھر مسلمان فقیر کی تخصیص کیوں کی جائے، تم کو اپنے عوض (یعنی اللہ کی رضامندی اور آخرت کے ثواب) سے مطلب رکھنا چاہئے اور یہ عوض ہر حال میں ملے گا۔ پھر تم کو اس سے کیا بحث کہ ہمارا صدقہ مسلمان ہی کو ملے، کافر کو نہ ملے۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ ملتوی فرما دیا۔

مسئلہ: حربی کافر کو کسی قسم کا صدقہ وغیرہ دینا جائز نہیں۔

مسئلہ: کافر، ذمی یعنی غیر حربی (جو لڑنے والا، مسلمانوں کو نقصان پہنچانے والا نہ ہو) اس کو صرف زکوٰۃ عشر دینا جائز نہیں اور دوسرے صدقات واجبہ و نفل سب جائز ہیں۔ اور آیت میں زکوٰۃ داخل نہیں۔ (بیان القرآن بقرہ ص ۱......۱۶۴۔ حسن العزیز ص ۴/۲۷)

غیر مسلموں کے ساتھ برتاؤ کی تین صورتیں

کفار کے ساتھ مسلمانوں کے برتاؤ تین قسم کے ہو سکتے ہیں۔

محبانہ (یعنی قلبی دوستی) محسنانہ (یعنی حسن سلوک اور رواداری) منصفانہ (یعنی عدل وانصاف)

پہلی قسم مطلقاً (ہر حال میں) کسی کافر کے ساتھ جائز نہیں۔ خواہ ذمی ہو یا حربی، اہل

کتاب ہو یا مشرک، اس کی ممانعت سورۃ ممتحنہ کی شروع کی آیات میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے اس کے علاوہ اور بھی دوسری آیات میں مذکور ہے۔

اور تیسری قسم کا برتاؤ (یعنی عدل وانصاف) ہر قسم کے کفار کے ساتھ جائز بلکہ واجب ہے اور اس کے خلاف کرنا جائز نہیں اور یہ امر ونہی دونوں اس آیت میں ہیں۔

لایجر منکم شنان قوم علی ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی.

ترجمہ:۔ اور کسی خاص گروہ کی عداوت تم کو اس پر آمادہ نہ کردے کہ تم عدل (انصاف) نہ کرو۔ عدل کیا کرو کہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔

اور دوسری قسم کے تعلقات بعض کفار کے ساتھ جائز نہیں (اور بعض کے ساتھ جائز ہیں) سورۃ ممتحنہ کی آیات میں اس کی تفصیل مذکور ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ محسنانہ برتاؤ ذمی کفار، یا معاہد ومصالح (یعنی صلح ومعاہدہ کر کے ساتھ رہنے والوں) کے ساتھ جائز ہے۔ حربی (لڑنے مرنے والے دشمن اسلام) کے ساتھ جائز نہیں۔ (البدائع ص ۷ ابدیہ ٦)

غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک ورواداری

لاینھکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین......الی قولہ تعالیٰ فاولٓئک ھم الظالمون.

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے، اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔ اس سے مراد وہ کافر ہیں جو ذمی یا مصالح (یعنی صلح کرنے والے صلح پسند) ہوں، یعنی حسن سلوک کا برتاؤ ان سے جائز ہے۔ مصالحت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے ساتھ احسان سے دریغ نہ کیا جائے اور مطلق انصاف تو ہر کافر بلکہ جانور کے ساتھ بھی واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔

البتہ صرف ان لوگوں کے ساتھ دوستی یعنی احسان کرنے سے اللہ تعالیٰ تم کو منع کرتا ہے جو تم سے دین کے بارے میں لڑے ہوں اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ہو اور اگر نکالا بھی نہ ہو

لیکن تمہارے نکالنے میں نکالنے والوں کی مدد کی ہو یعنی ان کے ساتھ شریک ہوں اور جو شخص ایسوں سے دوستی کا برتاؤ کرے گا سو وہ لوگ گنہگار ہوں گے۔ (بیان القرآن ملخصاً ص ۱۱/۱۳۳)

کافر کے ساتھ ہمدردی

کفار کو زکوٰۃ کے علاوہ اور صدقہ دینا بھی جائز کر دیا گیا ہے، موت کے وقت کافر کو پانی پلانا درست ہے۔ کفار سے ملنے میں بھی رحمت کی رعایت کی گئی ہے۔ کتنی بڑی رحمت ہے کہ نافرمانوں پر بھی رحم کرنے کا حکم ہے۔ ہاں جس کافر نے ضرر (نقصان) پہنچایا ہو اس کے لئے دوسرا حکم ہے۔

واخرجوھم من حیث اخرجوکم (التبلیغ شب مبارک ص ۸/۳۵)

ترجمہ:۔ اور ان کو نکال باہر کو۔ جہاں سے انہوں نے تم کو نکلنے پر مجبور کیا ہے۔

سنبھل کر دوستی کرو

بعض بدفہم اور کم سمجھ مسلمان غیر مسلموں کو اپنا دوست سمجھ کر ان کے بغلوں میں جا کر گھستے ہیں (ان سے اپنے راز بیان کرتے ہیں) ان ناعاقبت اندیشوں کو معلوم بھی ہے کہ بزرگوں کا مقولہ ہے۔ ''کہ نادان دوست سے دانا دوست اچھا ہوتا ہے'' اور جو نادان بھی ہو اور دشمن بھی تب کیا کہنا۔ (ملفوظات ص ۱۸۷)

جو شخص حکومت یا سلطنت کے باغیوں سے میل جول رکھتا ہے۔ یا ان کو امداد پہنچاتا ہے، وہ شخص بھی باغیوں ہی میں شمار کیا جاتا ہے ہم جس کے وفادار ہیں وفاداری اسی وقت تک ہے کہ ہم اس کے دشمنوں سے نہ ملیں۔ (ص ۴۹، ۵۱۹)

دوست سے سنبھل کر دوستی کرو، زیادہ میل جول نہ کرو، شاید کسی دن دشمن ہو جائے، تو گھر کے بھیدی (رازدار) کی دشمنی بہت نقصان دہ ہوتی ہے۔ اور اگر کسی کو اپنے دوست کے متعلق دشمنی کا احتمال نہ ہو تو وہ اپنے ہی متعلق یہ احتمال رکھے کہ شاید کہ کسی دن میں ہی بدل جاؤں۔ اس لئے اتفاق میں بھی احتیاط کی ضرورت ہے۔

اسی طرح اگر کسی سے عداوت کرو، وہاں بھی حد کے اندر عداوت کرنا چاہئے، حد سے نہ بڑھے کیونکہ کیا خبر ہے کسی وقت پھر دوستی کرنے کی ضرورت ہو تو اس وقت آنکھیں سامنے کرنے سے شرم آئے۔ (الانسداد ص ۵۱۲)

الکفر ملۃ واحدۃ

کافر جتنے ہیں سب اسلام کے دشمن ہیں، کوئی گورا ہو یا کالا، دونوں سانپ ہی ہیں بلکہ گورے سانپ سے کالا سانپ زیادہ زہریلا ہوتا ہے اگر گورے سانپ کو گھر سے نکال بھی دیا، کالا ڈسنے کو موجود ہے۔ جس کا ڈسا ہوا زندہ رہنا ہی مشکل ہے۔ (الافاضات ص ۶/ ۱۹۷)

جب تک ہم کلمہ پڑھتے ہیں، تمام غیر مسلم ہمارے دشمن ہیں۔ اس میں کالے گوروں کی کچھ قید نہیں۔ مسلمانوں میں جو بڑے بڑے خوشامدی ہیں وہ (غیر مسلم) ان کو بھی اپنا دوست نہیں سمجھتے۔ (الافاضات ص ۵/ ۷/ ۱، ملفوظ ص ۲۸۸)

گو کفار اپنی کسی مصلحت سے مسلمانوں کی کچھ رعایت کریں مگر یہ یقینی بات ہے کہ وہ اسلام کو اپنے لئے مضر سمجھتے ہیں۔ اور اس واسطے اس کے مٹانے کی فکر میں ہیں۔

بعض لوگ کفار کی ایک جماعت کو برا کہتے ہیں اور بعض دوسری جماعت کو۔ میں کہتا ہوں کہ دونوں برے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ ایک نجاست مرئیہ اور ایک نجاست غیر مرئیہ (یعنی ایک گندگی، ناپاکی ظاہر ہے ایک کی پوشیدہ ہے مگر) ہیں دونوں نجاست۔ (الافاضات ص ۲/ ۳۰۲)

کفار مشرکین کے ہدایہ تحائف خصوصاً دیوالی وغیرہ کے موقع پر لین دین کا حکم

سوال:۔ ہندو اپنے تہواروں میں اگر مسلمانوں کو بطور ہدیہ کے کچھ دیں مثلاً دیوالی کے موقع پر اکثر ہندو مسلمانوں کے یہاں مٹھائی وغیرہ لایا کرتے ہیں ان کا قبول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

اور اگر کوئی شخص قبول کر کے کسی دوسرے کو کھلانا چاہے تو اس شخص کو اس کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

اگر کفار خاص اپنے تہوار کے لئے کوئی خاص مٹھائی بنائیں، مثلاً کھلونے وغیرہ تو اس کا دوکان سے خریدنا جائز ہے یا نہیں۔ مسلمانوں اور کافروں کے درمیان مطلقاً ہدیہ کا لین دین جائز ہے یا نہیں۔

الجواب:۔ ان روایات کا فقیہہ سے مہادات مسئول عنہا (یعنی ہدیہ سے متعلقہ سوالات) کے احکام کی تفصیل معلوم ہوگئی۔ کہ اگر کوئی دینی ضرر (نقصان) نہ ہو تو کفار

مصالحین سے (یعنی غیر حربی کافروں سے) ہدایا کا لین دین جائز ہے۔ اور اس سے اکثر سوال کا جواب ہو گیا (یعنی یہ کہ ہر صورت میں جواز ہے بشرطیکہ دینی نقصان نہ ہو)

صرف دو جزو خاص قابل تعرض باقی رہ گئے۔ ایک یہ کہ دیوالی کا ہدیہ شاید اس تہوار کی تعظیم کے لئے ہو جس کو فقہاء نے سخت ممنوع لکھا ہے۔ دوسرا یہ کہ اس میں تصویریں بھی ہوتی ہیں ان کا احترام واستعمال لازم آتا ہے تو اس میں بھی شرعی حکم کا معارضہ ہے۔ اول کا جواب یہ ہے کہ یہ عادت سے معلوم ہے کہ اس ہدیہ کا سبب مہدی لہ (یعنی جس کو ہدیہ دیا جاتا ہے) اس کی تعظیم ہے نہ کہ تہوار کی تعظیم۔

اور ثانی کا جواب یہ ہے کہ مقصود اہداء (یعنی ہدیہ دینے میں مقصود) صورت نہیں بلکہ مادہ ہے۔ البتہ یہ واجب ہے کہ مہدی لہ فوراً تصاویر کو توڑ ڈالے۔ (امداد الفتاویٰ ص ۴۸۲)

غیر مسلموں کی بھیجی ہوئی افطاری کا حکم

ایک صاحب نے دریافت کیا کہ ہندو اگر افطاری میں مٹھائی بھیجے تو اس کا کھانا کیسا ہے؟

فرمایا فتویٰ کی رو سے تو جائز ہے مگر مجھ کو غیرت آتی ہے کہ آئندہ یوں کہنے لگیں کہ اگر ہم مدد نہ کرتے تو کیسے بہار ہوتی۔

مسجد میں ایسے موقع پر ان کے شریک کرنے سے دو خرابیاں ہیں۔ ایک تو امتنان (یعنی کافر کا احسان) دوسرے مسلمانوں میں کرم (وسخاوت کا مزاج) غالب ہے۔ اور سوچتے سمجھتے ہیں۔ نہیں پھر ان کے تہواروں میں مدد دینے لگتے ہیں۔ اور ہندوؤں کا طریقہ یہ ہے کہ اول تو احسان کرتے ہیں پھر اپنا کام بناتے ہیں۔ (ملفوظات اشرفیہ ص ۱۰۳ مطبوعہ پاکستان)

کافروں سے معاملات یعنی خرید وفروخت اور ملازمت کرنے کا حکم

جن معاملات میں کوئی ناجائز کام نہ کرنا پڑے کفار کے ساتھ درست ہیں خواہ کافر ذمی ہو یا حربی، مسالم ہوں یا غیر مسالم البتہ وہ معاملات اس سے مستثنیٰ ہیں جن کی ممانعت صراحتاً ہے جیسے غیر کتابی سے نکاح کرنا، باقی دوسرے معاملات درست ہیں مثلاً ان کی نوکری کرنا،

ان کونوکر رکھنا، ان سے قرض لینا، ان کے پاس رہن (گروی) رکھنا، ہدیہ دینا، ان سے کچھ خریدنا، ان کے ہاتھ کوئی چیز بیچنا اوران معاملات کو غیر کی مناصرت ومعاونت کہنا بلا دلیل ہے ورنہ فقہا ان کو جائز نہ فرماتے۔

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ان معاملات سے مقصود اپنی مصلحت ہے نہ کہ کفار کی یا اگر ان کی بھی مصلحت ہو تو وہ اسلام کے حق میں مضر نہیں۔ (الروضۃ الناضرۃ ص ۱۲)

کافروں سے خدمت لینے اوران کی خدمت کرنے کا شرعی حکم

کافروں سے خدمت لینا اگر وہ اس طور پر ہو کہ وہ مسلمانوں کا بالکل تابع ہو اور عذر (دھوکہ) کا بھی احتمال نہ ہو تو جائز ہے۔ اور اگر برابری یا متبوعیت کے طور پر ہو (اس طرح کہ مسلمان کافر کے تابع ہو) یا دھوکہ کا احتمال ہو تو اسلام کا نقصان پہنچنے کے احتمال کی وجہ سے ناجائز ہے۔

البتہ مجبوری کے حالات اس سے مستثنیٰ ہیں یعنی جہاں مسلمان محکوم (اور کافر حاکم) ہوں۔ (الروضۃ الناضرہ ص ۱۲، اشرف السوانح ص ۱۷۱)

ہندوؤں کی دکان سے مٹھائی وغیرہ سامان خریدنا

سوال:۔ ہندوؤں کی دکان سے مٹھائی وغیرہ خریدنا اور ان کے یہاں کا کھانا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر ظاہر میں کوئی نجاست نہ ہو تو جائز ہے لیکن اس پر بھی اگر اپنے مسلمان بھائی کو نفع پہنچائے تو زیادہ بہتر ہے۔ (امداد الفتاویٰ ص ۱۴۱)

کافروں کے گھر کا ان کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا کھانا

کافروں کی نجاست باطنی ہوتی ہے جو ظاہری طہارت کے منافی نہیں پس جو احکام ظاہری طہارت کے متعلق ہیں وہ سب ثابت ہوں گے۔ وہ پانی پلائے یا احتیاط سے کوئی حلال کھانا پکا کر کھلائے وہ کھانا پینا جائز اور حلال ہوگا۔

ہاں اگر کوئی یوں سمجھے کہ ہندو باوجود یہ کہ اہل باطل ہیں اور ہم سے جو کہ اہل حق ہیں ذلیل و ناپاک سمجھ کر پرہیز کرتے ہیں تو اس کی پاداش میں ہم بھی ان سے احتراز رکھیں اس

احتیاط کا کچھ مضائقہ نہیں۔الحق یعلو ولا یعلیٰ (امدادالفتاویٰ ص ۱۱۵)

سوال:۔ جو ہندو مسلمان کو برا اور ذلیل سمجھتے ہیں ان کے گھر کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ گناہ تو نہیں مگر بے غیرتی ہے۔(امدادالفتاویٰ ص ۲۷)

غیر مسلم کے ساتھ ایک برتن میں کھانا کھانا

سوال:۔ کسی عیسائی کے ساتھ کھانا کھا سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر ایک پیالہ اور ایک ہی رکابی میں کھایا جائے تو ایسی حالت میں کیا حکم ہے۔ کیا ساتھ کھانے سے اتحاد ہوتا ہے اور کیا ان لوگوں سے اتحاد منع ہے؟

الجواب:۔ کافروں سے بلا ضرورت اختلاط وارتباط ممنوع ہے اور (ساتھ) کھانا کھانا بے ضرورت اختلاط و ارتباط ہے (اس لئے منع ہے) (البتہ ضرورت کے وقت گنجائش ہے)۔(امدادالفتاویٰ ص ۴/۲۷۱)

مدرسہ و مسجد میں غیر مسلم کا چندہ لینا

ایک صاحب نے دریافت کیا کہ اگر کوئی ہندو مسجد میں کوئی امداد رقم دے دے تو لینا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس رقم کو مسجد کی تعمیر میں صرف کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:۔ فرمایا جائز ہے۔ پھر فرمایا کہ اگر لیا جائے تو دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ دینے والے ایسے نہ ہوں کہ دے کر احسان جتلا دیں دوسرے یہ کہ اس سے مسلمان متاثر ہو ان کے مذہبی چندہ میں شریک نہ ہونے لگیں۔ اس خیال سے کہ انہوں نے ہمارے یہاں چندہ دیا تھا۔ ہم کو بھی دینا چاہئے ممکن ہے کہ وہ مندر بنانے لگیں تو وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے مسجد میں دیا تھا تم مندر میں دو تو ایسی جگہ چندہ لینا بھی جائز نہیں۔ اور اگر ان باتوں کا اندیشہ نہ ہو تو لے لیا جائے کوئی ہرج نہیں اور یہ قرائن سے معلوم ہو سکتا ہے عرض کیا گیا کہ اس کا تو احتمال ہے کہ شاید ایسا ہو کہ وہ اپنے مذہبی چندہ میں شریک کریں۔ فرمایا تو ایسی صورت میں لینا جائز نہیں۔ (الافاضات الیومیہ ص ۲/ ۹۸)

شریعت وسیاست

ازافادات حکیم الامت مجدد ملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قال له موسیٰ انک لغوی مبین (القصص:۱۸)

موسیٰ علیہ السلام اس سے فرمانے لگے بے شک تو صریح بدراہ ہے۔

کاملین کی سیاست میں عدو کامل ہوتا ہے

اس پردال ہے کہ کاملین جس طرح عدو پر سیاست کرتے ہیں دوست پر بھی کرتے ہیں جیسا کہ دونوں کے حال کا مقتضا ہوتا ہے سو آپ کا قول "انک لغوی مبین" سبطی پر سیاست تھی اور ارادہ بطش قبطی پر سیاست ہے غرض ان میں عصبیت قومی نہیں ہوتی عدل کامل ہوتا ہے۔ (مسائل السلوک)

فلن اکون ظهیر اللمجرمین سو کبھی میں مجرموں کی مددنہ کروں گا (القصص آیت نمبر ۱۷)

اہل اللہ ظالم کے لئے کبھی عہدہ حکومت کی دعانہیں کرتے

اس سے معلوم ہوا کہ ظالمین کی معونت جائز نہیں اور چونکہ عہدہ حکومت کی دعا کرنا یہ بھی ایک معونت ہے اس لئے اہل اللہ ظالم کے لئے ایسی دعانہیں کرتے اور اگر شدید ضرورت ہو تو اس میں یہ قید لگادیتے ہیں اگر خیر ہو جیسے استخارہ میں اسی قید سے دعا ہوتی ہے۔ (مسائل السلوک)

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الناس تبع لقريش في هذا الشان مسلمهم تبع لمسلمهم و كافرهم تبع لكافرهم

ترجمہ:۔ فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آدمی تابع ہیں قریش کے اس شان ان کا مسلمان ان کے مسلمان کے تابع ہے اور ان کا کافر ان کے کافر کے۔

حکومت کا استحقاق قریش کو ہے

یعنی حکومت کا استحقاق قریش کو ہے جاہلیت میں بھی یہ لوگ حاکم ورئیس رہے اور اسلام

میں بھی حق خلافت ان ہی کے لئے مقرر رہا مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھ جائے کہ حاکم اسلام اگر قریشی نہ ہو تو اس کی اطاعت واجب نہ ہوگی۔ غایۃ مافی الباب یہ کہ اصطلاح شرع میں اس کو امام وخلیفہ نہ کہیں گے مگر وجوب اطاعت کا مستحق ہونا امام وخلیفہ ہی کے ساتھ کسی دلیل سے ثابت نہیں بلکہ احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وجوب اطاعت کے لئے امارت وسلطنت بھی کافی ہے یعنی مسلمان حاکم وسلطان کی بھی اطاعت واجب ہے اور اس کی بغاوت اور مخالفت جائز نہیں اگر چہ وہ فاسق اور ظالم ہی کیوں نہ ہو۔ صحیح مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے ”من یطع الامیر فقد اطاعنی ومن یعص الامیر فقد عصانی“ اور مسلم میں ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ ان خلیلی صلی اللہ علیہ وسلم اوصانی ان اسمع واطیع وان کان عبداجدع الاطراف اور مسلم میں عبادہ بن الصامت سے روایت ہے ”ولاتنازع الامر اھلہ قال الا ان تروکفراً بواحاً عندکم من اللہ فیہ برھان“ اس اخیر حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کفر سے وہ واجب الاطاعت نہیں رہتا۔ سلف کی مخالفت بعض امراء سے اسی بنا پر تھی کہ ان کی رائے میں کفران کا محقق ہوگیا تھا اور جن کو ثابت نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے سکوت کیا البتہ اگر یہ امیر کوئی خلاف شرع بات کرانا چاہے تو اس خاص مقدمہ میں اطاعت واجب نہیں۔ مسلم میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ ”لاطاعہ فی معصیۃ اللہ.“ اور اگر وہ شخص صاحب حکومت ہوں تو ان میں اگر ایک دوسرے کا تابع ہو تب تو یہ تعدد ہی نہیں اس متبوع کی اطاعت چاہئے۔ اور اگر دونوں مستقل ہوں تو اگر ان میں ایک کامل الشوکۃ ہے دوسرا ناقص الشوکۃ اس کے سامنے کالعدم ہے کیونکہ مدار اطاعت کا وصف امارت پر ہے اور امارت کا مدار شوکت پر تو یہ ناقص گویا امیر ہی نہیں۔ اور اگر دونوں شوکت میں کامل ہوں تو جس کا تقرر اول ہو چکا ہو وہ واجب الاطاعۃ ہے۔ فہوالامیر الاول ۱۲۔ (چہل حدیث ص ۲۴، ص ۲۵)

حاکم اور محکوم کے حقوق

حاکم ومحکوم کے حقوق میں حاکم میں بادشاہ ونائب بادشاہ اور آقا وغیرہ اور محکوم رعیت اور نوکر وغیرہ

سب داخل ہیں اور جہاں مالک ومملوک ہوں وہ بھی داخل ہوجائیں گے۔ حاکم کے ذمہ یہ حقوق ہیں۔

۱:۔ محکوم پر دشوار احکام نہ جاری کرے۔

۲:۔ اگر باہم محکومین میں کوئی منازعت ہوجائے عدل کی رعایت کرے کسی جانب میلان نہ کرے۔

۳:۔ ہر طرح ان کی حفاظت و آرام رسانی کی فکر میں رہے۔ دادخواہوں کو اپنے پاس پہنچنے کے لئے آسان طریقہ مقرر کرے۔

۴:۔ اگر اپنی شان میں اس سے کوئی کوتاہی یا خطا ہوجائے کثرت سے معاف کردیا کرے اور محکوم کے ذمہ یہ حقوق ہیں۔

۱:۔ حاکم کی خیر خواہی واطاعت کرے۔ البتہ خلاف شرع امر میں اطاعت نہیں۔

۲:۔ اگر حاکم سے کوئی امر خلاف طبع پیش آئے صبر کرے، شکایت و بددعا نہ کرے البتہ اس کی نرم مزاجی کے لئے دعا کرے۔ اور خود اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا اہتمام کرے کہ اللہ تعالیٰ حکام کے دل کو نرم کردیں۔ ایک حدیث میں یہ مضمون آیا ہے۔

۳:۔ اگر حاکم سے آرام پہنچے اس کے ساتھ احسان کی شکر گزاری کرے۔

۴:۔ براہ نفسانیت اس سے سرکشی نہ کرے اور جہاں غلام پائے جاتے ہوں غلاموں کا نان نفقہ بھی واجب ہے اور غلام کو اس کی خدمت چھوڑ کر بھاگنا حرام ہے باقی محکومین آزاد ہیں دائرہ حکومت میں رہنے تک حقوق ہوں گے اور خارج ہونے کے بعد ہر وقت مختار ہیں۔ (حقوق الاسلام)

معاملہ سیاست

۱:۔ اگر کوئی کافر تم کو زخمی کرکے یا کوئی عضو قطع کرکے جب تم بدلہ لینے لگو فوراً کلمہ پڑھ لے تو یہ سمجھ کر کہ اس نے جان بچانے کو کلمہ پڑھ لیا ہے ہرگز مت قتل کرو اس سے اسلام کے حلم رحم اور حق پرستی کا اندازہ کرنا چاہئے۔

۲:۔ کافر رعایا سے بلا قصور کسی کو قتل کرنا سخت گناہ ہے بہشت سے دور کردیتا ہے۔

۳:۔ خودکشی کرنے کی سخت ممانعت ہے کسی طرح۔

۴:۔مساجد میں کوئی سزا جاری نہ کی جائے شاید بول براز خطا ہو۔

۵:۔مسلمان کسی کافر ذمی کو قتل کر ڈالے وہ اس کے مقابلہ میں قتل کیا جاوے گا۔

۶:۔اگر لشکر اسلام میں سے ادنیٰ درجہ کا آدمی بھی لشکر کفار کو امان دے دے، تمام اعلیٰ ادنیٰ مسلمانوں پر لازم ہو جاوے گا اس کے خلاف کارروائی نہیں کر سکتے البتہ اگر لڑنا ہی مصلحت ہو تو کفار کو جدید اطلاع دی جاوے کہ ہم اپنے معاہدے کو واپس لیتے ہیں۔

۷:۔اگر کئی آدمی مل کر ایک آدمی کو قتل کریں، سب قتل کئے جاویں گے اور سب گناہ گار ہوں گے۔

۸:۔ جو شخص فن طب میں مہارت نہ رکھتا ہو اور اس کی عملی بد تدبیری سے کوئی مر جاوے تو اس سے خون بہا لیا جائے گا۔

۹:۔اپنی جان و مال و دین و آبرو کی حفاظت کے لئے لڑنا درست ہے۔ اگر خود مارا گیا، شہید ہوگا، اگر مقابل مارا گیا، اس شخص پر کوئی الزام نہیں۔

۱۰:۔لہو ولعب کے طور پر کنکریاں اچھالنا، غلہ چلانا ممنوع ہے۔ مبادا کسی کا دانٹ آنکھ ٹوٹ پھوٹ جائے۔

۱۱:۔اگر مجمع میں کوئی دھار والی چیز لے کر گزرنے کا اتفاق ہو تو دھار کی جانب چھپا لینا چاہیئے، کسی کے لگ نہ جاوے۔

۱۲:۔ دھار والی چیز سے کسی کی طرف اشارہ کرنا گو ہنسی ہی میں ہو ممنوع ہے۔ شاید ہاتھ سے چھوٹ کر لگ جاوے۔

۱۳:۔ایسی وحشیانہ سزا جس کی برداشت نہ ہو سکے، جیسے دھوپ میں کھڑا کر کے تیل چھوڑنا، ہنٹروں سے بے درد ہو کر بے حد مارنا نہایت گناہ ہے۔

۱۴:۔تلوار، چاقو کھلا ہوا کسی کے ہاتھ میں مت دو یا تو بند کر کے دو یا زمین پر رکھ دو، دوسرا شخص اپنے ہاتھ سے اٹھا لے۔

۱۵:۔کسی آدمی یا جانور کو آگ سے جلانا جائز نہیں۔

۱۶:۔واجب القتل کو ہاتھ پاؤں کاٹ کر چھوڑنا کہ تڑپ تڑپ کر مر جاوے، درست نہیں۔

۱۷:۔پرندوں کے بچوں کو گھونسلوں سے نکال لانا کہ ان کے ماں باپ بے قرار ہوں درست

نہیں جس کے جادو سے لوگوں کو ضرر پہنچتا ہے اور وہ باز نہیں آتا وہ گردن زنی کے لائق ہے۔

۱۸:۔ جو مجرم زنا اقراری ہو حتیٰ الامکان اس کو ٹال دینا چاہئے جب وہ برابر اپنے اقرار پر جمارہے اور چار بار اقرار کرلے اس وقت سزا جاری کی جاوے۔

۱۹:۔ اگر ایسا اقراری مجرم اثنائے سزا میں اپنے اقرار کو واپس لے تو چھوڑ دینا چاہئے۔

۲۰:۔ اگر حاملہ عورت پر جرم زنا ثابت ہو، جب تک بچہ نہ جن لے اور اگر کوئی دوسری دودھ پلانے والی نہ ہو تو جب تک دودھ نہ چھوٹ جاوے اس وقت سنگسار نہ ہوگی۔

۲۱:۔ سزا پانے کے بعد مجرم کو طعن و تشنیع و تحقیر کرنا بہت برا ہے۔

۲۲:۔ جو زانی مستحق تازیانہ ہو اور بوجہ مرض کے سزا دینے میں مر جانے کا احتمال ہو تو صحت تک سزا موقوف رکھی جاوے۔

۲۳:۔ سزائیں دو قسم کی ہیں، ایک معین دوسری مفوض برائے حاکم، اول کو حد دوسری کو تعزیر کہتے ہیں۔ حدود میں شریف رذیل وجیہ ذلیل سب برابر ہیں اس میں کسی کی رعایت نہیں تعزیر میں شریف وجیہ آدمی سے چشم پوشی مناسب ہے اور صرف فہمائش کافی ہے۔

۲۴:۔ جھوٹے مقدمے کی یا جس کا سچا جھوٹا ہونا معلوم نہ ہو اس مقدمے کی پیروی یا کسی قسم کی اعانت کرنا ممنوع ہے۔

۲۵:۔ شراب کا استعمال دوا میں بھی ممنوع ہے۔

۲۶:۔ چونکہ نشہ والی چیزوں کی خاصیت ہے کہ تھوڑی سے زیادہ ہو جاتی ہے اس لئے اس کے تھوڑے استعمال سے بھی ممانعت کی گئی۔

حکومت وانتظام ملکی

۲۷:۔ جو شخص خود حکومت کی درخواست کرے وہ قابل حکومت نہیں ہے، وہ خود غرض ہے جو اس سے بھاگتا ہو وہ زیادہ عدل کرے گا، اس کو حکومت دینا سزاوار ہے۔

۲۸:۔ سلطان کی اہانت کی اجازت نہیں۔

۲۹:۔ حکام کو بھی حکم ہے کہ رعایا سے نرم برتاؤ کریں، سختی نہ کریں۔

۳۰:۔ حکام کے پاس جاکر ان کی خوشامد سے ان کی ہاں میں ہاں ملانا، ان کو ظلم کے

طریقے بتلانا اس میں اعانت کرنا سخت مذموم ہے۔

۳۱:۔حق بات کہہ دینے میں حکام سے مت دبو۔

۳۲:۔حکام کو مناسب نہیں کہ رعایا کے عیوب و جرائم کا بلاضرورت تجسس کرے کہ ہیچ نفس بشر خالی از خطا نبود۔

۳۳:۔بلاقصور کسی کو گھور کر دیکھنا، جس سے ڈر جاوے جائز نہیں۔

۳۴:۔اگر حکام ظلم کرنے لگیں ان کو برا مت کہو، سمجھ جاؤ کہ ہم سے حاکم حقیقی کی نافرمانی ہوئی ہے۔ یہ اس کی سزا ہے۔ اپنی حالت درست کرلو۔ اللہ تعالیٰ حکام کے قلوب کو نرم کردیں گے۔

۳۵:۔حاکم کا ایسی جگہ بیٹھنا جہاں نہ حاجت مند جاسکے، نہ کسی ذریعہ سے اپنی فریاد وہاں پہنچا سکے، جائز نہیں۔

۳۶:۔غصے کی حالت میں حواس درست نہیں رہتے اس وقت مقدمہ فیصل کرنا نہ چاہئے۔

۳۷:۔رشوت لینے کی سخت ممانعت ہے گو ہدیہ کے طور پر ہو۔

۳۸:۔جھوٹا دعویٰ، جھوٹی گواہی، جھوٹی قسم، جھوٹا انکار کسی کے حق کا یہ سب گناہ ہے۔

۳۹:۔اپنا حق ثابت کرنے کے لئے کوشش کرنا کوئی بری بات نہیں بلکہ اس میں کاہلی کی راہ سے بیٹھ رہنا کم ہمتی قرار دی گئی ہے اور باوجود کوشش کرنے کے ناکامی ہو اس کا زیادہ غم کرنا بھی برا ہے سمجھ لے کہ حاکم حقیقی کو یہی منظور تھا۔

۴۰:۔قومی شبہے میں حوالات کردینے کی اجازت ہے۔

۴۱:۔سواری اور نشانہ بازی کی مشق کا حکم ہے۔

۴۲:۔گھوڑے کی دم کے بال اور ایال اور پیشانی کے بال مت کاٹو دم کی بال سے مکھی اڑاتا ہے، ایال سے اس کو گرمی پہنچتی ہے۔ پیشانی کے بالوں میں برکت ہے۔ (تعلیم الدین)

صلاح وفساد کے ذمہ دار حکماء وعلماء

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری امت کی دو جماعتیں ایسی ہیں کہ جب وہ درست ہوں گی تو سب

آدمی درست ہو جائیں گے اور جب وہ فاسد ہوں گی تو سب آدمی فاسد ہو جائیں گے۔ ایک جماعت امراء وملوک، دوسری علماء اور حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ علماء کی مثال ایسی ہے جیسے نمک کی جب کوئی چیز خراب ہونے لگے تو نمک اس کی اصلاح کر دیتا ہے لیکن اگر نمک خود ہی خراب ہو جائے (مثلاً زیادہ ہو جائے) تو اس کی اصلاح کسی چیز سے نہیں ہوتی (جامع العلم لابن عبدالبر ص ۸۷)

حکومت بڑی ذمہ داری کی چیز ہے

فرمایا کہ حضرت ابن عباس نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو وفات سے دو برس بعد خواب میں دیکھا...... کہ پیشانی کا پسینہ صاف کر رہے ہیں پوچھا یا امیر المومنین آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مغفرت کی ابھی حساب سے فارغ ہوا ہوں قریب تھا کہ عمر کا تخت لوٹ جائے مگر میں نے اللہ کو بڑا رحیم کریم پایا حضرت نے فرمایا کہ دیکھ لیجئے یہ حکومت ایسی چیز ہے جس کی ہوگ کرتے ہیں کیا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسا انصاف کسی میں ہو سکتا ہے اور پھر بھی ان کا یہ واقعہ ہوا۔

ہر ذمہ دار کو اپنے ماتحت لوگوں کے اعمال کی نگہداشت کرنا چاہئے

چنانچہ ایک بار حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابہ سے دریافت فرمایا کہ میں جب معتبر اہل شخص کو کوئی عہدہ دیتا ہوں تو یہ کافی ہے کہ عہدہ دینے سے پہلے اس کی اہلیت لیاقت، دیانت وامانت کی تحقیق کرلوں پھر یہ سبکدوش ہوں یا مجھے عہدہ دینے کے بعد اس کے کام کی بھی تحقیق بھی کرنا چاہئے کہ جیسا کہ میرا گمان تھا وہ ویسا ہی ثابت ہوا یا میرا گمان غلط نکلا سب نے جواب دیا کہ عہدہ دینے سے پہلے پوری طرح تحصیل کر لینا کافی ہے اس کے بعد آپ سبکدوش ہیں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا یہ جواب صحیح نہیں ہے بلکہ مجھے اس کے کام کی بھی تحقیق کرنا چاہئے کہ جب میرا گمان تھا اس نے اسی طرح کام کا حق ادا کیا یا میرا گمان اس کے متعلق غلط ثابت ہوا۔ بدوں اس کے میں سبکدوش نہ ہوں گا

محققین صوفیہ کا بھی یہی خیال ہے کہ جس کو کوئی خدمت سپرد کی جائے اس کے اعمال کی بھی جانچ کرنا چاہئے کہ جو خدمت اس کے سپرد کی گئی ہے وہ اس کا اہل ثابت ہوا یا نہیں۔

زوال سلطنت ظلم سے ہوتا ہے

فرمایا کفر سے سلطنت کو زوال نہیں ہوتا، ظلم سے زوال ہوتا ہے۔

مزاح حاکم کے وقار کے خلاف ہے

فرمایا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے کہ اگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں مزاح نہ ہوتا تو میں اپنی حیات ہی میں ان کو خلیفہ بنا دیتا مزاح سے وقار جاتا رہتا ہے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ خوش مزاج بہت تھے اکثر ہنستے بولتے رہتے تھے اور یوں سب ہی حضرات صحابہ خوش مزاج تھے میں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دو شعر بھی دیکھے ہیں۔

ابوبکر حبا فی اللہ مالہ   واعتق من ذخائرہ بلالا

وقدواسی السی بکل فضل   واسرع فی اجابہ اللہ

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا رعب

ایک مرتبہ آپ بہت سے صحابیوں کے ہمراہ جا رہے تھے اتفاقاً پشت کی طرف جو آپ نے نظر کی تو جس جس پر نظر پڑی سب گھٹنوں کے بل گر پڑے سچ ہے جو خدا تعالیٰ سے ڈرتا ہے اس سے سب ڈرتے ہیں اور اگر کسی کے رعب اور ہیبت میں کمی ہے تو تقویٰ اور دینداری کی کمی کی وجہ سے ہے ورنہ ضرور ہیبت ہوتی ہے وحشت اور نفرت نہیں ہوتی۔

پہلے سلاطین میں بھی دین کی وقعت تھی

پہلے سلاطین میں بھی دین کی وقعت اور دین کی پابندی تھی والی کابل کے عدل کی حکایت کے بیان میں فرمایا کہ میرے پیر بھائی محمد خان صاحب خورجہ والے ایک واقعہ امیر عبدالرحمٰن خان والی کابل کا بیان کرتے ہیں کہ ان کی بیوی کے ہاتھ سے ایک قتل ہو گیا۔ ایک ماما کو پستول سے مار ڈالا۔ امیر عبدالرحمٰن خان سے ماما کے ورثہ نے فریاد کی حکم فرمایا کہ قاضی شرع کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا جاوے اور بعد تحقیق شرعی کے جو حکم ہو اس پر عمل

کیا جاوے۔ چنانچہ وہاں دعویٰ دائر ہوا۔ قاضی نے کہلا کر بھیجا کہ مجرم کی حراست کی ضرورت ہے مگر شاہی محل کا معاملہ ہے وہاں تک رسائی کیسے ہوسکتی ہے فوراً فوج کو حکم دیا کہ قاضی صاحب کے ماتحت کام کریں باضابطہ محل سے گرفتاری ہوئی۔ اور بیانات لئے گئے مقدمہ شروع ہوگیا۔ امیر صاحب کے صاحبزادے امیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کیا کہ والدہ کے متعلق کیا ہوگا فرمایا کہ بیٹا میں مجبور ہوں جو حکم شرعی ہوگا وہ ہوگا اور یہ بھی فرمایا کہ تمہاری تو ماں ہے اس لئے تمہیں اس کا خیال ہے اور میری بیوی اس لئے مجھ کو بھی خیال ہے مگر حکم شرعی کے آگے چوں وچرا کی کیا گنجائش ہے اور تعجب ہے کہ تم کو اپنی بڑھیا ماں کا تو خیال ہے اور بوڑھے باپ کا خیال نہیں کہ رعایت کرنے سے میدان حشر میں خدا کے سامنے گھسٹتا گھسٹتا پھرے گا۔ غرض مقدمہ ہوا اور قاتلہ کے اقرار سے قتل ثابت ہوگیا قاضی شرع نے قصاص کا حکم صادر کردیا۔ صاحبزادوں نے امیر صاحب سے عرض کیا کہ اگر مقتول کے ورثاء کو کچھ دے کر راضی کرلیں اور وہ اپنا حق معاف کردیں تو اس میں تو کوئی ہرج نہیں۔ فرمایا کہ کوئی ہرج نہیں شریعت میں اس کو دیت کہتے ہیں۔

خلافت قریشی کے لئے ہے

فرمایا۔ خلافت قریشی کے لئے ہے غیر قریشی بادشاہ کو سلطان کہا جائے گا لیکن اطاعت اس کی بھی واجب ہوگی اور گو نصب خلیفہ واجب ہے لیکن واجب کے لئے قدرت شرط ہے اور قدرت اس وقت مفقود ہے اس واسطے گو عالم اس وقت خلیفہ سے خالی ہے لیکن بایں حالات خلیفہ کے نہ ہونے سے کوئی گناہ نہیں۔ اور بعض نے جو کہا ہے کہ غیر قریشی بھی خلیفہ ہوسکتا ہے تو یہ نص کے خلاف ہے یعنی الائمہ من قریش. نیز حضرات انصار پر جب یہ نص پیش کی گئی تو انہوں نے بھی اس کو تسلیم فرمایا پس گویا اس پر صحابہ کا اجماع ہوگیا البتہ جن لوگوں کے قبضہ میں سلطنتیں ہیں وہ اگر قریشی کو جب کہ اس میں اہلیت ہو خلیفہ نہ بنادیں تو مجرم ہوں گے۔

حکمران نہ ڈھیلا ہو اور نہ ڈھیلا کی طرح سخت

فرمایا میں کب کہتا ہوں کہ بادشاہ کو ڈھیلا یعنی حد سے زیادہ نرم ہونا چاہئے میں تو یہ کہتا ہوں کہ ڈھیلا (بمعنی کلوخ) یعنی زیادہ سخت نہ ہونا چاہئے بادشاہ کو حضرت عمر فاروق رضی

اللہ تعالیٰ عنہ بن کر رہنا چاہئے۔ حق تعالیٰ سے ہیبت کرنے میں خاص اثر ہے کہ اس کی ہیبت دوسروں کے قلب میں ہوتی ہے۔ (الافاضات الیومیہ ج۲ ص۸۱)

ہر کہ ترسید از حق و تقوی گزید ترسد از وے جن و انس و ہر کہ دید

حکمران کا عاقل ہونا ضروری ہے

فرمایا یہ جو مشہور ہے کہ وزیر عاقل ہونا چاہئے گو بادشاہ بے وقوف ہی ہو محض غلط ہے۔ بادشاہ ہی کا عاقل ہونا ضروری ہے۔ ورنہ بادشاہ کو وزیر کا تابع ہو کر رہنا پڑے گا۔ تو اس صورت میں وزیر بادشاہ اور بادشاہ وزیر ہوگا (الافاضات الیومیہ ج۲ ص۸۶)

جمہوری سلطنت بچوں کا کھیل ہے

فرمایا کہ جمہوری سلطنت بھی کوئی سلطنت ہے محض بچوں کا کھیل ہے حکومت تو شخصی ہی کی ہے اسی کی ہیبت اور رعب بھی ہوتا ہے۔ (الافاضات الیومیہ ج۳ ص۱۱۲، ص۱۱۳)

قرآن میں سلطنت شخصی کا ثبوت ملتا ہے

فرمایا بعض لوگ آیت **وشاورھم فی الامر** سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ سلطنت شخصی ہونا خلاف قران ہے **شاورھم** سے کثرت رائے مفہوم ہوتی ہے جو حاصل ہے سلطنت جمہوری کا مگر اس استدلال کی غلطی خود اس آیت کے اگلے جزو سے ظاہر ہے۔ **فاذا عزمت فتوکل علی اللہ** جس سے ثابت ہوتا ہے کہ گو مشورہ مطلوب ہے مگر بعد مشورہ مدار محض آپ کے عزم اور رائے پر ہے اس سے تو بالکل سلطنت کا شخصی ہونا ثابت ہوا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ شخص واحد پر مشورہ کا وجوب ثابت ہوتا ہے لیکن مدار کثرت رائے پر نہیں رکھا گیا بلکہ اس مستشیر (مشورہ لینے والے کو) اطلاق آیت سے بھی اس کی اجازت ہے کہ وہ بمقابلہ جماعت کے ایک کے مشورہ کو قبول کر کے اس کے موافق عزم کرے (الافاضات الیومیہ ج۳ ص۳۱۹)

ایک خاص حالت میں ہر چیز کو زوال ہے

فرمایا کہ حکومت ہی کی کیا تخصیص ہے ایک خاص حالت میں ہر چیز کو زوال ہے چاہے وہ حکومت ہو یا قوت اور شجاعت ہو۔ مال ہو، عزت ہو، جاہ و علم ہو، کمال ہو۔ اور وہ خاص

حالت یہ ہے کہ یہ شخص اس کو اپنا کمال سمجھنے لگے عطیہ خداوندی نہ سمجھے اور راز اس کا یہ ہے کہ اس کو اپنا کمال سمجھ کر اس میں حقوق کی ادائیگی کی طرف نظر نہیں رہتی اس لئے امانت سے برطرف کر دیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ کل ہمارے پاس کچھ تھا آج کچھ بھی نہیں۔

نئی قسم کی بہادری میں کیا مزہ ملک وحکومت کا ملے گا

فرمایا کہ آج کل بہادری کی نئی قسم نکلی ہے مار کھانا، ذلیل ہونا، بھوک ہڑتال کر کے مر جانا۔ یہ سب کچھ اس لئے کہ حکومت مل جائے۔ ایسے ذلیل کم حوصلہ لوگوں کو تو حکومت کا نام بھی نہ لینا چاہئے پٹتے تو خود ہی پھرتے ہیں کیا بدنصیبوں کو حکومت اور ملک کا مزہ ملے گا۔

مسلم اور غیر مسلم سے مشترک سلطنت اسلامی سلطنت نہیں

فرمایا کہ قاعدہ عقلیہ ہے کہ مرکب کامل اور ناقص کا ناقص ہی ہوتا ہے۔ تو کفار اور مسلم سے جو سلطنت مرکب ہوگی وہ غیر اسلامی ہوگی پس جبکہ ترکی میں (یورپ کی تقلید میں جمہوریت) قائم ہوگئی ہے جو مسلم اور غیر مسلم سے مشترک ہے تو وہ اسلامی سلطنت نہ ہوگی لیکن مسلمانوں پر اس کی نصرت واجب ہے کیونکہ دوسری غیر مسلم سلطنتیں اس کا مقابلہ اسلامی سلطنت سمجھ کر کرتی ہیں۔

رعایا کی مطیع بنانے کی تدبیر

فرمایا کہ جب تک شفقت نہ ہو پرورش کا خیال نہ ہو کوئی اور طریقہ اور کوئی تدبیر رعایا کے مطیع بنانے کی نہیں۔

مسلمانوں کو ترقی حق تعالیٰ شانہ کو راضی کرنے سے ہوتی ہے

فرمایا کہ اے مسلمانو! تم ترقی کے لئے ہمیشہ یہ دیکھو کہ مسلمانوں کیونکر ترقی ہوئی اور یہ ہرگز نہ دیکھو کہ کفار کی ترقی کیونکر ہوئی۔ کیونکہ ہر قوم کا مزاج باطنی الگ ہے یہ ضروری نہیں کہ جو طریقہ ایک قوم کو مفید ہو وہ سب کو مفید ہے۔ بلکہ یہ بھی ضروری نہیں کہ جو صورت ایک قوم کے کسی فرد کو مفید ہو وہ سب افراد کو مفید ہو۔ لطیف المزاج کو وہ چیزیں نافع نہیں ہوتیں جو ایک گنوار کو نافع ہیں۔ تم اسلام کے بعد لطیف المزاج ہو گئے ہو تمہارا مزاج شاہانہ ہو گیا ہے تم کو وہ

صورت مفید نہ ہوگی جو کفار کو مفید ہے نیز تم ایسے ہو جیسے سر کی ٹوپی کہ جہاں اس سے ذرا سی ناپاکی لگی فوراً اتار کر پھینک دی جاتی ہے اور جوتے میں اگر ناپاکی لگ جائے تو اس کو نہیں پھینکتے۔ اسی طرح حق تعالیٰ تم کو ناپاکی اور گندگی میں ملوث نہیں دیکھنا چاہتے۔ اگر تم ملوث ہو گئے تو فوراً پڑے پر کوٹے پیٹے جاؤ گے اور کفار چاہے جتنا ملوث ہو جائیں گوارا کیا جائے گا پس اگر تم ترقی کرنا چاہو تو یہ دیکھو کہ پہلے مسلمانوں کو ترقی کیونکر ہوئی تھی چنانچہ جن لوگوں نے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی ترقی کا حال تاریخ میں دیکھا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ ان حضرات کو محض دین کی اتباع کی وجہ سے ترقی ہوئی۔ وہ دین میں پختہ تھے ان کے معاملات و معاشرت و اخلاق بالکل اسلامی تاریخ کے مطابق تھے اس لئے دوسری قوموں کو خود بخود اسلام کی طرف کشش ہوتی تھی اور کسی نے مقابلہ کیا تو چونکہ انہوں نے خدا تعالیٰ کو راضی کر رکھا تھا اس لئے خدا تعالیٰ ان کی مدد کرتا تھا یہی وجہ ہے کہ باوجود بے سروسامانی اور قلت عدد کے بڑی بڑی سلطنتوں کے ان سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

شریعت پر عمل کرنے میں مسلمانوں کا وقار ہے

فرمایا تم شریعت پر عمل کر کے دیکھو انشاء اللہ سب تمہاری عزت کریں گے جس کی بین دلیل یہ ہے کہ جو پکے مسلمان ہیں۔ انگریز، ہندو، پارسی وغیرہ سب ان کی عزت کرتے ہیں تم دین پر قائم رہو ساری قومیں تمہاری مسخر ہو جائیں گی۔

اتفاق واتحاد کی بنیاد

فرمایا کہ اتفاق و اتحاد کی بنیاد ہمیشہ دین کی حدود پر قائم کرو اور کسی عالم سے مشورہ کر کے کام کرلو یہ اتحاد انشاء اللہ مضبوط ہوگا۔ اور یہ اتحاد باقی جب رہے گا جب تقوٰی کی رعایت ہوگی کیونکہ جب تقوٰی کی رعایت ہوگی تو خدا کا خوف ہوگا اور دوسروں کے حقوق ادا کرنے کا خیال ہوگا۔ دین کی حدود پر قائم رہو۔ اور جب دوسروں کے حقوق ادا ہوتے رہیں گے تو پھر نا اتفاقی پیدا نہیں ہوتی۔

نسبت مع الخالق راسخ ہونے کے بعد رعایا کے حقوق ادا ہو سکتے ہیں۔

حضرت والا کے صاحب اجازت کو لوگوں نے زبردستی میونسپلٹی کا ممبر بنادیا بالآخر حضرت کی خدمت میں لکھا تا کہ گلو خلاصی ہو تحریر فرمایا جب تک نسبت مع الخالق راسخ نہ ہو تعلق مع المخلوق بلاضرورت سراسر مضرت ہے اور جو منفعت سوچی جاتی ہے کہ ادائے حق خلق ہے وہ حق خلق بھی جب ہی ادا ہوتا ہے کہ نسبت مع الخالق ہو جاوے ورنہ حق خلق ادا ہوتا ہے نہ حق خالق یہ تجربہ ہے اور ایک کا نہیں بلکہ ہزاروں اہل بصیرت کا اسی لئے ہم سے اور آپ سے زیادہ اہل تمکین نے ایسے تعلقات کو چھوڑ دیا ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادہم بلخی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شجاع کرمانی رحمۃ اللہ علیہ کے واقعات معلوم ہیں اور حضرت خلفائے راشدین پر اپنے کو قیاس نہ کیا جاوے۔

کار پاکاں را قیاس از خود بگیر

سلطنت کی ہوس کا انجام

فرمایا کہ رعایا کے سلطنت کی ہوس ہونے کا نتیجہ سوائے پریشانی کے کچھ نہیں۔ بس ان کی وہ حالت ہے جیسے چیونٹی کے مرنے کے دن قریب آتے ہیں تو اس کے پر لگتے ہیں اس وقت تو وہ خوش ہوتی کہ آہا میں بھی ہوا میں ارنے لگی چنانچہ اس کی یہ حالت ہوتی ہے۔

چیونٹی کے لگے پر تو وہ کہنے لگی اڑ کر میں مثل سلیماں ہوں ہوا میں کئی دن سے

مگر اس کو یہ خبر نہیں کہ اس کی ہلاکت کے دن قریب آ گئے ہیں اس کا منشاء محض حرص ہے اور کچھ نہیں مگر یہ لوگ اس کو دین سمجھتے ہیں اور اس کا نام ترقی اسلام رکھا ہے۔ صاحبو خام کے بدلنے سے کچھ نہیں ہوتا نتائج و آثار کو دیکھنا چاہئے کہ اس ہوس خام کے آثار و نتائج کیا ہیں۔ کیا اس سے اسلام کو کچھ ترقی ہوئی ہے یا کفر کو۔ صوفیہ بڑے محقق ہیں اور ان سے زیادہ کون دیندار ہوگا ان کی تعلیم یہ ہے۔

آرزو میخواہ لیک اندازہ خواہ برنتا بدکوہ رایک برگ کاہ

چنانچہ نص قرآنی ہے **لاتلقوا بایدیکم الی التھلکہ** جس سے معلوم ہوا کہ جس ہوس کا نتیجہ ہلاکت ہو وہ ممنوع ہے وہ دین نہیں خلاف دین ہے اور حدیث میں ہے **لاینبغی للمومن ان یذل نفسہ** جس سے معلوم ہوا کہ اپنے آپ کو ذلیل کرنا بھی جائز نہیں۔ اگر ہلاکت نہ ہو یہ سب تو شریعت کی تعلیم متعلق مصائب اختیاریہ کے ہے اور مصائب غیر اختیاریہ کے متعلق یہ تعلیم ہے۔

سلطنت کی قیمت

ایک بزرگ نے ایک بادشاہ سے پوچھا کہ اگر اتفاقاً تم شکار میں نکل جاؤ اور اکیلے رہ جاؤ اور اس وقت اگر کوئی شخص تمہارے پاس ایک پیالہ پانی لائے اور آدھی سلطنت اس کی قیمت بتلائے تو تم اس کو خرید لو گے کہ نہیں؟ اس نے کہا کہ میں ضرور خرید لوں گا پھر ان بزرگ نے کہا کہ اگر اتفاق سے تمہارا پیشاب بند ہو جائے اور کسی طرح نہ کھلے اور ایک شخص اس شرط پر پیشاب اتار دینے کا وعدہ کرتا ہے کہ باقی آدھی سلطنت اس کو دے دو تو تم کیا کرو گے۔ اس نے کہا باقی آدھی سلطنت بھی اس کو دے دوں گا تو ان بزرگ نے کہا کہ بس آپ کی سلطنت کی یہ قیمت ہے کہ ایک پیالہ پانی اور ایک پیالہ پیشاب جس میں آپ اس قدر مست ہو رہے ہیں۔ تو اللہ والوں کو دنیا کا نرخ معلوم ہے اس لئے صحابہ نے بڑی سلطنت ہونے پر بھی دنیا کی ہوس نہیں کی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ وقت تھے مگر کھانا کپڑا جوتا معمولی سے بھی کم تھا کیونکہ وہ حضرات جانتے تھے کہ اصل چیز دوسری ہے ہمارے بعضے بھولے بھالے بھائی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے لڑتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خلافت لے لی۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نہ دی۔ میں کہتا ہوں کہ ان دونوں حضرات کو دعا دیجئے اگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اول ہی سے خلافت دے دی جاتی اور اتنی مدت تک یہ خلیفہ رہتے تو ان کو کتنی مدت تک تکلیف ہوتی جو اٹھائے نہ اٹھتی کیونکہ معلوم ہو چکا ہے کہ ان حضرات کو دنیا سے کس قدر نفرت تھی۔ پس ان حضرات نے بڑا سلوک کیا کہ اس مصیبت کو خود بانٹ لیا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تکلیف نہ پہنچنے دی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفوں کا رعب

دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفوں کا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر تھے کس قدر رعب رعایا پر تھا لیکن اس کے ساتھ ہی دیکھ لیجئے ان کی تواضع کی کیا حالت تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تواضع کا قصہ

حتیٰ کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا اسمعوا

واطیعوا یعنی سنواوراطاعت کرو۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ لانسمع ولا نطیع یعنی ہم نہ آپ کا حکم سنیں اور نہ اطاعت کریں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی وجہ پوچھی تو اس شخص نے کہا کہ غنیمت کے چادرے جو آج تقسیم ہوئے ہیں سب کو تو ایک ایک چادر ملا ہے اور آپ کے بدن پر دو ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے تقسیم میں عدل اور انصاف نہیں کیا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ بھائی تو نے اعتراض کرنے میں بہت جلدی کی، بات یہ ہے کہ میرے پاس کرتا نہیں تھا تو میں نے اپنے چادرے کو تہبند کی جگہ باندھا اور اپنے بیٹے عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کا چادرہ مانگ کر اس کو کرتے کی جگہ اوڑھا ہے اس واقعہ سے آپ کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ ان حضرات میں بڑے چھوٹے سب برابر حصے کے حقدار سمجھے جاتے تھے۔ آج بڑوں کا دوہرا حصہ ہونا گویا لازمی بات ہے البتہ اگر مالک ہی دوہرا حصہ دے دے تو کچھ مضائقہ نہیں غرض کہ تواضع اور نرمی کی یہ کیفیت تھی اور باوجود اس نرمی کے رعب کی یہ حالت تھی کہ

فتح ونصرت کا مدار قلت وکثرت نہیں

ہر امر میں مسلمانوں کا مطمح نظر خدا تعالیٰ کی رضا ہونا چاہئے۔ فرمایا کہ فتح ونصرت کا مدار قلت اور کثرت پر نہیں وہ چیز ہی اور ہے۔ مسلمانوں کو صرف اسی ایک چیز کا خیال رکھنا چاہئے، یعنی خدا تعالیٰ کی رضا پھر کام میں لگ جانا چاہئے۔ اگر کامیاب ہوں شکر کریں۔ ناکامیاب ہوں صبر کریں۔ اور مومن تو حقیقتاً ناکامیاب کبھی ہوتا ہی نہیں۔ گو صورۃً ناکام ہو جاوے اس لئے کہ اجر آخرت تو ہر وقت حاصل ہے جو ہر مسلمان کا مقصود ہے حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ساٹھ ہزار کے مقابلہ میں تیس آدمی تجویز کئے تھے حضرت عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ امت محمدیہ کو ہلاک کراؤ گے تب ساٹھ آدمی تجویز کئے یعنی ایک ہزار کے مقابلہ میں ایک آدمی قلت وکثرت کی طرف ان حضرات کا خیال ہی نہ تھا۔

دولت اور سلطنت کا ایک خاصہ

فرمایا کہ تنعم اور تعیش کا اکثری خاصہ ہے کہ حدود محفوظ نہیں رہتے ہاں اگر تنعم کے ساتھ دین ہو اور کسی کامل کی صحبت میسر آ گئی ہے تب تو حدود کا خیال رہتا ہے اس لئے کہ اس سے

ہر چیز کو اعتدال کے ساتھ قلب میں رسوخ ہو جاتا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک فراست

فرمایا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حکم فرمایا تھا کہ ہمارے بازار میں صرف وہ لوگ خرید وفروخت کریں جو فقیہ ہوں اس سے تمام ملک کو درسگاہ بنادیا تھا اس لئے کہ سب خریداروں کو ان ہی کے ساتھ سابقہ پڑتا تھا عجیب فراست تھی۔

امارت میں خاصہ ہے تبعید مساکین کا

فرمایا کہ جس قوم کے مذہبی رہبر امیر ہوں گے وہ مذہب اور قوم گمراہ ہوجائے گی اس لئے کہ ان کو تو ضرورت قوم سے واسطہ رکھنے کی رہے گی نہیں۔ اور جب واسطہ رہا وہ گمراہ ہونا قریب ہے ہی اس کا یہ سبب نہیں کہ اب واسطہ قوم سے مال کے سبب ہے بلکہ امارت میں خاصہ ہے تبعید مساکین کا۔

نظام صحیح فلاح دارین برائے مسلمانان

فرمایا کہ مسلمانوں کی غفلت شعاری کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ حالانکہ آخرت کے لئے اپنے اعمال کی اصلاح دنیا کے لئے اپنے قوت کا اجتماع اور آپس میں اتحاد و اتفاق سب ان کا فرض تھا۔ اور یہ جو مسلمان کو اپنی فلاح سے استغفار ہے اس کا منشاء چند غلطیاں ہیں (۱) ایک غلط استعمال توکل کا۔ سو توکل تو فرض ہے ہر مسلمان کو خدائے تعالیٰ سے براہ راست ایسا تعلق رکھنا چاہئے کہ کسی چیز کی پرواہ نہ کرے یہی اعتقاد رکھے کہ جو خدا کو منظور ہوگا وہی ہوگا کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ لیکن توکل کا استعمال خلاف محل کرتے ہیں دوسری غلطی یہ کہ جو کام کرتے ہیں جوش کے ماتحت کرتے ہیں اگر ہوش کے ماتحت کام کریں تو بہت جلد کامیاب ہوں۔

تیسری غلطی یہ ہے کہ ہر کام کرنے سے پہلے یہ معلوم کرلینا واجب تھا شریعت مقدسہ کا اس کے متعلق کیا حکم ہے پھر اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بتلائی ہوئی تدابیر پر عمل کرے۔ حاصل نظام صحیح کا یہ ہوا کہ جوش کے ماتحت کوئی کام نہ کرے ہوش کے ماتحت کیا کرے۔ اپنی قوت کو ایک مرکز پر جمع کرلیں۔ تیسرے آپس میں اتحاد و اتفاق رکھے۔ احکام کی پابندی کریں۔ جن میں توکل بھی داخل ہے۔ اگر ایسا کریں تو میں دعویٰ کے ساتھ خدا کی ذات پر

بھروسہ کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ چند روز میں کایا پلٹ ہوجائے۔ بہت جلد مسلمانوں کے مصائب اور آلام کا خاتمہ ہوجاوے۔ نیز جو بھی کام کریں اس میں کامیابی کے لئے خدا سے دعا کریں پھر دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ مگر اس وقت کام کی ایک بات نہیں محض ہڑبونگ ہے۔

سلطنت کا زوال چھوٹی چھوٹی باتوں کی غفلت سے ہوتا ہے

فرمایا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی بہت اہتمام چاہئے۔ سلطنت جو گئی ہے میرے نزدیک چھوٹی چھوٹی چیزوں کے اہتمام کی غفلت ہی سے گئی ہے کیونکہ چھوٹی چھوٹی جزئیات کی طرف سے جو غفلتیں ہوتی رہتی ہیں وہ سب مل کر ایک بہت بڑا مجموعہ غفلتوں کا ہوجاتا ہے جو آخر میں رنگ لاتا ہے اور زوال سلطنت کا موجب ہوجاتا ہے۔ نیز جب چھوٹی چھوٹی باتوں کا اہتمام نہیں ہوتا تو غفلت کی عادت پڑجاتی ہے پھر بڑے بڑے امور میں بھی غفلت ہونے لگتی ہے اور وہ براہ راست مخل ہیں سلطنت کی۔ اس لئے چھوٹی چیزوں کا اہتمام ویسے بھی ضروری ہے۔ جب چھوٹی چیزوں کا اہتمام ہوگا تو بر بنا عادت بڑی چیزوں کا تو اہتمام ویسے بھی ضروری ہے۔ جب چھوٹی چیزوں کا اہتمام ہوگا تو بر بنا عادت بڑی چیزوں کا تو اہتمام ضروری ہی ہوگا اس میں ایک بڑا راز یہ بھی ہے کہ چھوٹے امور میں کوتاہی کرنے سے باہمی معاملات میں بھی یہی عمل ہوتا ہے۔ جس سے باہم کدورت ہوجاتی ہے۔ اس صورت میں باہم الفت نہیں رہتی اور مدار سلطنت کا باہمی اتفاق پر ہے اس اہتمام کی تائید میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ بیان فرمایا کہ ایک بار شب کے وقت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ آکر باتیں کرنے لگے تو آپ نے فوراً چراغ گل کردیا۔ کیونکہ اس وقت آپ بیت المال کا کام کررہے تھے اور چراغ میں تیل بھی بیت المال ہی کا تھا۔ لیجئے یہ بھی کوئی بڑی بات تھی لیکن جو شخص ایسی ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا اہتمام کرے گا وہ بڑے بڑے امور کو تو کیوں نظر انداز کرے گا۔ (افاضات الیومیہ ج ۱۰ جزاول ص ۱۰۲)

جس سلطنت میں رضائے حق نہ ہو وہ وبال جان ہے۔ یادرکھو سلطنت مقصود بالذات نہیں بلکہ اصل مقصود رضائے حق ہے اگر ہم سے خدا راضی نہ ہو تو ہم سلطنت کی حالت میں فرعون ہیں اور لعنت ہے ایسی سلطنت پر جس سے ہم فرعون کے مشابہ ہوں اگر سلطنت مقصود بالذات ہوتی تو فرعون و ہامان وشداد بڑے مقرب ہونے چاہئیں حالانکہ وہ مردود ہیں

معلوم ہوا کہ سلطنت وہی مطلوب ہے جس میں رضائے حق بھی ساتھ ساتھ ہو اور جس سلطنت میں رضائے حق نہ ہو وہ وبال جان ہے۔ (اشرف الجواب حصہ سوم مجلد ص ۴۴۵)

انتظامی کام حکومت سرانجام دے سکتی ہے

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ بہت سے انتظامی کام حکومت ہی کر سکتی ہے ایسے کام اسی ہی کے کرنے کے ہیں مثلاً باجے گاجے اگر حکومت چاہے بند کر سکتی ہے رہا کتوں کے متعلق اول تو پالنے کی ممانعت ہو سکتی ہے اور اگر ضرورت کے موقع استثناء بھی ہو تو قیود کے ساتھ ہو سکتا ہے مثلاً یہ کہ باندھ کر رکھو اس لئے کہ اندھیرے میں ستاتے ہیں کسی کا دامن پکڑ لیا پیر پکڑ لیا۔ ایک ضروری انتظام یہ کرنے کے قابل ہے کہ جانوروں کے بڑے بڑے گھنٹے بندھوا دینے چاہئیں۔ ایک مرتبہ میں بعد نماز مغرب کچھ دیر سے مکان کی طرف جارہا تھا ایک سانڈ سامنے سے آ گیا اندھیرا نیز میں نیچی نظر کئے ہوئے جارہا تھا بالکل تصادم ہونے کو تھا مگر خدا تعالیٰ کی قدرت کہ وہ خود ایک طرف کو بچ گیا تو ایسے یہ سب انتظامات حکومت کر سکتی ہے اور عامہ خلائق کو راحت پہنچا سکتی ہے مگر یہ بھی جب ہی ہو سکتا ہے جب کہ راحت پہنچانا مقصود بھی ہو لیکن اس وقت اہل حق اقتدار کو راحت ہی پہنچانا مقصود نہیں محض پیسہ کمانا مقصود ہے۔ مگر پھر بھی اور گورنمنٹوں سے غنیمت ہے خود غرض سہی مگر ساتھ ہی ہماری بعضی غرض بھی پوری ہو جاتی ہے۔ ایک شخص نے خوب کہا ہے کہ بعضی گورنمنٹ کی مثال تو دق کی سی ہے جس میں گھل گھل کر مر جاتا ہے اور بعضے گورنمنٹ کی مثال ہیضہ کی سی ہے کہ چٹ پٹ کام تمام ہو جاتا ہے اور دق میں چار برس دس برس تک الجھار ہتا ہے۔ (افاضات الیومیہ ج۴ ص ۱۱۲)

حکومت کا مقصد اقامت دین ہے

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ اگر اختیار ایسا ہی سستا ہے کہ ہر مقصود کے لئے اس کا استعمال جائز ہو اس میں کوئی قید ہی نہ ہو تو اس درجہ میں تو حکومت بھی اختیاری ہے آزادی حاصل کریں یا بعنوان دیگر آج کل کی اصطلاح میں قربانی کریں اور یہ قربانی ایسی ہے کہ ذی الحجہ سے پہلے ذیقعدہ میں بھی ہو سکتی ہے۔ مگر یہ دیکھ لیں کہ یہ حکومت دین کی ہوگی یا بد دینی کی جس کا معیار حق تعالیٰ کے فرمان سے معلوم ہو سکتا ہے۔

الذین ان مکنھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکرو اللہ عاقبہ الامور.

یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دے دیں تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں اور زکوۃ دیں اور نیک کاموں کے کرنے کو کہیں اور برے کاموں سے منع کریں۔ اور سب کاموں کا انجام تو خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ اگر ایسی نیت ہے تو کوشش کریں یعنی حدود شریعت کا تحفظ شرط ہے مگر اب تو ایسا اطلاق ہو رہا ہے کہ شریعت کے خلاف ہو یا موافق (اس کی پرواہ ہی نہیں) تو ایسی حکومت تو فرعون اور شداد کو بھی حاصل تھی حکومت سے اصل مقصود اقامت دین ہے اور تدابیر اس کے اسباب ہیں اگر دین مقصود نہیں جیسا آج کل حالت ظاہر ہے تو لعنت ہے ایسی حکومت پر۔ (الافاضات الیومیہ ج۴ص ۱۸۹)

بغیر مذہب حنفی کے سلطنت نہیں چل سکتی

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ میں نے ایک انگریز کا قول دیکھا ہے وہ کہتا ہے کہ بغیر حنفی مذہب کے سلطنت چل نہیں سکتی کیونکہ اس قدر توسع اور مراعات مصالح مذہب میں نہیں پائی جاتی۔ (الافاضات الیومیہ ج۴ص ۲۹۰)

سلاطین کا اہل اللہ سے مشورہ

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ پہلے سلاطین حضرات اہل اللہ سے مشورہ لیتے تھے کیونکہ ان حضرات کے قلوب نورانی ہوتے ہیں اس لئے ان کو زیادہ تجربوں کی ضرورت نہیں۔ اسی نورانیت سیاست اور ملکی امور میں ان کا مشورہ مفید ہوتا تھا۔ (الافاضات الیومیہ ج۴ص ۲۸۳)

حکمران کو سادہ لباس پہننا ہی زیب ہے

فرمایا کہ سلاطین کہیں لکھا ہوا نہ ملے گا کہ فلاں بادشاہ پچاس گز کپڑا پہنتا تھا ہاں یہ تو ملے گا کہ فلاں بادشاہ ایسا زاہد تھا اس قدر کم قیمت اور سادہ معمولی لباس پہنتا تھا۔ (حسن العزیز ج۲ص ۸۴)

رعایا پر ہیبت جمہوری سلطنت کی نہیں ہوتی

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ آج کل جمہوریت کا زور ہے اس کی ترجیح میں کہتے ہیں

کہ شخصیت اس لئے مضر ہے کہ ایک شخص کا کچھ اعتبار نہیں دین فروشی کردے ملت فروشی کردے قوم فروشی کردے اسی خیال سے جمہوریت قائم کرنے کی چیز ہے لیکن غور کرنے سے اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ تمہارے تمدن میں نالائق بھی حاکم ہوسکتا ہے جس میں یہ احتمال ہوسکتے ہیں اور ہمارا مسلک یہ ہے کہ بادشاہ لائق ہو ایسے شخص کا انتخاب کرو جس پر یہ احتمالات ہی نہ ہوں اور جیسے شبہات تم نے شخصیت میں نکالے ہیں ایسے شبہات جمہوریت میں بھی ہوسکتے ہیں جن کے انسداد کے لئے تم نے جماعت کا انتخاب کیا ہے چنانچہ ایسے واقعات بھی کثرت سے ہیں اب اس کے بعد دیکھ لو کہ کونسی بات عقل کے موافق ہے اور کون نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ رعایا پر جو ہیبت ہوتی ہے وہ شخصیت ہی سے ہوتی ہے جمہوریت اور جماعت کی ایسی ہیبت نہیں ہوتی اور نہ اس درجہ کی ترغیب کام کی ہوسکتی ہے اس لئے کہ طبعاً اس کا بھی خاص اثر ہوتا ہے کام کرنے والوں پر کہ ہمارے اس کام سے امیر یا سردار خوش ہوا اس سے ان کا دل بڑھتا ہے اور جمہوریت میں کوئی خوش ہونے والا معین نہیں اس لئے کسی کی خوشی کا اثر ہی کیا ہوگا آج ایک جماعت انتخاب میں ہے کل دوسری ہے۔ بس اور شخصیت میں رعایا اور حاکم میں خاص تعلقات ہوتے ہیں جس کو اہل ذوق اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ (اضافات الیومیہ ج ۵ ص ۱۳۳)

جمہوریت کے کرشمے

ایک صاحب نے ایک طبی کالج کے طلباء کا ذکر کیا کہ بڑے ہی آزاد ہیں چھوٹے بڑے کی وہاں پر کوئی پرشش ہی نہیں استادوں کے ساتھ مساوات کا برتاؤ ہے۔ فرمایا کہ اب تو چھوٹے بھی بڑوں کا اتنا ادب نہیں کرتے جتنا پہلے بڑے چھوٹوں کا ادب کرتے تھے اور آج کل نہ استاد کی پرواہ ہے۔ نہ باپ کی نہ پیر کی عجیب گڑبڑ پھیل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا سے خیر و برکت اٹھتی چلی جارہی ہے۔ جمہوریت جمہوریت گاتے پھرتے ہیں یہ سب اسی کی نحوست ہے کہ نہ چھوٹے چھوٹے رہے نہ بڑے بڑے رہے اور علاوہ ان آثار کے خود مقصود کے اعتبار سے بھی یہ جمہوریت ایک کھیل ہے جو قوت شوکت ہیبت شخصیت میں ہے۔ جمہوریت میں خاک بھی نہیں اور ہو بھی کیسے محکومین سمجھتے ہیں کہا آج ایک پریذیڈنٹ ہے کل کو بدل دیا جائے گا یہ انتخاب کی

برکات اور جمہوریت کے کرشمے ہیں اس میں نہ مستحکم انتظام ہوسکتا ہے نہ وزنی کام ہوسکتا ہے بخلاف شخصیت کے کہ وہ بڑی برکت کی چیز ہے مگر عجیب عقلیں ہیں تجربہ کررہے ہیں کھلی آنکھوں مشاہدہ ہورہا ہے مگر باز نہیں آتے اس بے حسی کا کسی کے پاس کیا علاج اور پھر اس پر بھی بس نہیں شخصیت کو خلاف حکمت بتلاتے ہیں عجیب تماشا ہے۔ (افاضات الیومیہ ج ۵ ص ۱۳۲)

حجاج بن یوسف کی عبادت اور امید مغفرت کا حال

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ کسی کو کوئی کیا کہہ سکتا ہے اور کیا سمجھ سکتا ہے۔ حجاج بن یوسف جس کا ظلم مشہور ہے مگر باوجود اس کے (اس وقت ظالموں کی یہ حالت تھی کہ) ایک شب میں تین سو رکعات نفل پڑھنا اس کا معمول تھا یہ جس وقت مرنے لگا ہے تو کہتا ہے کہ اے اللہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ حجاج بن یوسف نہیں بخشا جائے گا۔ ہم تو جب جانیں جب ہم کو بخش دو متقیوں کا بخش دینا کوئی عجیب بات نہیں حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ یا کسی دوسرے تابعی سے کسی نے جا کر کہا کہ وہ یہ کہہ کر مرا ہے فرمایا بڑا چالاک ہے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ میاں سے جنت بھی لے مرے گا۔ ایک شخص نے بعد مرجانے کے اس کو خواب میں دیکھا دریافت کیا کہ کیا حال ہے کہا کہ جس قدر مظلوم میں نے قتل کئے ہیں سب کے بدلے ایک ایک مرتبہ مجھ کو قتل کیا گیا اور سعید بن جبیر کے بدلے ستر مرتبہ قتل کیا گیا اور سخت تکلیف میں ہوں پوچھا کہ اب کیا خیال ہے کہا کہ وہی خیال ہے جو سب مسلمانوں کا خدا کے ساتھ ہے۔ یعنی مغفرت کا امیدوار ہوں اور ضرور مغفرت ہوگی یہ خیال اس شخص کا ہے جو دنیا بھر کے نزدیک مبغوض اور مردود ہے وہ بھی خدا کی ذات سے ناامید نہیں ہوا اور یہ خیال تو آج کل کے بعضے لمبے لمبے وظیفوں کے پڑھنے والوں کا بھی خدا کے ساتھ اتنا قوی نہیں اب بتلایئے کوئی کسی کو کیا نظر تحقیر سے دیکھے بس جی آدمی کو چاہئے کہ اپنی خیر منائے کیوں کسی کے درپے ہو اپنی ہی کیا خبر ہے کہ کیا معاملہ ہوگا۔ (افاضات الیومیہ ج ۵ ص ۱۳۳)

کافر سیاست دان کی اقتداء کی مثال

ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت اگر ایک شخص سیاست کا ماہر ہے مگر ہے کافر اگر اس میں اس کی اقتداء کرلی جائے تو کیا حرج ہے۔ فرمایا اس کی بالکل ایسی مثال ہے کہ اگر کافر نماز

خوب جانتا ہو اور مسلمان نہ جانتا ہو تو کیا اس کافر کی اقتداء جائز ہے شبہ کا منشاء یہ ہے کہ سیاست کو لوگ دین نہیں سمجھتے خود یہی سخت غلطی اور جہل اعظم ہے سیاست بھی تو دین ہی ہے اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ اسلام نے سیاست کی تعلیم نہیں کی سو یہ کتنی بڑی تحریف ہے پھر دین میں کافر کی اقتداء کرنا کیا معنی نیز کیا اس میں اسلام اور مسلمانوں کی اہانت نہیں ہے اور کیا کوئی شخص کہیں یہ بات دکھلا سکتا ہے کہ اس طرح سے اسلام اور مسلمانوں کی اہانت کرانا اور ان کو ذلیل کرانا جائز ہے اور کیا مسلمانوں میں ایسا کوئی نہیں کہ وہ سیاست جانتا ہے البتہ اس طریق سے ان کے ساتھ مل کر کام کر سکتے ہیں کہ کافر تابع ہوں اور مسلمان متبوع اور یہاں بالکل عکس ہے کہ مسلمان تابع اور کافر متبوع اور مجھ کو عوام کی اور لیڈروں کی شکایت نہیں وہ تو جہل میں مبتلا ہیں ہی شکایت تو علماء کی ہے کہ وہ اس غلطی میں پھنس گئے حق تعالیٰ ہدایت فرمائیں اور جہل سے محفوظ مجھ کو ایسی باتیں سن کر بے حد قلق اور صدمہ ہوتا ہے جب لکھے پڑھوں کی نسبت سنتا ہوں کہ وہ ایسی خرافات کے حامی اور دلدادہ ہیں۔ **ان للہ وانا الیہ راجعون۔ عجیب بات ہے کہ** خسران کا کھلی آنکھوں سے مشاہدہ ہو رہا ہے۔ (الافاضات الیومیہ ج ۳ ص ۱۶۹)

خالص مذہبی سیاست

مذہب اسلام میں جو ایک حصہ سیاسیات کا ہے وہ مدون ہے اس تدین کے موافق اس کو اختیار کرو۔ وہ بہت کافی ہے اور وہ خالص مذہبی سیاست ہے اس میں گڑبڑ اور کتر بیونت کرنا جائز نہیں جیسا کہ آج کل کے طبائع میں یہ مرض ہو گیا ہے کہ ہر جگہ اپنی رائے کو دخل دینا چاہتے ہیں۔ (اصلاح المسلمین ص ۵۳۳)

سب کفار مسلمانوں کے دشمن ہیں

بعض لوگ کفار کی ایک جماعت کو برا کہتے ہیں اور بعض دوسری جماعت کو میں کہتا ہوں دونوں برے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ ایک نجاست مرئیہ ہے ایک نجاست غیر مرئیہ اور ہیں دونوں نجاست کافر جتنے ہیں سب اسلام کے دشمن ہیں کوئی گورا ہو یا کالا دونوں ہی سانپ ہیں بلکہ گورے سانپ سے کالا سانپ زیادہ زہریلا ہوتا ہے۔ (اصلاح المسلمین ص ۵۱۶ ص ۵۱۷)

کفار بھی مسلمانوں کو اپنا اصلی مخالف سمجھتے ہیں

گو کفار کسی اپنی مصلحت سے مسلمانوں کی کچھ رعایت کریں مگر یہ یقینی بات ہے کہ وہ اسلام کو اپنے لئے مضر سمجھتے ہیں اور اس واسطے اس کے مٹانے کی فکر میں ہیں۔ (اصلاح المسلمین ص ۵۱۷)

مسلمانوں کے دوست

یہ مسلمانوں کی انتہائی بدفہمی ہے کہ غیر قوموں کے بغلوں میں جا کر گھستے ہیں ان کو اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین امنوا حصر کے ساتھ فرماتے ہیں کہ تمہارا کوئی دوست نہیں سوائے اللہ کے اور رسول اور مومنین کے۔ (اصلاح المسلمین ص ۵۱۶)

حکام وقت کو برا کہنا بے صبری کی علامت ہے

بعض لوگ مصائب سے تنگ آ کر حکام وقت کو برا بھلا کہتے ہیں یہ بھی علامت ہے بے صبری کی اور پسندیدہ تدبیر نہیں اور حدیث شریف میں اس سے ممانعت بھی آئی ہے چنانچہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے "بادشاہوں کو برا مت کہو ان کے قلوب میرے قبضے میں ہیں میری اطاعت کرو میں ان کے دلوں کو تم پر نرم کردوں گا۔"

یاد رکھو جو مصیبت آتی ہے منجانب اللہ ہوتی ہے فرماتے ہیں ما اصاب من مصیبۃ الا باذن اللہ یعنی کوئی مصیبت نہیں آتی مگر اللہ کے حکم سے" اور جب کہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہے تو اس کا علاج یہی ہے کہ ادھر رجوع کرے اور پھر جو پیش آئے خبر سمجھے اس لئے کہ

ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود

اور شیخ شیرازیؒ فرماتے ہیں۔

از خداداں خلاف دشمن و دوست
(ص ۵۲۳)

کہ دل ہر دو در تصرف اوست
(ص ۵۲۲)

کامیابی کی اصل تدبیر

مسلمانوں کا سوائے خدا کی ذات کے کوئی حامی نہیں اور مددگار نہیں اور ان کو اور کسی کی

ضرورت بھی نہیں۔ میں سچ عرض کرتا ہوں کہ اگر مسلمانوں میں نظم ہو اور دین ہو تو تمام دنیا کی غیر مسلم اقوام اس کی حالت میں بھی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں۔ لیکن مسلمان ویسے تو بہت کچھ گڑ بڑ کرتے ہیں مگر جو اصل تدبیر ہے اور کام کی تدبیر ہے جس سے پہلوں کو کامیابی میسر ہو چکی ہے وہ نہیں کرتے وہ تدبیر یہ ہے کہ اپنے خدا کو راضی کرنے کی فکر کریں۔ اب تو بڑی تدبیر ان کی مشرکوں کی تعلیم پر عمل کرنا ہے ان کو لوگ عاقل سمجھتے ہیں بھلا ایسا شخص کیا عاقل ہوگا جس کو انجام کی خبر نہیں اگر ایسے لوگ عاقل ہوتے تو آخرت کی فکر کرتے۔ (اصلاح المسلمین ص ۵۳۸ ص ۵۳۹)

اسلام کی قوت کا مدار شخصیتوں پر نہیں

اسلام کی قوت کا مدار حق پر ہے اور حق میں وہ قوت ہے کہ اگر ایک شخص حق پر ہو اور سارا عالم اس کا مخالف ہو تو وہ ضعیف نہیں اور اگر یہ شخص حق پر نہیں سارا عالم اس کا معتقد ہو وہ شخص ضعیف ہے اس میں کچھ قوت نہیں۔ (اصلاح المسلمین ص ۵۳۵)

سلاطین السام کا احترام لازم ہے

سلاطین اسلام کی علی الاعلان اہانت میں ضرر ہے جمہور کا ہیبت نکلنے سے فتن پھیلتے ہیں اس لئے سلاطین اسلام کا احترام کرنا چاہئے۔ (اصلاح المسلمین ص ۵۲۲)

قانون شریعت مصلحت عامہ کے خلاف نہیں

کوئی قانون مصالح خاصہ کا ذمہ دار نہیں ہوتا اور نہ ہوسکتا ہے کیونکہ مصالح خاصہ آپس میں متناقض ہوتے ہیں جن کا جمع ہوسکنا بھی محال ہے بلکہ قانون مصالح عامہ کی حفاظت کرتا ہے سو بحمد اللہ قانون شریعت مصلحت عامہ کے خلاف نہیں۔ (اصلاح المسلمین ص ۵۳۵ ص ۵۳۶)

آج کل کی سیاست میں غیر شرعی اموری نشاندہی

آج کل کی سیاست میں گرفتاری پیش کرنا جیل جانا، مار کھانا، ہڑتالیں کرنا اور جلوس وغیرہ نکالنا مطالبات منوانے کے لئے موثر تدبیر سمجھی جاتی ہے شریعت میں اس کی قطعاً گنجائش نہیں۔ تفصیل کیلئے اشرف الاحکام مطبوعہ ادارہ تالیفات اشرفیہ ہارون آباد ضلع بہاولنگر کا مطالعہ کریں۔

خلاف شرع امور میں حاکم اطاعت جائز نہیں

امیر اگر عدل پر قائم ہے تو اس کی اطاعت واجب ہے اور اگر وہ عدل وانصاف کو چھوڑ کر خلاف شرع احکام صادر کرے تو ان میں امیر کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لاطاعة المخلوق فی معصیة الخالق یعنی مخلوق کی ایسی اطاعت جائز نہیں۔ جس سے خالق کی نافرمانی لازم آتی ہے۔ (مسائل معارف القرآن ص ۱۹۰)

حاکم کو اپنی رعیت کی گیری رکھنا ضروری ہے

حاکم کو اپنی رعیت اور مشائخ کو اپنے شاگردوں اور مریدوں کی خبر گیری رکھنا ضروری ہے۔ (معارف القرآن ج ۴ ص ۵۷۰)

اسلامی حکومت ایک شورائی حکومت ہے

اسلامی حکومت ایک شورائی حکومت ہے، امیر کا انتخاب مشورہ سے ہوتا ہے۔ خاندانی وراثت سے نہیں۔ آج تو اسلامی تعلیمات کی برکت سے پوری دنیا میں اس اصول کا مانا جاچکا ہے۔ شخصی بادشاہتیں بھی طوعاً وکرہاً۔

لیکن موجودہ طرز کی جمہوریتیں چونکہ بادشاہی ظلم وستم کے ردعمل کے طور پر وجود میں آئیں تو وہ بھی اس بے اعتدالی کے ساتھ آئیں کہ عوام کو مطلق انسان بنا کر پورے آئین حکومت اور قانون مملکت کا ایسا آزاد مالک بنایا کہ ان کے قلب ودماغ زمین وآسمان اور تمام انسانوں کے پیدا کرنے والے خدا اور اس کی اصلی مالکیت وحکومت کے تصور سے بھی بے گانہ ہوگئے اب ان کی جمہوریت خدا تعالیٰ کے بخشے ہوئے عوامی اختیار خدا تعالیٰ کی عائد کردہ پابندیوں کو بھی بار خاطر خلاف انصاف تصور کرنے لگے۔

(مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ معارف القرآن ص ۲۲۳ تا ص ۲۲۶ ج ۱)

اسلام میں جمہوریت کا تصور

ازافادات: حکیم الامت مجدد ملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ

نظام عالم تابعیت و متبوعیت کو چاہتا ہے۔ اس لئے متبوع کو تابع کی مساوات گوارا نہیں اسی وجہ سے سلطنت کی ضرورت ہے۔ تاکہ ایک تابع ہو، ایک متبوع ہو سب کے سب آزاد ہوں بلکہ متبوع کے سامنے تابع کی آزادی سلب ہو جائے یہ حقیقت ہے سلطنت کی۔ اگر سلطنت نہ ہو تو ہر شخص آزاد ہوگا اور آزادی مطلق انتظام کے لئے ہرگز کافی نہیں اور نہ کسی نے آج تک اس کو گوارا کیا...... بعض لوگ کہتے ہیں کہ سلطنت کوئی چیز نہیں۔ چنانچہ آج کل ایک فرقہ نکلا ہے جو سلطنت کا مخالف ہے۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ بدوں سلطنت کے انتظام نزاعات کا فیصلہ کیونکر ہوگا۔ اگر کہو کہ کثرت رائے سے فیصلہ ہوگا تو میں کہتا ہوں کہ جن کثیرین کی رائے پر فیصلہ ہوگا۔ وہی سلطنت کے مصداق ہو گئے۔ کیونکہ ان کے سامنے دوسروں کی آزادی سلب ہوگئی اور یہی حقیقت ہے سلطنت کی۔ کہ بعض کی آزادی بعض کی رائے کے سامنے سلب ہو جائے۔ کثرت رائے پر فیصلہ ہونے کے بعد بھی آزادی مطلق کہاں رہی اس فیصلہ کی پابندی سے بھی تو آزادی سلب ہوگی۔ تو یہ لوگ جس چیز کو مٹاتے ہیں اخیر میں اس کو ثابت کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے بھی آزادی مطلق کو گوارا نہیں کیا بلکہ ایک کو تابع ایک کو متبوع بنایا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے اپنے احکام نبی کے واسطہ سے بھیجے ہیں اور تمام مخلوق پر نبی کا اتباع فرض کیا ہے۔ تاکہ مخلوق کو کسی ایک کا تابع کیا جائے۔ ورنہ بہت سہل تھا کہ انبیاء کو نہ بھیجتے بلکہ آسمان سے چھپے ہوئے کاغذ ہر ایک کے پاس آ گرا کرتے اور ہر شخص اس کو پڑھ کر کام کرتا نہ نبی کا اتباع ضروری ہوتا نہ خلیفہ کا نہ علماء و مجتہدین کا......

شاید کوئی کہے کہ خدا تعالیٰ کے یہاں پریس کہاں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب تم نے پریس ایجاد کر لئے ہیں تو خدا تعالیٰ کو پریس بنا لینا کیا مشکل ہے۔ بلکہ جو کچھ تم ایجاد کرتے ہو یہ عقل سے ایجاد کرتے ہو اور عقل خدا کی دی ہوئی ہے۔ تو یہ ایجاد بھی حقیقت میں خدا تعالیٰ

کی ایجاد ہے تمہارا تو محض نام ہی نام ہے۔ اس لئے یہ شبہ محض لغو ہے۔ دوسرے میں دعویٰ کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ کے یہاں اس وقت بھی پریس موجود ہے کیونکہ کاتبین اعمال کا لکھا ہوا قیامت تک نہ مٹے گا۔ ایسی سیاہی اور ایسا کاغذ تو کسی پریس کو بھی نصیب نہیں جو قیامت تک باقی رہے۔ تو پھر کاتبین اعمال آپ کے کاموں کو ایسی سیاہی سے روزانہ لکھتے ہیں۔ وہی اگر احکام کو لکھ کر ہر شخص کے پاس ڈال دیا کریں تو کیا مشکل ہے۔ مگر حق تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا بلکہ احکام کو نبی پر نازل کیا۔ اور مخلوق کو نبی کا تابع کیا تا کہ آزادی سلب ہو جائے۔ جو لوگ جمہوری سلطنت کے حامی ہیں۔ اور حریت و مساوات کے مدعی ہیں۔ وہ بھی آزادی کا عام ہونا گوارا نہیں کرتے کیونکہ جمہوری سلطنت کے بعد بھی وہ کوئی قانون ہوگا جس کی پابندی عام رعایا پر لازم ہوگی۔ تو اس قانون کے سامنے سب کی آزادی سلب ہو جائے گی ہم تو آزادی کا دعویٰ جب مانیں گے جبکہ کسی شخص کو بھی قانون کا پابند نہ کیا جاوے بلکہ جس کے جو جی میں آوے کرنے دیا جائے۔ کسی سے کچھ مزاحمت نہ کی جاوے کیونکہ تم تو آزادی کے حامی ہو تو اسی کا نام ہے کہ کوئی کسی بات کا پابند نہ ہو۔ پھر تم لوگوں کو قانون کا پابند کیوں بناتے ہو اور ان کی آزادی کو قانون کا تابع کیوں بناتے ہو یا کم از کم یہی کرو کہ قانون بنانے میں ساری رعایا کی رائے لے لیا کرو۔ قانون سازی کے لئے پارلیمنٹ کی مختصر جماعت کو کیوں خاص کر رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ جمہوری سلطنت کے حامی ہیں وہ بھی شخصیت ہی کے حامی ہیں۔ مگر شخص کبھی حقیقی ہوتا ہے کبھی حکمی۔ فلسفہ کا مسئلہ یہ ہے کہ مجموعہ بھی شخص واحد ہے مگر وہ واحد حکمی ہے حقیقی نہیں۔ تو یہ لوگ جس پارلیمنٹ کے فیصلوں کا اتباع کرتے ہیں اس میں گو بظاہر بہت سے آدمی ہوتے ہیں مگر مجموعہ مل کر پھر شخص واحد ہے کیونکہ جو قانون پاس ہوتا ہے وہ سب کی رائے سے مل کر پاس ہوتا ہے۔ پارلیمنٹ میں بھی ہر شخص آزاد نہیں کہ جو شخص جو رائے دے دے وہی پاس ہو جایا کرے۔ اگر ایسا بھی ہوتا جب بھی کسی قدر آزادی کا دعویٰ صحیح ہوتا۔ مگر وہاں تو پارلیمنٹ کے بھی ہر شخص کی انفرادی رائے معتبر نہیں بلکہ اجتماعی رائے معتبر ہے اور اجتماعی رائے پھر شخصی رائے ہے کیونکہ مجموعہ مل کر واحد حکمی ہو جاتا ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ ہم شخص واحد حقیقی کے حامی ہیں اور تم شخص واحد حکمی

کے حامی ہو۔ جمہوریت کے حامی تو تم بھی نہ رہے۔ جمہوریت اور آزادی کامل تو جب ہوتی جب ہر شخص اپنے فعل میں آزاد ہوتا۔ کوئی کسی کا تابع نہ ہوتا۔ نہ ایک بادشاہ کا نہ پارلیمنٹ کے دس ممبروں کا اور یہ کیا آزادی ہے کہ تم نے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کو پارلیمنٹ کے دس ممبروں کی رائے کا تابع بنادیا ہم تو ایک ہی کا غلام بناتے تھے تم نے دس کا غلام بنادیا۔ تمہیں فیصلہ کرلو کہ ایک کا غلام ہونا اچھا ہے یا دس بیس کا غلام ہونا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص پر ایک کی حکومت ہو وہ اس سے بہتر ہے جس پر دس کی حکومت ہو۔ یہ حاصل ہے جمہوری سلطنت کا کہ رعایا کی غلامی سے تو اس کو بھی انکار نہیں مگر وہ یہ کہتی ہے کہ تم دس بیس کی غلامی کرو۔ اور ہم یہ کہتے ہیں کہ صرف ایک کی غلامی کرو۔ شریعت میں یہ خاص بات ہے کہ اس کے دعوے کہیں نہیں ٹوٹتے۔ شریعت نے آزادی کا ایسے زور سے دعویٰ ہی نہیں کیا۔ جو اس پر نقص وارد ہو۔ اور جو لوگ آزادی کا دم بھرتے ہیں کسی وقت ان کو اپنے دعویٰ سے ہٹنا پڑتا ہے آخر کیوں ہٹتے ہو۔

اگر کوئی شخص پارلیمنٹ کے فیصلہ کو نہ مانے تو اس کو مجبور کیوں کرتے ہو اسے پارلیمنٹ کا غلام کیوں بناتے ہو آزاد کیوں نہیں رہنے دیتے مگر کیونکر آزاد رہنے دیں۔ نظام عالم بدوں اس کے قائم نہیں ہوسکتا کہ مخلوق میں بعض تابع ہوں۔ بعض متبوع ہوں۔ آزادی مطلق سے فساد برپا ہوتے ہیں۔ اس لئے یہاں آ کر ان کو اپنے دعویٰ آزادی سے ہٹنا پڑتا ہے اور شریعت کو کبھی اپنے دعویٰ سے ہٹنا نہیں پڑتا۔ کیونکہ وہ تو پہلے ہی سے تابعیت و متبوعیت کی حامی ہے۔ وہ تو آزادی کا سبق سکھاتی ہی نہیں اول ہی دن سے نبی کے اتباع کا حکم دیتی ہے۔ جس نے تمام مخلوق کو ایک کا تابع کردیا۔ بلکہ اگر کسی وقت خدا تعالیٰ نے ایک زمانے میں دو نبی بھی ایک قوم کی طرف ارسال کئے ہیں تو ان میں بھی ایک تابع تھے۔ دوسرے متبوع تھے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام ایک زمانہ میں دو نبی تھے۔ جو بنی اسرائیل و قوم قبط کی طرف مبعوث ہوئے تھے مگر ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام متبوع تھے۔ حضرت ہارون علیہ السلام تابع تھے۔ دونوں برابر درجہ میں نہ تھے۔ اور یہ تابعیت محض ضابطہ کی تابعیت نہ تھی بلکہ واقعی تابعیت تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہارون علیہ السلام پر پوری حکومت رکھتے تھے۔ وہ ان کی مخالفت نہ کرسکتے تھے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ایک واقعہ ایسا پیا کردیا جس سے اس حقیقت کا

ظہور ہو گیا۔ جب موسیٰ علیہ السلام تورات لینے کے لئے کوہ طور پر تشریف لے گئے تو ہارون علیہ السلام کو اپنا خلیفہ بنا کر چھوڑ گئے تھے کہ میرے پیچھے بنی اسرائیل کا خیال رکھنا اور ان کی اصلاح کرتے رہنا۔ یہاں پیچھے یہ قصہ ہوا کہ سامری نے ایک سونے کا بچھڑا بنایا اور اس میں دم جبرائیل کی مٹی ڈال دی جس سے اس میں حیات پیدا ہو گئی۔ "**فقالوا هذا الهكم واله موسٰى فنسى**" جاہل لوگ کہنے لگے کہ ہمارا اور موسیٰ علیہ السلام کا خدا تو یہ ہے۔ وہ بھول کر نامعلوم کہاں چلے گئے بس بے وقوف لگے اس کی عبادت کرنے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے اس واقعہ کی اطلاع دی۔ وہ غصہ میں بھرے ہوئے تشریف لائے اور قوم کی حالت دیکھ کر افسوس ہوا۔ اسی وقت انہوں نے ہارون علیہ السلام سے فرمایا کہ جب یہ کم بخت گمراہ ہو گئے تھے تو تم یہاں کیوں رہے۔ میرے پاس باقی ماندہ جماعت کو لے کر کیوں نہ چلے آئے اور غصہ میں ان کا سر اور ڈاڑھی پکڑ کر کھینچنے لگے۔

قال یا ابن ام لا تاخذ بلحیتی ولا براسی" ہارون علیہ السلام نے کہا کہ ارے بھائی میری ڈاڑھی اور سر کو نہ پکڑو۔ میری بات سنو! مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ اگر میں ان کو چھوڑ کر چل دوں گا تو آپ یہ نہ کہیں کہ تو نے وہاں رہ کر ان کو سمجھایا کیوں نہیں۔ ان کی اصلاح کیوں نہ کی۔ اس لئے میں یہیں رہ کر ان کو سمجھاتا رہا۔ حالانکہ ہارون علیہ السلام عمر میں موسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے مگر نبوت میں ان کے تابع تھے اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے بے تکلف اپنی متبوعیت اور ان کی تابعیت کے مقتضیٰ پر عمل کیا اور وہ برتاؤ کیا جو حاکم محکوم کے ساتھ کرتا ہے۔ آج ایک سب انسپکٹر باوجود یہ کہ انسپکٹر کا تابع اور ماتحت ہوتا ہے مگر انسپکٹر اپنے ماتحت کے ساتھ ایسا کر کے تو دیکھیں۔ معلوم ہوا کہ ہارون علیہ السلام کی تابعیت محض ضابطہ کی نہ تھی بلکہ واقعی تابعیت تھی جس کا اس واقعہ سے ظہور ہو گیا اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ دونوں رسولوں میں ایک تابع ہیں۔ ایک متبوع ہیں اور دونوں یکساں مرتبے میں نہیں ہیں۔
اس واقعہ سے بعض لوگوں کو تعجب ہوتا ہو گا کہ موسیٰ علیہ السلام کے اس فعل میں کیا حکمت تھی۔ لیجئے ایک حکمت تو میرے قلب پر اسی وقت آ گئی کہ حق تعالیٰ کی متبوعیت اور تابعیت کا ظاہر کرنا تھا۔ اس لئے موسیٰ علیہ السلام کو غصہ نے ایسا بیتاب کر دیا۔ جس سے انہوں نے اپنی

حکومت و متبوعیت کے مقتضا پر بے تکلف عمل کیا اور نہ معلوم کتنی حکمتیں ہوں گی۔

غرض اسلام میں جمہوری سلطنت کوئی چیز نہیں۔ اسلام میں محض شخصی حکومت کی تعلیم ہے......اور جن مفاسد کی وجہ سے جمہوری سلطنت قائم کی گئی ہے وہ سلطنت شخصی میں تو محتمل ہی ہیں اور جمہوری میں متیقن ہیں۔ شخصی سلطنت میں یہ خرابیاں بیان کی جاتی ہیں کہ اس میں ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ حالانکہ ممکن ہے کہ کسی وقت اس کی رائے غلط ہو۔ اس لئے ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام نہ چھوڑنا چاہئے بلکہ ایک جماعت کی رائے سے کام ہونا چاہئے۔ میں کہتا ہوں کہ جس طرح شخصی سلطنت کے بادشاہ کی رائے میں کبھی غلطی کا احتمال ہے اسی طرح جماعت کی رائے میں بھی غلطی کا احتمال ہے۔ کیونکہ یہ ضرور نہیں کہ ایک شخص کی رائے ہمیشہ غلط ہوا کرے اور دس کی رائے ہمیشہ صحیح ہوا کرے بلکہ ایسا بھی بکثرت ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کا ذہن وہاں پہنچتا ہے جہاں ہزاروں آدمیوں کا ذہن نہیں پہنچتا۔ ایجادات عالم میں رات دن اس کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ کیونکہ جتنی ایجادات ہیں وہ اکثر ایک ایک شخص کی عقل کا نتیجہ ہیں۔ کسی نے کچھ سمجھا کسی نے کچھ سمجھا کسی نے کچھ سمجھا۔ ایک نے تار برقی کو ایجاد کیا ایک نے ریل کو ایجاد کیا تو موجد اکثر شخص ہوتا ہے اور اس کا ذہن وہاں پہنچتا ہے جہاں صدہا ہزارہا مخلوق کا ذہن نہیں پہنچتا علوم میں بھی یہ امر مشاہد ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کسی مضمون کو اس طرح صحیح حل کرتا ہے کہ تمام شراح و محشین کی تقریریں اس کے سامنے غلط ہو جاتی ہے تو جماعت کی رائے کا غلط ہونا بھی محتمل ہے۔ تو اب بتلایئے اگر کسی وقت بادشاہ کی رائے صحیح ہوئی اور پارلیمنٹ کی رائے غلط ہوئی تو عمل کس پر ہوگا۔ جمہوری سلطنت میں کثرت رائے پر فیصلہ ہوتا ہے تو بادشاہ اپنی رائے پر عمل نہیں کرسکتا۔ بلکہ کثرت رائے سے مغلوب ہوکر غلط رائے کی موافقت پر مجبور ہوتا ہے اور شخصی سلطنت میں بادشاہ اپنی رائے پر ہر وقت عمل کرسکتا ہے اور جمہوری میں اگر کثرت رائے غلطی پر ہوئی تو صحیح رائے پر عمل کرنے کی کوئی صورت نہیں۔ سب مجبور ہیں۔ غلط رائے کی موافقت پر۔ اور یہ کتنا بڑا ظلم ہے اس لئے یہ قاعدہ ہی غلط ہے کہ کثرت رائے پر فیصلہ کیا جائے۔ بلکہ قاعدہ یہ ہونا چاہئے کہ صحیح رائے پر عمل کیا جاوے۔ خواہ وہ ایک ہی شخص کی رائے ہو مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی نے سید احمد خان سے کہا

تھا کہ آپ لوگ جو کثرت رائے پر فیصلہ کرتے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ حماقت کی رائے پر فیصلہ کرتے ہو۔ کیونکہ قانون فطرت یہ ہے کہ دنیا میں عقلاء کم ہیں اور بے وقوف زیادہ تو اس قاعدہ کی بنا پر کثرت رائے کا فیصلہ بے وقوفی کا فیصلہ ہوگا۔ سید احمد خان نے جواب دیا کہ دنیا میں جو عقلاء کی قلت اور بیوقوفوں کی کثرت ہے یہ اس صورت میں ہے جبکہ بہت سے آدمیوں کو کیف ما اتفق جمع کرلیا جاوے تو ان میں واقعی بے وقوف زیادہ ہوں گے لیکن ہم جن لوگوں کی کثرت رائے پر فیصلہ کرتے ہیں وہ کیف ما اتفق جمع نہیں کیے جاتے بلکہ انتخاب کر کے خاص خاص آدمیوں کی کمیٹی بنائی جاتی ہے جس میں سب عقلاء ہی ہوتے ہیں۔ تو ان میں جس طرف کثرت ہوگی وہ بے وقوفوں کی کثرت نہ ہوگی بلکہ عقلاء کی کثرت ہوگی مولانا نے جواب دیا کہ بہت اچھا۔ لیکن عقلاء میں بھی قانون فطرت یہ ہے کہ کامل العقل تھوڑے ہیں اور ناقص العقل زیادہ۔ چنانچہ تجربہ کرلیا جائے کہ ہزار عاقلوں میں کامل العقل دو ہی ہوتے ہیں۔ تو عقلاء میں بھی کثرت انہی لوگوں کی ہے جو ناقص العقل ہیں پس کثرت رائے پر فیصلہ اگر حماقت کا فیصلہ نہیں تو کم عقلی کا فیصلہ تو ضرور ہی ہوگا۔

سید احمد خان کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ بالکل خاموش ہی ہوگئے۔ غرض صحیح رائے پر عمل کرنا بجوں شخصی حکومت کے ممکن نہیں جمہوری میں تو کثرت رائے کا اتباع لازم ہے۔ خواہ وہ غلط ہو یا صحیح ہو بلکہ مولانا محمد حسین صاحب کے قول کے موافق کثرت رائے اکثر غلط ہی ہوگی تو گویا جمہوری میں اکثر غلط رائے پر عمل ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک صحیح رائے پر عمل نہ ہوگا اس وقت تک انتظام درست نہیں ہوسکتا پس ثابت ہوگیا کہ انتظام بدوں شخصی حکومت نہیں ہوسکتا۔

دوسرے جو لوگ کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھتے ہیں وہ بادشاہ کو تنہا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں دیتے۔ وہ پہلے ہی سے اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارا بادشاہ ایسا ضعیف الرائے ہے کہ اس کی تنہا رائے قابل اعتبار نہیں اور وہ نا اہل ہے تو واقعی جو لوگ اپنے بادشاہ کو ایسا سمجھتے ہیں ہم ان سے گفتگو نہیں کرتے ان کو جمہوریت مبارک ہو۔ ایسا نا اہل بادشاہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کو شخصی سلطنت کا بادشاہ بنایا جائے۔ اسلام میں جو شخصی سلطنت کی تعلیم ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ اے اہل حل وعقد اور اے جماعت عقلاء بادشاہ ایسے شخص کو

بناؤ جو اتنا صاحب الرائے ہو کہ اگر کبھی اس کی رائے سارے عالم کے بھی خلاف ہو تو یہ احتمال ہو سکے کہ شاید اس کی رائے صحیح ہو۔ اور جس کی رائے میں اتنی زرانت نہ ہو اس کو ہرگز بادشاہ نہ بناؤ اب بتاؤ جس کی رائے اتنی زرین ہو کہ سارے عالم کے مقابلہ میں کبھی اس کی رائے کے صائب ہونے کا احتمال ہو۔ وہ حکومت شخصی کے قابل ہے، بشرطیکہ اہل حل و عقد انتخاب میں خیانت نہ کریں۔ بس ہم شخصی سلطنت کے اس لئے حامی ہیں کہ ہم بادشاہ کو زرین العقل صائب الرائے سمجھتے ہیں اور تم کثرت رائے کے اس لئے حامی ہو کہ تم اپنے بادشاہ کو ضعیف الرائے اور نا اہل سمجھتے ہو۔ تو ایسے شخص کو بادشاہ بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے جس کے لئے ضم ضمیمہ کی ضرورت ہو بلکہ پہلے ہی سے بادشاہ ایسے شخص کو بناؤ جو ضم ضمیمہ کا محتاج نہ ہو۔ مستقل الرائے ہو اور اگر تم بھی اپنے بادشاہ کو مستقل الرائے صائب العقل زرین سمجھتے ہو تو پھر کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھنا اور کامل العقل کو ناقصین کی رائے کے تابع بنانا ظلم ہے۔ جس کا حماقت ہونا بدیہی ہے۔ بعض لوگوں کو یہ حماقت سوجھی ہے کہ وہ جمہوری سلطنت کو اسلام میں ٹھونسنا چاہتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام میں جمہوریت کی تعلیم ہے اور استدلال میں یہ آیت پیش کرتے ہیں کہ **وشاورھم فی الامر** مگر یہ بالکل غلط ہے۔ ان لوگوں نے مشورہ کی دفعات ہی کو دفع کر دیا۔ اور اسلام میں مشورہ کا جو درجہ ہے۔ اس کو بالکل نہیں سمجھا۔ اسلام میں مشورہ کا درجہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا تھا کہ اے بریرہ تم اپنے شوہر سے رجوع کر لو۔ قصہ یہ ہوا تھا کہ حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پہلے باندی تھیں اور اسی حالت میں ان کا نکاح ایک شخص سے جن کا نام مغیث تھا ان کے آقا نے کر دیا تھا۔ جب وہ آزاد ہوئیں تو قانون اسلام کے مطابق ان کو یہ اختیار دیا گیا کہ جو نکاح حالت غلامی میں ہوا تھا اگر چاہیں اس کو باقی رکھیں، اگر چاہیں فسخ کر دیں۔ اصطلاح شریعت میں اس کو اختیار عتق کہتے ہیں اس اختیار کی بنا پر حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے نکاح سابق کو فسخ کر دیا لیکن ان کے شوہر کو ان سے بہت محبت تھی۔ وہ صدمہ فراق میں مدینہ کی گلی کوچوں میں روتے پھرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر رحم آیا اور حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کیا اچھا ہو اگر تم اپنے شوہر سے رجوع

کرلو۔ تو وہ دریافت فرماتی ہیں کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے یا مشورہ کی ایک فرد ہے اگر حکم ہے تو بسر وچشم منظور ہے۔ گو مجھ کو تکلیف ہی ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حکم نہیں صرف مشورہ ہے۔ تو حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے صاف عرض کر دیا کہ اگر مشورہ ہے تو میں اس کو قبول نہیں کرتی۔

لیجئے اسلام میں یہ درجہ ہے مشورہ کا کہ اگر نبی اور خلیفہ تو بدرجہ اولیٰ رعایا کے کسی آدمی کو مشورہ دیں تو اس کو حق ہے کہ مشورہ پر عمل نہ کرے اور یہ محض ضابطہ کا حق نہیں بلکہ واقعی حق ہے۔ چنانچہ حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ پر عمل نہ کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ذرا بھی ناراض نہ ہوئے۔ نہ حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو کچھ گناہ ہوا نہ ان پر کچھ عتاب ہوا سو جب امت اور رعایا اپنے نبی یا بادشاہ کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے اسلام میں مجبور نہیں تو نبی یا خلیفہ رعایا کے مشورہ سے کیونکر مجبور ہو جائے گا کہ رعایا جو مشورہ دے اسی کے موافق عمل کرے۔ اس کے خلاف کبھی نہ کرے۔ پس "**شاورھم فی الامر**" سے صرف یہ ثابت ہوا کہ حکام رعایا سے مشورہ کر لیا کریں۔ یہ کہاں ثابت ہوا کہ ان کے مشورہ پر عمل بھی ضرور کیا کریں اور اگر کثرت رائے بادشاہ کے خلاف ہو جائے تو کثیرین کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہے اور جب تک یہ ثابت نہ ہو اس وقت تک "**شاورھم فی الامر**" سے جمہوریت ہرگز ثابت نہیں ہو سکتی۔

جب اسلام میں ایک معمولی آدمی بھی بادشاہ کے مشورہ پر مجبور نہیں ہوتا۔ تو تم بادشاہ کو رعایا کے مشورہ پر کیونکر مجبور کرتے ہو۔ آخر اس کی کوئی دلیل بھی ہے یا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ اور ہمارے پاس حدیث بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا دلیل موجود ہے۔ کہ کسی کے مشورہ پر عمل کرنا ضروری نہیں۔ خواہ نبی ہی کا مشورہ کیوں نہ ہو اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اگر حکام رعایا سے مشورہ لیں تو وہ ان کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہرگز نہیں ہیں۔ بلکہ عمل خود اپنی رائے پر کریں۔ خواہ وہ دنیا بھر کے مشورہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو چنانچہ اس آیت میں آگے ارشاد ہے:۔

فاذا عزمت فتوکل علی اللہ

کہ مشورہ کے بعد جب آپ ارادہ کسی بات کا کریں تو خدا پر بھروسہ کرکے اس پر عمل

کریں۔ یہاں اذاعزمت صیغہ واحد ہے۔ معلوم ہوا کہ عزم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم مستقل تھے۔ اسی طرح آپ کا نائب یعنی سلطان بھی عزم میں مستقل ہے۔ اگر عزم کا مدار کثرت رائے پر ہوتا تو **اذا عزمت** نہ فرماتے بلکہ اس کی بجائے **اذا عزم اکثرکم فتوکلوا علی اللہ** فرماتے۔ پس جس آیت سے یہ لوگ جمہوریت پر استدلال کرتے ہیں اس کا اخیر جز وخود ان کے دعویٰ کی تردید کررہا ہے۔ مگر ان کی حالت یہ ہے **حفظت شیئاً وغابت عنک اشیا** کہ ایک جزو کو دیکھتے ہیں اور دوسرے جزو سے آنکھیں بند کرلیتے ہیں۔ دوسرے اس آیت میں صرف حکام کو یہ کہا گیا ہے کہ وہ رعایا سے مشورہ کرلیا کریں۔ رعایا کو تو یہ حق نہیں دیا گیا کہ ازخود استحقاقاً حکام کو مشورہ دیا کرو چاہے وہ مشورہ لیں یا نہ لیں۔ اہل مشورہ ان کو مشورہ سننے پر مجبور کرسکیں۔ چنانچہ شریعت میں **اشیروا الحکام وھو حقکم علیھم** کہیں نہیں کہا گیا۔ جب رعایا کو ازخود مشورہ دینے کا کوئی حق بدرجہ لزوم نہیں تو پھر اسلام میں جمہوریت کہاں ہوئی۔ کیونکہ جمہوریت میں تو پارلیمنٹ کو ازخود رائے دینے کا حق ہوتا ہے۔ چاہے بادشاہ سے رائے لے یا نہ لے۔ یہاں تک کہ اگر بادشاہ پارلیمنٹ سے بغیر رائے لئے کوئی حکم نافذ کردے۔ تو اس پر چاروں طرف سے لے دے ہوتی ہے کہ ہم سے بدوں مشورہ لئے یہ حکم جاری کیا گیا۔ بھلا رعایا کو یہ حکم اسلام میں کہاں دیا گیا ہے ذرا کوئی صاحب ثابت تو کریں۔ پس یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ اسلام میں جمہوریت کی تعلیم ہے۔ (تقلیل الاختلاط مع الانام ص ۴۸)

کثرت رائے کلیہ دلیل نہیں کہ حق اسی میں ہے

ج نمبر۱: آج کل یہ عجیب مسئلہ نکلا ہے کہ جس طرف کثرت رائے ہو وہ بات حق ہوتی ہے۔ صاحبو! یہ ایک حد تک صحیح ہے مگر یہ بھی معلوم ہے کہ رائے سے کس کی رائے مراد ہے۔ کیا ان عوام کالانعام کی؟ اگر انہی کی رائے مراد ہے تو کیا وجہ کہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کی رائے پر عمل نہیں کیا، ساری قوم ایک طرف رہی اور حضور ہود علیہ السلام ایک طرف۔ آخر انہوں نے کیوں توحید چھوڑ کر بت پرستی اختیار نہ کی۔ کیوں تفریق قوم کا الزام سرلیا۔ اسی لئے کہ وہ قوم

جاہل تھی۔ اس کی رائے جاہلانہ رائے تھی۔ آج کل علماء پر یہی الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے قوم میں پھوٹ ڈال دی۔ یہ اتفاق نہیں ہونے دیتے۔ (فضائل العلم والخشیہ ص ۳۰)

ج نمبر ۲:۔ (غزوہ احد میں) ان پچاس آدمیوں میں (جو پہاڑ کی گھاٹی پر متعین کردیئے گئے تھے) اختلاف ہوا۔ بعض نے کہا کہ ہمارے بھائیوں کو فتح حاصل ہوگئی ہے اب ہم کو گھاٹی پر رہنے کی ضرورت نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس غرض کے لئے ہم کو یہاں متعین کیا تھا، وہ غرض حاصل ہوچکی اس لئے حکم قرار بھی ختم ہوگیا۔ اب یہاں سے ہٹنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصود کی مخالفت نہ ہوگی اور ہم نے اب تک جنگ میں کچھ حصہ نہیں لیا تو کچھ ہم کو بھی کرنا چاہئے۔ ہمارے بھائی کفار کا تعاقب کر رہے ہیں ہم کو مال غنیمت جمع کرلینا چاہئے بعض نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرمادیا تھا کہ بدوں میری اجازت کے یہاں سے نہ ہٹنا۔ اس لئے ہم کو بدوں آپ کی اجازت کے ہرگز نہ ہٹنا چاہئے مگر پہلی رائے والوں نے نہ مانا اور چالیس آدمی گھاٹی سے ہٹ کر مال غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہوگئے یہ ان سے اجتہادی غلطی ہوئی اور گھاٹی پر صرف دس آدمی اور ایک افسران کے رہ گئے (اس واقعہ میں کثرت رائے غلطی پر تھی اور قلت رائے صواب پر تھی۔ جو لوگ کثرت رائے کو علامت حق سمجھتے ہیں وہ اس سے سبق حاصل کریں۔ (ذم النسیان ص ۱۲)

ج نمبر ۳:۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد کچھ قبائل مرتد ہوگئے تھے جن میں بعض تو مسیلمہ کذاب وغیرہ مدعیان نبوت کے ساتھ ہوگئے تھے اور بعض لوگ کسی کے ساتھ تو نہیں ہوئے بلکہ ظاہر میں اپنے کو مسلمان کہتے رہے توحید و رسالت کے مقر رہے۔ کعبہ کو قبلہ مانتے رہے نماز کی فرضیت کے قائل رہے مگر زکوۃ کی فرضیت سے منکر ہوگئے اور یہ کہا کہ فرضیت زکوۃ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے مخصوص تھی اب فرض نہیں۔ اور علت یہ بتلائی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسلمانوں پر فقر زیادہ تھا۔ اس لئے اس وقت زکوۃ کی ضرورت تھی اب وہ حالت نہیں رہی اس لئے فرضیت بھی باقی نہیں رہی جیسے آج کل بھی بہت سے لوگ اس قسم کی تاویلیں کیا کرتے ہیں۔

پہلی جماعت کے بارہ میں سب صحابہ کی بالاتفاق یہ رائے تھی کہ ان کے ساتھ جہاد کرلیا جاوے۔ مگر دوسری جماعت کے حق میں سب کی رائے نرم تھی۔ حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بھی یہ رائے تھی کہ ان کے ساتھ نرمی کی جائے اور جو کھلے کافر ہیں صرف ان سے لڑائی کی جاوے۔ ان لوگوں پر جہاد نہ کیا جاوے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے اس دوسری جماعت کے متعلق بھی وہی تھی جو اور مرتدین کے متعلق تھی وہ ان لوگوں کو بھی کافر کہتے تھے کہ جو شخص نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا میں اس کے ساتھ قتال کروں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے تھے کہ یہ لوگ تو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتے ہیں ہمارے قبلہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں ان پر کیونکر جہاد ہوسکتا ہے۔ اور ان کو کفار کی طرح کیسے قتل کیا جاسکتا ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ یہ سب کچھ سہی۔ مگر یہ لوگ نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرتے ہیں کہ نماز کو تو فرض مانتے ہیں اور زکوٰۃ کو فرض نہیں مانتے حالانکہ شریعت نے دونوں کو فرض کیا ہے تو یہ لوگ فرض قطعی کے منکر ہیں اور ان لوگوں نے دین کو بدل دیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے **من بدل دینہ فاقتلوہ** اس لئے میں ان کے ساتھ قتال کروں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پھر کہا کہ آپ کلمہ گو آدمیوں سے کیسے قتال کریں گے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

"اجبار فی الجاهلیه خوار فی الاسلام واللہ لو منعونی وفی روایه عناقاً کانوا یؤدونه الی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم لا قتلنهم علیه"

ترجمہ:۔ اے عمر! یہ کیا کہ تم جاہلیت میں تو زبردست تھے اور اسلام میں اتنے بودے ہوگئے۔ بخدا اگر یہ لوگ ایک رسی کو یا بکری کے بچہ کو بھی روکیں گے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے۔ تو میں اس پر بھی ان سے قتال کروں گا۔

اور یہ بھی فرمایا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی **ان اللہ معنا** تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس وقت میں بھی تھا تو خدا تعالیٰ میرے ساتھ بھی ہیں۔ اگر میں تنہا بھی جہاد کو نکل کھڑا ہوں گا تو خدا میرے ساتھ ہے۔ انشاء اللہ میں تمام دنیا پر غالب آؤں گا.......... کیا انتہا ہے اس قوت قلب کی۔ چنانچہ پھر سب صحابہ رضی اللہ عنہم حضرت صدیق اکبر رضی اللہ

تعالیٰ عنہ کی رائے پر متفق ہو گئے (اس واقعہ سے بھی ان لوگوں کو سبق حاصل کرنا چاہئے جو کثرت رائے کو علامت حق سمجھے ہوئے ہیں)۔ (ذم النسیان ص ۳۰)

حامداً و مصلیاً: اس وقت عام طور سے علماء حق پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ سیاسیات حاضرہ میں مسلمانوں کی قیادت کیوں نہیں کرتے اور اس کی بنا پر ایک غلط مقدمہ ہے وہ یہ کہ سیاسیات ایک حصہ ہے شریعت کا تو علماء شرائع کو ماہر سیاسیات ہونا ضروری ہے۔ سو اس مقدمہ میں معترضین کو ایک خلط ہو گیا ہے وہ یہ کہ سیاست کے دو حصے ہیں ایک سیاست کے احکام شرعیہ۔ یہ بے شک شریعت کا جزو ہے اور کوئی عالم اس سے ناواقف نہیں۔ چنانچہ ابواب فقہیہ میں سے کتاب السیر ایک مستقل اور مبسوط جزو ہے جس کی درس و تدریس پر دوام والتزام ہے اور دوسرا حصہ سیاست کا اس کی تدابیر تجربیہ ہیں جو ہر زمانہ میں حالات و واقعات اور آلات وغیرہ کے تغیر و تبدل سے بدلتی رہتی ہیں اور یہ حصہ شریعت کا جزو نہیں اور علماء کا اس میں ماہر ہونا ضروری نہیں۔ اگر اس میں کوئی عالم ماہر ہو اس کی مہارت کے دوسرے ذرائع ہیں۔ جن کا حاصل تجربہ و مناسبت خاصہ ہے۔

لیکن اوپر جو عرض کیا گیا کہ سیاست کا یہ حصہ یعنی تدبیر تجربیہ شریعت کا جزو نہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ حصہ شریعت سے مستغنی ہے اور اس کے استعمال کرنے والوں کو علمائے شریعت کی طرف رجوع کرنے کی حاجت نہیں، اگر کسی کا ایسا خیال ہے محض غلط ہے۔ کوئی واقعہ اور کوئی عمل اور کوئی تجویز اور کوئی رائے دنیا میں ایسی نہیں جس کے جواز و عدم جواز میں شریعت سے تحقیق کرنے کی ضرورت نہ ہو گو وہ شریعت کا جزو نہ ہو تو جزو نہ ہونے سے تابع نہ ہونا لازم نہیں آتا۔ اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے فن طب میں سیاست بدنیہ یعنی اصلاح احوال بدن کی تدابیر مدون کی گئی ہیں اور مطب میں ان ہی تدابیر کی مشق کرائی جاتی ہے مگر علمائے شرائع کے لئے ان تدابیر میں ماہر ہونا کسی کے نزدیک بھی لازم نہیں اور نہ یہ عدم مہارت ان کے حق میں نقص ہے۔ البتہ ان تدابیر کے جواز و عدم جواز شرعی کی تحقیق ان کا فرض منصبی سمجھا جاتا ہے۔ بس جو معاملہ سیاست بدنیہ بالباء یعنی طب کے ساتھ بلا نکیر کیا جاتا ہے کہ حاملان تدابیر طبیہ کی جدا جماعت سمجھی جاتی ہے۔ اور حاملان احکام شرعیہ یعنی ان

تدابیر کے جواز وعدم جواز کی تحقیق کی جدا جماعت سمجھی جاتی ہے۔ دوسری جماعت کو پہلی کے فرائض پر مجبور نہیں کیا جاتا اور نہ ان فرائض سے بے خبری کو ان کے حق میں نقص سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح سیاست مدنیہ بالمیم یعنی نظام ملکی کے ساتھ معاملہ کرنا لازم ہے کہ تدابیر نظام کی جدا جماعت سمجھی جاوے۔ ان تدابیر کے شرعی احکام کی جدا جماعت سمجھی جاوے اور دوسری جماعت کو پہلی جماعت کے فرائض پر مجبور نہ کیا جاوے اور نہ ان فرائض کے علم وعمل کے فقدان کو ان کے حق میں نقص سمجھا جاوے۔ طریق عمل میں دونوں جماعتوں کے فرائض کو اس طرح جمع کیا جاوے کہ پہلی جماعت سے تدابیر کی تحقیق کریں اور دوسری جماعت سے احکام شرعیہ کی، اسی طرح جہاں نظام مذکور فرض ہو جاوے خود دوسری جماعت بھی پہلی سے تدابیر دریافت کریں، اور بشرط جواز شرعی ان پر عمل کریں اور پہلی جماعت دوسری جماعت سے جواز وعدم جواز کی تحقیق کریں...... اور بعد ثبوت جواز ان پر عمل کریں۔

کما سیاتی فی الاستدلال الاتی من استر شاد الملوک من الانبیاء علیھم السلام طاعتھم لھم وارشادھم للملوک وموافقتھم لھم فی النظام

ترجمہ:۔ ”(جیسا کہ آئندہ آنے والے استدلال میں عنقریب آتا ہے کہ شاہان وقت حضرات انبیاء علیہم السلام سے رہنمائی طلب کرتے تھے اور (یہ بادشاہ) ان انبیاء علیہم السلام کی اطاعت کرتے تھے اور ان کی رہنمائی کے مطابق نظام (سلطنت) چلاتے تھے)“

یہ معنی ہیں دونوں جماعت سے کام لینے کے اور دونوں جماعت کے بالاتفاق کام کرنے کے۔ البتہ اگر کسی وقت کوئی جماعت اہل سیاست کی ایسی نہ ہو کہ علماء سے احکام پوچھ کر عمل کیا کریں۔ جیسا اس وقت غالب ہے تو اس وقت علماء ایسی جماعت کے پیدا ہونے کے منتظر نہ رہیں ورنہ محبان دنیا دینی مقاصد کو تباہ کر دیں گے بلکہ وہ خود اپنے میں سے ایسی جماعت بنا دیں جو علماً وعملاً سیاست وشریعت کے جامع ہوں۔ مگر یہ حکم کچھ سیاست مدنیہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ سیاست بدنیہ یعنی طب بلکہ اسباب معاش میں سے جتنے فرض کفایہ ہیں مثل تجارت وزراعت سب کا یہی حکم ہوگا البتہ جس چیز کا ضرر دین میں قریب ہو اس میں دخل اصلاحی کا وجوب ایسی چیز میں دخل اصلاحی کے وجوب سے اقویٰ واکد ہوگا

جس کا ضرر دین میں قریب نہ ہو اور ان مقاصد کی اصلاح کے لئے خصوص حفاظت دین کے لئے جماعت کا انتظام کرنا ہر حال میں مشروط ہوگا استطاعت کے ساتھ یہ تو ایک تحقیق کلی ہے اس سے آگے کچھ جزئیات ہیں جن میں کلام کچھ متفق علیہ کچھ مختلف فیہ اپنے محل میں مبسوط و مضبوط ہے ان میں ایک مسئلہ استطاعت کا بھی ہے اور یہ مسئلہ یعنی عدم لزوم علم بالنظام العلم الاحکام ہر چند کہ بدیہی جلی ہے اور اگر خفی بھی ہوتا تب بھی طبی مثال سے تنبیہ کے بعد جلی ہوگیا اور اس بداہت کے سبب محتاج اثبات بالدلیل نہیں مگر میں تبرعاً بعض آیات سے اس کو زیادہ منور کئے دیتا ہوں وہ آیات سورۂ بقرہ کی ہیں۔

الم ترالی الملاء من بنی اسرائیل من بعد موسیٰ الیٰ قولہ فلما فصل طالوت بالجنود قال ان اللہ مبتلیکم بنھر الخ

جس کے ترجمہ کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے (بہت) بعد (**لما نقلہ اھل السیر**) قوم جالوت کے ظالمانہ تسلط سے تنگ آ کر بنی اسرائیل کے ممتاز لوگوں نے اپنے ایک نبی سے (جن کا نام شمویل ہے) عرض کیا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے ہم اس کے ساتھ (مل کر قوم جالوت سے) جہاد کریں۔ انہوں نے (کچھ گفتگو کے بعد جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا (اخیر قصہ میں یہ ہے کہ) طالوت لشکر کو لے کر چلے اور فرمایا، اللہ تعالیٰ تمہارا ایک نہر سے امتحان کرنے والے ہیں (پھر جالوت کے قتل پر اور حضرت داؤد علیہ السلام کو نبوت و سلطنت عطا ہونے پر قصہ ختم ہوگیا) ان آیتوں سے اثبات مدعا کی تقریر یہ ہے کہ قرآن مجید میں نص ہے کہ بنی اسرائیل نے باوجود ان میں ایک نبی موجود ہونے کے (خواہ ان کا نام یوشع علیہ السلام ہو **کما قالہ قتادہ یاشمعون ہو کما قالہ السدی یاشمویل ہو کما علیہ الاکثر** بہر حال **اذ قالو النبی للھم** میں ان کا نبی ہونا مصرح ہے) ان نبی سے یہ نہیں کہا کہ آپ ہمارے قائد بنئے بلکہ اس مقصود کے لئے ایک مستقل بادشاہ مقرر کرنے کی درخواست کی سو اگر نبی کافی سمجھے جاتے تو ایسی درخواست کیونکر کی جاتی اور اگر شبہ ہو کہ یہ بنی اسرائیل کی غلطی تھی تو اس غلطی پر ان نبی نے متنبہ کیوں نہیں فرمایا کہ میں کافی ہوں بلکہ بادشاہ مقرر کرنے کا

انتظام شروع فرما دیا۔ اور اگر کوئی جسارت کر کے یہ کہنے لگے کہ ان نبی سے بھی لغزش ہوگئی تو پھر اللہ تعالیٰ نے اس غلطی پر تنبیہ کیوں نہیں فرمائی بلکہ اس درخواست کو قبول فرمالیا۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ خود ہر نبی کے لئے بھی سیاسیات میں تجربہ ومناسبت لوازم میں سے نہیں تابہ دیگراں از علماء ومشائخ چہ رسد۔ پس مدعا بحمد اللہ باصراح واوضح وجوہ ثابت ہو گیا بلکہ مفسرین کی نقل سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے لئے سنۃ اللہ زیادہ یہی رہی کہ

کان اقوام امرھم بالملوک وھم کانو یطیعون الانبیاء کذافی التفسیر المظھری تحت قوله تعالیٰ ابعث لنا ملکاً وکثیر امن التفاسیر وفی المظھری ایضاً قوله اتاه الله الملک جمع الله تعالیٰ له الامرین ولم یجتمعا قبل ذالک بل کان الملک فی سبط والنبوة فی سبط:

ترجمہ:۔ (ان کے سیاسی معاملات بادشاہوں سے متعلق ہوتے تھے اور بادشاہ انبیاء کے حکم اور مشورہ کے مطابق چلتے، چنانچہ تفسیر مظہری نے بھی ''ابعث لنا ملکاً'' کے تحت میں یہی لکھا ہے) اور طالوت کے باب میں جو **بسطه فی العلم والجسم** آیا ہے اس کی تفسیر میں **معرفة الامور السیاسیه وجسامه البدن** منقول ہے کذافی روح المعانی لیکن اس سنت کی اگر کثرت بھی نہ ہوا ایک نبی کے تجربہ ومناسبت فی السیاست کی نفی بھی اثبات مدعا کے لئے کافی ہے کیونکہ کسی نبی میں کسی نقص کا ہونا جائز نہیں۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ ایسے تجربہ ومناسبت کا نہ ہونا نقص نہیں۔

وہوالمطلوب اگر شبہ کیا جاوے کہ بعض اقوال پر طالوت بھی نبی تھے

کما فی التفسیر المظھری تحت قوله تعالیٰ بسطه فی العلم قیل اتاه الوحی حین اوتی الملک وفیه ایضا تحت قوله تعالیٰ قال ان الله مبتلیکم امایوحی الله تعالیٰ ان کان نبیا وامابارشاد نبیھم

تو نبی کے ہوتے ہوئے ان سے یہ کام نہ لینا۔ اثبات مدعا کے لئے کہ کمال نبوت کے لئے کمال سیاسی لازم نہیں کافی ہے۔ اب ایک ضعیف سا استبعاد رہ گیا۔ جس کا درجہ محض ایک وحشت عنوانیہ سے زیادہ نہیں جس کا منشاء ذہن میں عرف عامیانہ کا استیلا ہے حقیقت حکیمانہ پر

وہ یہ کہ امور سیاسیہ کا علم بوجہ اپنے آثار نافعہ کے کمال ہے۔ تو اس کا فقدان نقص ہوگا۔ پھر حضرات انبیاء ورثۃ الانبیاء کے لئے کیسے جائز ہوسکتا ہے۔ جواب ظاہر کہ اگر یہ نقص ہوتا تو انبیاء کے لئے کیسے تجویز کیا جاتا۔ اور لم اس کی یہ ہے کہ کمال اور نقص متناقض نہیں کہ کمال کا رفع نقص کے وضع کو مستلزم ہو بلکہ متضاد ہیں دونوں کا رفع اور درمیان میں واسطہ کا ہونا جائز ہے۔

چنانچہ بعثت عامہ کمال ہے مگر اس کا عدم بھی نقص نہیں ورنہ بجز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے جمیع انبیاء کا نقص لازم آئے گا۔ نعوذ باللہ منہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو باوجود کمال جامعیت اور سیاست میں بھی ماہریت کے غزوہ احزاب میں حفر خندق کی تدبیر حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حاصل ہوئی۔

کما فی کتب الحدیث والسیر فی حاشیہ الکشمھینی علی البخاری باب التحریض علی القتال علی قولہ خرج الی الخندق برمزہ ولم یکن اتخاذ الخندق من شان العرب ولکنہ من مکائد الفرس اشار بذالک سلمان الفارسی قال یا رسول اللہ کنا بفارس اذا خوصرنا خندقنا علینا فامر بحفرہ و عمل بنفسہ ترغیباً للمسلمین.

قصہ تابیر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد **انتم اعلم بامور دنیاکم** ایسے ہی تجارت پر محمول ہے اور راز اس کا یہ ہے کہ ایسے تجارب وتدابیر اپنی ذات میں دنیوی امور ہیں گو مباح ہوں۔ عارض سے دین ہوجاتے ہیں اس لئے ان کا نہ جاننا کسی درجہ میں کمال مقصود میں قادح نہیں۔

(ولنختتم المقالہ علی دعاء الوقایہ عن الضلالہ فی کل حالہ)

غیر اسلامی حکومت کے شرعی احکام

ازافادات حکیم الامت مجدد ملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ

دارالحرب دارالاسلام کی تحقیق ہندوستان دارالحرب ہے یا نہیں

کسی نے دریافت کیا کہ ہندوستان دارالحرب ہے یا نہیں؟

فرمایا عموماً دارالحرب کے معنی غلطی سے یہ سمجھے جاتے ہیں کہ جہاں حرب (لڑائی) واجب ہو سو اس معنی کو لو تو ہندوستان دارالحرب نہیں کیونکہ یہاں (آپسی) معاہدہ کی وجہ سے حرب (لڑائی) درست نہیں۔

مگر شرعی اصطلاح میں دارالحرب کی تعریف یہ ہے کہ ''جہاں پورا تسلط غیر مسلم کا ہو'' تعریف تو یہی ہے آگے جو کچھ فقہاء نے لکھا ہے وہ امارات (علامات) ہیں، اور ہندوستان میں غیر مسلم کا تسلط (غلبہ) ہونا ظاہر ہے۔ مگر چونکہ دارالحرب کے نام سے پہلے غلط معنی کا شبہ ہوتا ہے اس لئے ''غیر دارالاسلام'' کہنا اچھا ہے۔

پھر اس کی دو قسمیں ہیں ایک دارالامن، دوسرے دارالخوف۔

''دارالخوف'' وہ ہے جہاں مسلمان خائف ہوں، اور ''دارالامن'' وہ ہے جہاں مسلمان خائف نہ ہوں۔ سو ہندوستان دارالامن ہے، کیونکہ باوجود غیر مسلم کے پورے تسلط کے مسلمان خوفناک نہیں۔ اور حرب (لڑائی) بھی درست نہیں۔ کیونکہ باہم معاہدہ ہے۔ (حسن العزیز ص ۱۲۷ ج ۳)

فرمایا دارالحرب کے معنی ''دارالکفر'' کے ہیں، پھر اس دارالحرب کی دو قسمیں ہیں۔ ایک دارالامن، ایک دارالخوف۔

درالامن میں بہت سے احکام دارالاسلام کی طرح ہوتے ہیں۔ سو ہندوستان دارالحرب ہے لیکن ہے دارالامن۔ اس لئے زیادہ تر معاملات میں یہاں دارالاسلام ہی کے احکام پر عمل درآمد ہوگا۔ (الافاضات الیومیہ ص ۱۸۱ ج ۸)

ہندوستانی غیر مسلم ذمی ہیں یا حربی

سوال:۔ ہمارے ہندوستان میں جو کفار لوگ ہیں ذمی ہیں یا حربی، مسلمان لوگوں کو امور دینیہ میں ان کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہئے؟

الجواب:۔ لاذمی لعدم دخولھم تحت حمایته وال مسلم ولا حربی محارب بل حربی مسالم ومستامن واکثر احکامھم کالذمیین.

ترجمہ:۔ (ہندوستانی کفار) نہ تو ذمی ہیں کیونکہ کسی مسلمان والی کی ماتحتی میں نہیں، اور نہ ہی حربی ہیں (جیسا کہ ظاہر ہے) بلکہ ایسے حربی ہیں جن سے مصالحت ہے اور امن وامان سے رہنا چاہتے ہیں۔ اوران کے اکثر احکام ذمیوں کی طرح ہیں)

مسئلہ:۔ اہل حرب (یعنی لڑنے مرنے والے حربی غیر مسلم) کے اموال کا احراق یا فساد وقطع اشجار وغیرہ (یعنی ان کے جان و مال کو تباہ و برباد کرنا جلانا کاٹنا) جب اس میں مصلحت ہو جائز ہے کذافی الہدایہ والروح وغیرہما

جان ومال کی حفاظت کرنے والی حکومت شکر کی مستحق ہے اس کے خلاف شورش نہیں کرنا چاہئے

جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے طائف تشریف لے گئے کہ شاید وہاں کے باشندے مسلمان ہو جائیں اور وہاں تکلیف سے نجات ملے وہاں کے لوگوں نے آپ کے ساتھ نہایت گستاخانہ سلوک کیا تو آپ بددل ہو کر پھر مکہ معظمہ واپس تشریف لائے اور مطعم بن عدی کو اطلاع فرمائی کہ اگر مکہ والے مجھے امن دیں تو میں شہر میں رہوں ورنہ کسی دوسری جگہ چلا جاؤں۔ اس وقت مطعم بن عدی نے مکہ والوں سے کہا کہ میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ دی۔ خبر دار کوئی ان کو ہاتھ نہ لگائے۔ چنانچہ اس وقت ہجرت مدینہ تک حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مطعم بن عدی کی پناہ کی وجہ سے مکہ میں تشریف فرما رہے۔

ان کی اس ہمدردی کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ شکر یہ ظاہر فرماتے تھے۔ اسی کے صلہ میں اس وقت جب کہ غزوہ بدر میں مسلمانوں کو غلبہ ہوا اور بہت سے کفار مارے گئے اور

بہت سے قید ہو کر آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتے اور ان کفار کے متعلق گفتگو کرتے تو میں ان کی خاطر چھوڑ دیتا بعض روایتوں میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی شکر گزاری کے لئے ایسا فرماتے تھے۔

اس وقت بعینہ یہی حالت ہے ان احکام کے ساتھ کو جس طرح مطعم بن عدی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کی تھی اور آپ ان کے ممنون اور شکر گزار تھے اسی طرح حکام وقت ہمارے محافظ ہیں اور ہمارے امن کے ذمہ دار ہیں ہم کو بھی ان کا شکر گزار رہنا چاہئے جس کا ادنیٰ اثر یہ ہونا چاہئے کہ کوئی ایسی شورش نہ کریں جس سے حکام تشویش میں پڑ جائیں۔

عملی معاہدہ

فرمایا مدت سے میرا خیال ہے کہ کفار سے جیسے با قاعدہ زبانی یا تحریری معاہدہ ہو جاتا ہے تو اس کی پابندی مسلمانوں پر لازم ہو جاتی ہے اسی طرح بعض اوقات عملی عہد ہو جاتا ہے کہ باہمی طرز معاشرت تعامل سے فریقین ایک دوسرے سے مامون و بے خطر ہوں، باہمی معاملات اور لین دین وغیرہ جاری ہوں، یہ بھی ایک قسم کا عملی عہد ہے اس کی بھی رعایت کرنا ضروری ہے۔

اگر کسی وقت ایسے لوگوں پر حملہ کرنا ہے تو پہلے ان کو نبذ عہد کے طور پر متنبہ کر دیا جائے کہ اب ہم سے مامون نہ رہیں پھر فریقین کو اپنے اپنے فعل کا اختیار ہے اور اس نبذ عہد (یعنی متنبہ کئے بغیر) ایک قسم کا غدر (دھوکہ) ہے جو شریعت اسلامیہ میں کسی حال میں کسی کافر سے جائز نہیں۔

قبطی کا واقعہ سورۃ قصص کی آیت میں مذکور ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے قبطی کے قتل ہو جانے کا ذکر ہے...... یہ واقعہ بھی اسی قبیل سے تھا کیونکہ موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھ آپ کے متعلقین اور قبطی کفار دونوں فرعونی سلطنت کے باشندے تھے اور آپس میں ایک دوسرے سے مون (اور مطمئن) تھے۔ اسی حالت میں قبطی کا اچانک قتل ہو جانا عہد عملی کے خلاف تھا۔ اس لئے اس پر عتاب ہوا اور استغفار و مغفرت کی نوبت آئی...... رہا یہ سوال کہ جب یہ قتل معصیت تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیسے صادر ہوا؟ اس کا جواب ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے قصداً قتل نہیں کیا معمولی ضرب اس کو ہٹانے

کے لئے لگادی تھی۔ اتفاق سے مر گیا۔ اس لئے معصیت کا صدور ان سے نہیں ہوا۔ تاہم صورت معصیت کی تھی۔ اس لئے پیغمبر خدا نے اس کو معصیت ہی کے برابر سمجھ کر استغفار کیا۔

پھر فرمایا۔ یہ میرا خیال ہے اگر اس کا ثبوت کتاب وسنت یا علماء اہل حق کے کلام میں مل جائے تو اس کے حوالے سے لکھا جائے۔

حضرت مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ میں نے اسی روز تحقیق کی، تو بحمداللہ صحیح بخاری کی ایک حدیث بروایت مغیرہ بن شعبہ میں اس کا ثبوت اور قسطلانی شرح بخاری میں اس کی تصریح نکل آئی۔

شرعی دلیل

وفی المقام تفریقان یتعلقان بقصته موسیٰ علیه السلام مبنیان علی کون ماقص الله ورسول علینا من غیر نکیر حجه لنا ...... والثانی کون المعاهدة التی تحرم دم الحربی عاماً للقالی والحالی فان موسیٰ علیه السلام لم یعاهدهم قالا فلو لاینعقد العهد بالحائل کان دم القبطی مباحاً فلا معنی لتسمیه قتله عمل الشیطان والا استغفاره منه هذا.

خلاصہ ترجمہ:۔ دوسرا مسئلہ:۔ جو اس اصل پر مبنی ہے کہ جس قصہ کو اللہ اور رسول نے بغیر تکبر کے بیان فرمایا ہو وہ ہمارے لئے حجت ہے۔ وہ معاہدہ جس سے حربی کا دم حرام ہوتا ہے۔ یعنی اس کا قتل ناجائز ہوتا ہے۔ وہ عام ہے، قالی وحالی کو کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے ان سے قولاً معاہدہ نہیں کیا تھا۔ پس اگر حال کے ذریعہ معاہدہ نہ ہوتا، تو قبطی مباح الدم ہوتا پھر اس قتل کو شیطان کا عمل کہنے اور اس سے استغفار کے کوئی معنی نہیں۔

کافر حکومت میں رہتے ہوئے معاہدہ کی خلاف ورزی کرنا درست نہیں

اگر کافر حاکم سے معاہدہ ہو جائے تو اس معاہدہ کا پورا کرنا واجب ہے بقولہ تعالیٰ واوفوا بالعهد. (اور وعدوں کو پورا کرو) البتہ اگر شرعی ضرورت اس عہد کے توڑنے کی

ہے تو پہلے اس معاہدہ کے ختم کرنے کی اطلاع کردے لقوله تعالیٰ الیهم علی سواء ورنہ غدر (دھوکہ) کا سخت گناہ ہے لقوله تعالیٰ ان الله لا یحب الخائنین.

عہدو پیمان کے خلاف کوئی کام کرنا جائز نہیں

جب مسلمان رعایا بن کر ہندوستان میں رہے اور حکام سے (اس بات کا) عہدو پیمان کر چکے کہ کسی حاکم یا رعایا کے جان و مال میں دست اندازی نہ کریں گے اور کوئی امر خلاف اطاعت نہ کریں گے تو مسلمانوں کو عہدو پیمان کے خلاف کرنا یا حکام کی کسی قسم کی مخالفت یا خیانت کرنا ہرگز درست نہیں اور نہ ہی رعایا کے ساتھ عہد کے خلاف اور خیانت کرنا (یعنی ہندو وغیرہ کے ساتھ) درست ہے۔

عہد کے پورا کرنے کی مسلمانوں کے مذہب میں اس قدر تاکید ہے کہ شاید کسی دوسرے مذہب میں نہ ہو۔ قال الله تعالیٰ وافوا بالعهد ان العهد کان مسئولا.

ترجمہ:۔ ''عہد کو پورا کرو کیونکہ عہد کے بارے میں قیامت کے روز باز پرس ہوگی۔''

عہد شکنی کی سخت ممانعت ہے اور کسی سے عہد کر کے اس کے خلاف کرنے پر بہت دھمکی دی گئی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

الا من ظلم معاهدا او نتقصه او کلفه فوق طاقته او اخذمنه شیئا بغیر طیب نفس فانا حجیجهٔ یوم القیامه

ترجمہ:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تمام امت کو فرماتے ہیں کہ جو کسی غیر مذہب سے عہد کر کے اس پر ظلم کرے یا ان کو کوئی عیب لگادے اور اس کی بلاوجہ توہین کرے، یا اس پر زائد مشقت ڈالے، یا اس کے مال میں سے کوئی چیز بغیر اس کی رضامندی کے لے لے تو قیامت کے دن اللہ کے روبرو میں اس سے جھگڑا کروں گا (یعنی اس کے مقابلہ میں حجت کروں گا)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے نائبوں کو عام تعلیم یہ ہوتی تھی کہ لا تغدروا یعنی عہد کے خلاف نہ کرو۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ:

ذمة المسلمین واحدة لیسعی بها ادناهم فمن اخفر مسلما فی ذمه فعلیه

لعنة والملائكة والناس اجمعين لايقبل الله يوم القيامة صرفا ولا عدلا.

ترجمہ:۔ یعنی مسلمانوں کا ذمہ اور عہد ایک ہے اگر ایک مسلمان کسی غیر مذہب والے سے معاہدہ کرے گا تو سب مسلمانوں پر اس کا پورا کرنا لازم ہے اگر کسی مسلمان کے عہد کو جو اس نے کسی کے ساتھ کیا تھا کوئی دوسرا مسلمان توڑنا چاہے تو اس پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور آدمیوں کی لعنت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس عہد شکن کی کوئی عبادت فرض یا نفل ہرگز قبول نہ کرے گا۔

ناحق کسی غیر مسلم کو قتل کرنا حرام اور گناہ کبیرہ ہے

اسی طرح کسی کو بے گناہ اور بلاوجہ قتل کر دینا خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلمان حرام اور گناہ کبیرہ ہے **قال الله تعالىٰ ولا تقتلوا النفس التى حرم الله الا بالحق:**

یعنی جس جان کے قتل کو خدا تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے اس کو ناحق نہ مار ڈالو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے **من قتل معاهدا بغير حق لم يرح رائحه الجنه** یعنی جس نے کسی کے ساتھ عہد کر کے اس کو قتل کیا وہ جنت کی بو بھی نہ سونگھے گا علی ہذا فقہ کی تمام کتابیں ان مسئلوں اور روایات سے بھری ہوئی ہیں۔

پس مسلمانوں کو اپنے عہد کے موافق حکام کی تابعداری جس میں کچھ معصیت نہ ہو ضروری ہے اور کسی قسم کی بغاوت اور مخالفت اور مقابلہ اور خیانت جائز نہیں۔

غیر ملکی قوموں کی مدد کرنا جائز نہیں جب کہ وہ ہمارے ملک پر حملہ آور ہوں

اگر کوئی مسلمان یا غیر مسلمان ہمارے حکام کے مقبوضہ ممالک سے خارج ہیں (یعنی غیر ملکی) ان ہمارے حکام کے ساتھ مقابلہ اور لڑائی کرنے اور ان پر حملہ کر کے آئیں تو ہم کو اس قوم کے ساتھ ہونا اور ان کو مدد دینا بھی ہرگز درست نہیں۔ کیونکہ یہ بھی عہد کے خلاف ہے۔

قال الله تعالىٰ وان استنصروكم فى الدين فعليكم النصر الا على قوم بينكم وبينهم ميثاق

"یعنی اگر اہل اسلام مدد چاہیں تم سے دین کے مقابلہ میں۔ پس تمہارے اوپر مدد کرنا

ضروری ہے مگر اس قوم کے معاملہ میں تمہارے اور ان کے درمیان عہد ہو چکا ہے"

مطلب یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان کا ان لوگوں سے مقابلہ ہو جن سے تم عہد و پیمان کر چکے ہو تو مسلمانوں کا ساتھ مت دو پس مسلمانوں کو ہر حال میں اپنے عہد کی رعایت کرنی چاہئے۔ نہ خود مخالفت کریں نہ کسی مخالف کی اعانت کریں۔ اگر اس کے خلاف کریں گے تو سخت گنہگار اور مستحق عذاب ہوں گے۔ (بیاض اشرفی فصل)

غیر مسلم حکومت میں رعایا بن کر رہنے کا حکم

حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ نے اپنے ایک فتویٰ میں فرمایا ہے جو ذیل میں منقول ہے۔

سوال:۔ یہ ملک ہندوستان جو سو برس سے زائد مسیحی حکام کے مملوکہ و مقبوضہ ہے اور ان کی رعایا میں ہنود وغیرہ مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں اور ہم لوگ مسلمان بھی زیر حکومت آباد ہیں۔ تو مسلمانوں کو اس ملک میں حکام کی رعایا بن کر رہنا چاہئے یا نہیں۔ اور ہم مسلمانوں کو اپنے ان حکام کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہئے۔ اور نیز ہندوؤں وغیرہ رعایا کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہئے۔

الجواب:۔ چونکہ قدیم سے مذہب، اور جملہ مسیحی لوگوں کا قانون یہ ہے کہ کسی کی ملت اور مذہب سے پرخاش اور مخالفت نہیں کرتے اور نہ کسی مذہبی آزادی میں دست اندازی کرتے ہیں۔ اور اپنی رعایا کو ہر طرح سے امن و حفاظت میں رکھتے ہیں۔

لہٰذا مسلمانوں کو یہاں ہندوستان میں جو کہ اہل مسیحی کا مملوکہ و مقبوضہ ہے رہنا اور ان کی رعیت بننا درست ہے۔ چنانچہ جب مشرکین مکہ نے مسلمانوں کو تکلیفیں اور اذیتیں پہنچائیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ملک حبشہ میں جو نصاریٰ کا مقبوضہ تھا بھیج دیا۔ اور یہ صرف اس وجہ سے ہوا کہ وہ کسی کے مذہب میں دست اندازی نہیں کرتے تھے۔

غیر مسلم حکومت میں رہنے اور ہجرت کرنے کا شرعی حکم

سوال:۔ زید کہتا ہے کہ کسی مسلمان کا کفار کی حکومت میں رہنا جائز نہیں۔ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ کسی مسلمان قوم کا کسی کافر کے تحت میں رہ کر زندگی بسر کرنا دو حال سے خالی نہیں۔

اول یہ کہ وہ ان کے سیاسی وسرکاری محکموں میں عہدے قبول کریں گے یا نہیں دوسری شکل میں ان کی سیاسی طاقت رفتہ رفتہ بالکل ختم ہو جائے گی۔ اور وہ دنیا کے واسطے عضو معطل سے زیادہ بےکار ثابت ہوں گے۔

اور اگر پہلی صورت ہے یعنی سرکاری عہدے قبول کریں تو ومن لم یحکم بما انزل اللہ فالئک ھم الکافرون کے مصداق ہوں گے۔ کیا زید کا یہ خیال صحیح ہے۔ اگر صحیح ہے تو اس کی رو سے مسلمانان ہند پر ہجرت واجب ہے یا نہیں۔

الجواب:۔ زید کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ جو اہل اسلام کفار کی حکومت میں رہتے ہیں وہ دو مصیبتوں میں سے ایک مصیبت میں مبتلا ہیں۔ اگر سیاسی محکموں میں مراتب حاصل کریں (اور عہدے قبول کریں) تو من لم یحکم کی وعید میں داخل ہوں گے ورنہ دنیا کے واسطے عضو معطل سے بڑھ کر بےکار ثابت ہوں گے لہٰذا ان پر ہجرت فرض ہے۔

ہمارے نزدیک زید کا یہ خیال غلط ہے۔ اول شق میں یہ تسلیم نہیں کہ سرکاری تمام ملازمتوں میں حکم خلاف ما انزل اللہ ضروری ہو۔ بلکہ بہت سے ایسے محکمے ہیں کہ جن میں حکم ہی نہیں (یا شریعت کے مطابق اور جائز حکم ہو)۔ نیز دوسری شق بھی غیر مسلم اور غلط خیال ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مراتب (یعنی عہدے) حاصل نہ کرنے کی صورت میں عضو معطل اور بےکار ہونے سے اگر دنیاوی اعتبار سے مراد ہے ظاہر ہے کہ غلط ہے۔ کیونکہ تجارت، زراعت، حرفت اور دنیاوی کاروبار کر سکتے ہیں اور اگر دینی اعتبار سے مراد ہے تو غلط ہونا بہت ہی زیادہ روشن ہے۔ جس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔

اس کے علاوہ ہجرت کر کے جس جگہ جائیں گے وہاں بھی انہیں دونوں مصیبتوں کا سامنا ہوگا کیونکہ اس وقت کوئی سلطنت علی منہاج النبوۃ نہیں۔ تو وہاں سے بھی ہجرت فرض ہوگی۔ تو سوا اس کے دنیا سے ہجرت فرمائیں کوئی چارہ نہ ہوگا خلاصہ یہ کہ زید کا یہ خیال غلط اور بےاصل ہے۔

جب حکومت کی طرف سے شرائع متعلقہ کے (یعنی مذہب پر) ادا کرنے کی اس طرح سے آزادی ہے اور کچھ روک ٹوک نہیں۔ تو ہجرت واجب نہیں۔ خواہ سیاسی محکموں میں جائز عہدہ حاصل کریں یا نہ کریں۔ مسلمانوں کی دینی اور دنیوی عزت سیاسی عہدوں کے اصول کیساتھ وابستہ

نہیں بلکہ ان کی عزت شریعت کی پوری اتباع اور باہمی اتحاد و اتفاق کیساتھ متعلق و مربوط ہے۔

حررہ خلیل احمد عفی عنہ

الجواب صحیح عبدالوحید عفی عنہ

الجواب صحیح محمد یحیٰ عفی عنہ۔ الجواب صحیح عبدالطیف

اللطیف عفی عنہ:۔ (بیاض اشرفی ص ۲۶)

کافر حکومت کی ماتحتی میں رہنے کی ممانعت پر ایک استدلال اور اس کا جواب

ایک صاحب نے اس مضمون کو کہ کافر کی حکومت مسلمانوں پر جائز نہیں آیت و لا تنکحو المشرکین حتیٰ یومنوا سے استنباط کیا ہے کہ جب ایک مسلمان عورت کا کافر کی ماتحتی میں رہنا جائز نہیں تو بہت سے مسلمانوں کا کسی کافر کی ماتحتی میں رہنا کیسے جائز ہوگا۔ لیکن اس مضمون کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ دوسری دلیلوں سے ثابت ہے۔

اور اگر اسی دلالت کی بناء پر یہ کہا جائے کہ دوسری آیت میں ولا تنکحوا المشرکات حتیٰ یومن ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرک عورتوں کا مسلمان کے تحت میں رہنا جائز نہیں۔ تو جب ایک مشرکہ کا مسلمان کے تحت میں رہنا جائز نہیں تو بہت سے مشرکین کا مسلمانوں کی رعایا بن کر رہنا بھی جائز نہ ہوگا تو اس کا کیا جواب دیں گے؟ یہ حال ہے ان استنباطوں کا۔

بعض لوگوں نے قرآن شریف کی آیتوں سے نئی سیاست کو مستنبط کرنا شروع کر دیا ہے یہ ایک قسم کی تحریف ہے۔ (الفصل للوصل ص ۱۸۳ مطبوعہ تھانہ بھون)

دارالکفر سے ہجرت کرنے کا شرعی حکم

سوال:۔ مخدومنا ہندوستان میں انگریزی حکومت کے ماتحت بڑے بڑے اکابر اور بزرگان دین گزرے ہیں اور اب بھی ہیں جو چشمہ فیض اور قابل اقتدار ہیں لیکن ایک طرف شیخ اکبر بھی بڑے بزرگ ہیں جو فتوحات مکیہ ص ۴۶۰ ج ۴ باب الوصایا میں وصیہ فرماتے ہیں کہ۔

وعلیک بالهجرة ولا تقم بین اظهر الکفار فان فی ذالک اهانه دین

الاسلام...... وایاک والدخول تحت ذمه کافرما استطعت واعلم ان المقیم بین اظهر الکفار مع تمکنه من الخروج من بین ظهر انیهم لاحظ له فی الاسلام فان النبی صلی اللہ علیه قد تبرامنه وقال انابری من مسلم یقیم بین اظهر المشرکین فما اعتبرله کلمه الا سلام:

ترجمہ:۔(تم پر ہجرت کر جانا لازم ہے اور کفار کے درمیان نہ رہو کیونکہ اس میں دین اسلام کی اہانت ہے اور کسی کافر کی ماتحتی میں رہنے سے اپنے کو بچاؤ۔اور یقین کرلو کہ کفار کے درمیان رہنے والا شخص جو کہ باوجود یہ کہ ہجرت کرنے پر قادر ہو ایسے شخص کے لئے اسلام میں کوئی حصہ نہیں۔کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے برائت ظاہر فرمائی ہے اور فرمایا آپ نے کہ میں ایسے مسلمان سے بیزار ہوں جو مشرکین کے درمیان رہے۔ایسے شخص کے کلمہ اسلام کا اعتبار نہیں کیا گیا)۔

اس وصیت نامہ میں **لاحظ له فی الاسلام** اور حدیث شریف **انابری من مسلم** اور لفظ **فما اعتبر له کلمته الاسلام** وغیرہ کو دیکھ کر دل میں سخت خلجان ہے براہ مہربانی مطابقت کی تحریر فرما کر مشکور ہوں۔ (البدائع بدیعہ ۷ ص ۱۸)

الجواب:۔کسی غیر مجتہد کا قول دوسرے پر حجت نہیں ہوسکتا اور نصوص اس دعویٰ میں بعض قطعی الثبوت نہیں اور بعض قطعی الدلالہ نہیں اس لئے دوسروں کا (یعنی ہجرت نہ کرنے والے بزرگان دین کا) قول یا فعل، نص کے بھی خلاف نہیں۔

اور اگر اس حکم میں اطلاق ہوتا تو حضرات صحابہ کو حبشہ ہجرت کر جانے کی اجازت نہ دی جاتی جہاں کے حاکم کا مذہب عیسائی تھا۔

دوسرا جواب:۔یہ کہ اس وقت اسلام کے لئے مثل اقرار کے (یعنی کلمہ طیبہ کی طرح اقرار کرنے کی) قدرت وتمکن کی شرط کے ساتھ ہجرت بھی فرض، اور اسلام کی قبولیت اور اسلامی احکام کے جاری ہونے کا مدار تھی جیسا کہ اب یہی حالت اقرار (شہادتیں) کی ہے۔ چنانچہ روح المعانی میں تیسیر سے اس کی فرضیت کی تصریح کی ہے۔پس جو منافقین مدینہ میں رہتے تھے جو کہ دارالاسلام تھا۔وہ ظاہراً اس فرض کے عامل تھے اسی لئے ان سے تعرض نہ

ہوتا تھا۔ بخلاف...... ہجرت نہ کرنے والوں کے کہ ان کا حکم عام کفار کا سا تھا۔

روح المعانی میں ہجرت کی فرضیت کا منسوخ ہونا نقل کیا ہے البتہ مستحب اب بھی ہے۔

(بیان القرآن ص ۱۴۲، نساء ۳ ص ۱۵۰)

ہجرت کرنیکا حکم

ایک جامع مختصر تقریر لکھی جاتی ہے۔ جس کا ماخذ روایات وقواعد اور اقوال علماء واشارات نصوص ہیں ان دلائل کے مجموعہ سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ۔

''ابتدائے اسلام میں ہجرت فرض تھی اور فرضیت کے ساتھ وہ ظاہراً لازمی شعار اور ثبوت اسلام کے لئے موقوف علیہ بھی تھی لیکن حالت عذر میں اس کی فرضیت اور شعاریت ساقط ہو جاتی تھی، جیسا کہ تلفظ بالشہادتین (یعنی کلمہ طیبہ) کی اب بھی یہی شان ہے۔ اور عہد نبوی میں صحابہ کے اقوال سے نماز کی یہی شان معلوم ہوتی ہے اور اس شعار ہونے کی وجہ سے اس سے بلا عذر رجوع کرنا ارتداد کی علامت تھا۔

والمشروعیه انما یکون اذا کان فی الارض محل بها جرا الیه.

(یعنی ہجرت کی مشروعیت اس وقت ہے جب کہ زمین میں ایسی جگہ پائی جاتی ہو کہ جہاں ہجرت کرنا ممکن ہو)''

فائدہ:۔ روح المعانی میں ہجرت کی فرضیت کا منسوخ ہونا نقل کیا ہے البتہ مستحب اب بھی ہے اور مسلم شریف کی حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اعرابی کو جس نے ہجرت کی اجازت چاہی تھی یہ فرمانے سے **ان شان الهجرة لشديد** (کہ بیشک ہجرت کا معاملہ بڑا سخت ہوتا ہے) وطن میں رہنے کے لئے ارشاد فرمانے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کیونکہ اس کے ہجرت کے ارادہ کرنے سے ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دارالاسلام میں نہ تھا۔

(بیان القرآن سورہ نساء آیہ ومن یہاجر فی سبیل اللہ الخ ص ۵۰)

مشروع ہجرت

۱:۔ عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہجرت منہدم کر دیتی ہے (یعنی ختم کر دیتی ہے) ان گناہوں کو جو اس سے پہلے ہو چکے ہوں۔ روایت کیا اس کو مسلم نے۔

۲:۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تھوڑے ہی دنوں میں ایسی حالت ہوگی کہ مسلمانوں کا سب سے بہتر مال بکریاں ہوں گی۔ جن کے پیچھے پیچھے پھرتا پہاڑوں کی چوٹیوں پر، اور بارش کے موقعوں پر اپنے دین کو لئے ہوئے فتنوں سے بھاگا پھرتا ہو۔ روایت کیا اس کو بخاری نے۔

فائدہ:۔ اگر کسی شہر میں یا کسی محلّہ میں یا کسی مجمع میں دین کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو وہاں سے بشرط قدرت علیحدگی واجب ہے۔ البتہ اگر یہ شخص عالم، مقتدا ہے اور لوگوں کو اس سے دینی حاجات واقع ہوتی ہوں تو ان میں رہ کر صبر کرے۔ اور اگر کوئی اس کو پوچھتا ہی نہ ہو، نہ ان کی اصلاح کی امید ہو تو بھی بہتر ہے کہ ان سے علیحدہ ہو جائے۔ (فروع الایمان ۶۴)

مذہبی امور میں حکومت کو دخل دینے کا حق نہیں

فرمایا کہ وقف بھی چونکہ ایک مذہبی رکن ہے اس لئے گورنمنٹ کی مداخلت اس میں جائز نہیں، جیسا کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ میں مداخلت جائز نہیں اسی طرح نکاح وطلاق میں بھی یہی حکم ہے۔

اگر شبہ ہو کہ شوہر تین طلاق دے کر پھر رکھنا چاہتا ہے تو مطلقہ کا استخلاص (یعنی چھٹکارا) کفار کی عدالت سے تو شرعاً جائز ہے (تو یہ مداخلت کیسے گوارا کر لی گئی؟) تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ گورنمنٹ سے طلاق واقع ہونے میں امداد نہیں ملتی بلکہ طلاق کا جو اثر ہوتا ہے اس میں امداد چاہتی ہے۔ یعنی طلاق کے بعد جو اس کو آزادی ہونی چاہئے اس میں امداد چاہتی ہے۔ اور اسی طرح اپنے کو نقصان سے بچانا چاہتی ہے۔

پھر اگر شبہ ہو کہ وقف میں بھی متولی بڑی گڑبڑی کرتے ہیں اور وقف کے مال کو کھا ڈالتے ہیں اور محتاج و مسکین محروم رہ جاتے ہیں اس طرح مساکین کا نقصان ہوتا ہے (تو یہاں وقف کے معاملہ میں نقصان سے بچنے کے لئے حکومت کا دخیل بننا صحیح ہونا چاہئے)

لیکن غور کرنے کی بات ہے کہ یہ صورت عدم النفع (یعنی نفع نہ ہونے) کی نہ ضرر کی۔ اس لئے وقف کو مطلقہ کے خلاصی حاصل کرنے پر قیاس نہیں کر سکتے۔ کیونکہ متولیوں کی گڑبڑی سے مسکینوں کا ضرر نہیں، ہاں عدم النفع ضرور ہے (دونوں میں بڑا فرق ہے)

مثلاً کسی کی جیب سے سو روپیہ کا نوٹ نکال کر لے لے یہ تو اس کا ضرر (نقصان)

ہے۔اور اگر کوئی شخص اس کو سو روپیہ کا نوٹ دینے والا تھا مگر دیا نہیں، یا کسی نے دینے نہیں دیا۔تو یہ جس کو دینے والا تھا اس کا ضرر (نقصان) نہیں ہوا، بلکہ عدم النفع (یعنی نفع نہ ہونے کی) صورت ہوئی۔پس ضرر اور ہے اور عدم النفع اور ہے۔

مذہبی امور میں حکام کا جبراً دست اندازی کرنا اور محکوم مسلمانوں کا اس پر راضی ہو جانا

سوال:۔ گورنمنٹ اپنی مملوکہ اراضی میں رفاہ عام کے لئے ایک شفاخانہ بنانا چاہتی ہے اس اراضی میں بعض منہدم مساجد بھی ہیں۔گورنمنٹ ان کو اپنے خرچ سے بنانے کا وعدہ کرتی ہے۔مگر عام لوگوں کو وہاں اجازت دینا مشکل ہے۔البتہ شفاخانہ کے مریضوں اور ملازموں کو ہر وقت اجازت ہے اور ایک مسجد کو بنانے سے کسی وجہ سے عذر کرتی ہے مگر اس کے تحفظ کے لئے احاطہ اس کا بھی بنا دینے کو کہتی ہے سوال یہ ہے کہ اس صورت کو اگر مسلمان منظور کرلیں تو یہ جائز ہے یا نہیں......؟

الجواب:۔احکام شرعیہ دو قسم کے ہیں۔ایک اصلی، دوسرے عارضی۔یعنی احکام کبھی شئی کی ذات پر نظر کر کے مرتب ہوتے ہیں اور کبھی عوارض پر نظر کر کے۔اور ان دونوں قسم کے احکام باہم مختلف بھی ہو جاتے ہیں۔

صورت مسئلہ میں حکم اصلی یہی تھا کہ مسجد ہر طرح آزاد ہے ان میں کسی وقت کسی کو نہ نماز پڑھنے کی ممانعت کی جائے نہ آنے جانے سے **الا لمصلحه المساجد** اور یہ حکم اس وقت ہے جب مسلمان بغیر کسی شورش (یعنی مسلمانوں کے خطرہ اور ضرر لاحق ہوئے بغیر) اس پر قادر ہوں۔

اور حکم عارضی یہ ہے کہ جس صورت پر صلح کی جاتی ہے اس پر رضامند ہو جائیں اور یہ حکم اس حالت میں ہے جب مسلمان حکم اصلی پر قادر نہ ہوں۔

اس کی نظیر مسجد الحرام ہے جب تک اس پر مشرکین مسلط رہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم وہاں نماز بھی پڑھتے رہے، بیت اللہ کا طواف بھی فرماتے رہے۔اسی درمیان میں وہ زمانہ بھی آیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے عمرہ کے لئے مکہ تشریف لائے۔اور مشرکین نے

نہیں آنے دیا پھر اس پر صلح ہوئی کہ تین روز کے لئے تشریف لائیں اور عمرہ کر کے چلے جائیں آپ نے اس صلح کو قبول فرمایا اور وقت محدود تک قیام فرما کر واپس تشریف لے گئے۔

یہ سب اس وقت ہوا جب تسلط (یعنی آپ کا غلبہ واقتدار) نہ تھا۔ عذر کی حالت میں آپ نے اس حکم عارضی پر عمل فرمایا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو باقاعدہ مسلط فرمایا اس وقت اصلی حکم پر عمل فرمایا۔ یہ تفصیل ہے اس صلح کے منظور کر لینے میں۔ (امداد الفتاویٰ ص ۶۹۲ ج ۲، سوال نمبر ۷۹۷ بوادر النوادر ص ۷۷۱ ج ۲، امداد الفتاویٰ ص ۲۴۶ ج ۴ ملفوظات اشرفیہ ص ۳۹۹)

اگر حکام کی طرف سے ناگوار بات پیش آئے یا وہ ظلم زیادتی کریں

اگر حکام کی جانب سے کوئی امر طبیعت کے خلاف پیش آئے تو صبر کرے شکایت اور بددعا نہ کرے البتہ اس کی نرم مزاجی کے لئے دعا کرے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا اہتمام کرے تا کہ اللہ تعالیٰ حاکموں کے دل کو نرم کر دے ایک حدیث میں یہ مضمون آیا ہے۔ (حقوق الاسلام ص ۱۰)

حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں بادشاہوں کا مالک ہوں، بادشاہوں کے دل میرے ہاتھ میں ہیں اور جب بندے میری اطاعت کرتے ہیں میں ان بادشاہوں کے دلوں کو ان پر رحم اور شفقت کے ساتھ پھیر دیتا ہوں اور جب بندے میری نافرمانی کرتے ہیں، میں ان بادشاہوں کے دلوں کو غضب اور عقوبت کے ساتھ پھیر دیتا ہوں۔ پھر وہ ان کو سخت عذاب کی تکلیف دیتے ہیں۔ (حیوۃ المسلمین ص ۲۰۴)

(اس سے معلوم ہوا کہ) اگر حکام ظلم کرنے لگیں تو ان کو برا مت کہو سمجھ جاؤ کہ ہم سے حقیقی حاکم (یعنی اللہ تعالیٰ) کی نافرمانی ہوئی ہے یہ اس کی سزا ہے۔ اپنی حالت درست کر لو۔ اللہ تعالیٰ حاکموں کے قلوب کو نرم کر دیں گے۔ (تعلیم الدین ص ۴۱)

اگر حکام ہی کی طرف سے کوئی ناگوار واقعہ پیش آئے تو تہذیب سے اپنی تکلیف کی اطلاع کر دو۔ اگر پھر بھی حسب مرضی انتظام نہ ہو تو صبر کرو اور عمل سے یا زبان سے یا قلم

سے مقابلہ مت کرو۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہو کہ تمہاری مصیبت دور ہو۔

اور اگر کہیں ظالم لوگ چھوڑ دینے پر نہ مانیں اور جان ہی لینے پر آمادہ ہوں تو مسلمانوں کو مقابلہ پر مضبوط ہو جانا ہر حال میں فرض ہے۔

وھذا من باب القتال حیث تفرض عینا اذاھجم العدولا من باب الاکراہ

(حیٰوۃ المسلمین ص ۱۷۹)

مظالم کے وقت بھی حکومت سے مقابلہ کرنا ہمارا کام نہیں حکومت سے مقابلہ کرنا تو حکومتوں کا کام ہے رعایا کو حکومت سے مقابلہ کرنے میں نقصان ہے

بعض لوگ علانیہ طور پر خردہ گیری اور اس کے خلاف خفیہ تدبیریں اور سازش کرتے ہیں اس خردہ گیری کے جو نتائج ہیں ظاہر ہے کہ ایسا شخص جو ہر طرح حکومت کے دائرہ میں مقید ہو کسی طرح ان نتائج کا متحمل نہیں ہو سکتا تو پھر اس پر اقدام کرنا حدیث ذیل کی صریح مخالفت کرنا ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم لا ینبغی للمومن ان یذل نفسه قیل یا رسول اللہ و کیف یذل علی نفسه قال یتحمل من البلاء مالا یطیقه (رواہ الترمذی)

ترجمہ:۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کو زیبا نہیں کہ اپنے کو ذلیل کرے۔ پوچھا گیا یا رسول اللہ اپنے کو کس طرح ذلیل کرے گا۔ فرمایا ایسی بلا کو اپنے اوپر لادے جس کے برداشت کی اس کو طاقت نہ ہو۔

اور ایسی حالت میں سازش کرنا کہ حکومت کے ساتھ معاہدہ بھی قائم ہے سراسر غدر (دھوکہ) اور بدعہدی ہے جس کا حرام ہونا شریعت محمدیہ میں صریح ہے۔

اسلامی تعلیم تو یہاں تک ہے کہ اگر حکومت کی جانب سے کوئی تکلیف بھی پہنچے تب بھی حکام کے لئے بد دعا میں مشغول ہونے تک کی اجازت نہیں۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف کی ''کتاب الامراۃ'' کی یہ آخری حدیث ہے۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں تمام بادشاہوں کا مالک ہوں۔ اور بادشاہوں کا بادشاہ ہوں بادشاہوں کے دل میرے قبضہ میں ہیں اور بیشک بندے جب میری اطاعت کرتے ہیں میں ان کے بادشاہوں کے دلوں کو مہربانی اور شفقت کے ساتھ ان پر پھیر دیتا ہوں۔ اور جب بندے میری نافرمانی کرتے ہیں میں ان کے دلوں کو ناخوشی اور انتقال کے ساتھ پھیر دیتا ہوں پس وہ ان کو سخت تکلیف پہنچاتے ہیں سو تم اپنے کو بادشاہوں کے لئے بددعا کرنے میں مت لگاؤ البتہ اپنے کو ذکر اور نیازمندی میں لگاؤ تاکہ میں تمہارے لئے کافی ہو جاؤں۔ روایت کیا اس کو ابو نعیم نے کتاب ''الحلیہ'' میں۔ (مشکوٰۃ کتاب الامارۃ)

پس اسلامی تعلیم کا خلاصہ ایسے حالات کے متعلق یہ ہوا کہ ان کلفتوں اور مصیبتوں کا سبب اپنے اعمال بد کو سمجھ کر دعا و استغفار اور ذکر اللہ اور اصلاح اعمال اور اللہ کی اطاعت میں مشغول ہوں اور کوئی امر قوم یا ملک یا ملوک (حکام) کے ساتھ خلاف شرع نہ کریں۔

عزت وعصمت کی حفاظت کے لئے اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا

سوال:۔ ایک عورت ریل گاڑی میں سفر کر رہی تھی، شام کا وقت تھا یہ تنہا تھی، گاڑی میں ایک لمبا تڑنگا مرد چڑھ آیا اور اس کو دھمکانا شروع کیا خدا تعالیٰ نے ان کو بھی ہمت دی۔ انہوں نے اس کو ڈانٹا اور زنجیر کھینچ لی، گاڑی ٹھہر گئی اور وہ شخص کود کر بھاگ گیا اس عورت نے ارادہ کر لیا تھا کہ اگر گاڑی نہ ٹھہری تو میں گاڑی سے کود جاؤں گی۔ تو سوال یہ ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو کیا یہ خودکشی ہوتی؟

الجواب:۔ عفیف (پاکدامن) عورتوں کو ایسے وقت میں حیا وعفت کا اکثر اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ وقوع ہلاکت کی طرف توجہ بھی نہیں ہوتی۔ بہت سے لوگ اس طرح کود کر بچ بھی گئے ہیں۔ البتہ چوٹ ضرور لگی ہے۔ سو ایسے غلبہ کے وقت حق تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ معذور ہوں گی۔ اس لئے اس کو خودکشی نہ کہا جائے گا۔

وقريباً فی هذا اجاب استاذی مولانا محمد يعقوب حين سئل عن النسوة الاتی اتقين انفسهن فی البير حين خفن علی عفتهن فی الزمان المعروف بالغدر. لكن اذا فات الشرط فات المشروط.

قربانی اور گوشت خوری پر پابندی اور مسلمانوں کے لئے شرعی ہدایت

بعض ظالم لوگ قربانی پر خاص کر گائے کی قربانی پر مسلمانوں سے لڑائی کرتے ہیں اور کبھی عین قربانی کے وقت مسلمانوں پر چڑھ آتے ہیں اور قربانی جو کہ ان کا حق جائز بلکہ واجب ہے اس کے چھوڑنے پر مجبور کرتے ہیں جو اسراران کی زیادتی ہے۔

اور چونکہ حدیثوں میں خاص گائے کا حلال ہونا اور اس کی قربانی کی فضیلت اور خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا گائے کی قربانی فرمانا مذکور ہے۔

اس لئے مسلمان اس مذہبی دست درازی کو گوارہ نہیں کرتے۔ اور اپنی جان تک دے دیتے ہیں جس میں وہ بالکل بے قصور ہیں۔ سو اس کے متعلق مسئلہ سمجھ لینا چاہے کہ جس طرح ایسی مضبوطی کرنا (ہمت دکھلانا) جائز ہے۔ اگر کہیں ایسی مضبوطی کرنا (جوان مردی دکھلانا) خلاف مصلحت ہو تو بھی شریعت سے دوسری بات بھی جائز ہے وہ یہ کہ اس وقت صبر کریں اور قربانی نہ کریں فوراً حکام کو اطلاع کر کے ان سے مدد لیں۔ اگر قربانی کی مدت میں یعنی بارہ تاریخ تک اس کا کافی انتظام کر دیا جائے تو قربانی کر لیں۔ اور اگر اس کے بعد انتظام ہو تو اگلے سال قربانی کریں اور اس سال قربانی کے حصہ کی قیمت محتاجوں کو دے دیں۔ (مسلم شریف)

اور اگر پہلے سے معلوم ہو جائے کہ جھگڑا ہوگا تو اس وقت وہ طریقہ اختیار کریں جو (پہلے) لکھا گیا جس کا مضمون یہ ہے کہ:

''اگر کسی مخالف کی طرف سے کوئی شورش (ہنگامہ، فتنہ) ظاہر ہو تو حکام کے ذریعہ سے اس کی مدافعت کرو۔ خواہ وہ خود انتظام کر دیں خواہ تم کو انتظام کی اجازت دے دیں۔''

اور اگر حکام ہی کی طرف سے ناگوار واقعہ پیش آئے تو تہذیب سے اپنی تکلیف کی اطلاع کر دو۔ اگر پھر بھی حسب مرضی انتظام نہ ہو تو صبر کرو۔ اور عمل سے یا زبان سے یا قلم سے مقابلہ مت کرو۔ (کیونکہ حکومت سے مقابلہ کرنا حکومتوں کا کام ہے نہ کہ رعایا کا) اور اللہ سے دعا کرو کہ تمہاری مصیبت دور ہو۔

اور اگر کہیں ظالم لوگ چھوڑ دینے پر نہ مانیں اور جان ہی لینے پر آمادہ ہوں تو مسلمانوں کو مقابلہ پر مضبوط ہوجانا ہر حال میں فرض ہے، گو کمزور ہی ہوں خلاصہ یہ کہ حتی الامکان فتنہ وفساد کو امن کے ساتھ دفع کریں۔ اور جو کوئی اس پر بھی سر ہو جائے (یعنی باز نہ آئے) تو پھر مرتا، کیا نہ کرتا۔

ہندوؤں کو خوش کرنے یا اتفاق کی وجہ سے گائے کی قربانی ترک کرنا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندوؤں کو خوش کرنے اور اتفاق پیدا کرنے کے خیال سے گائے کی قربانی یا روزمرہ کے لئے گائے کا ذبح بند کردینا کیسا ہے؟ ہندوستان کی حالت ملاحظہ فرماتے ہوئے شرعی حکم سے مطلع فرمائیں۔

الجواب:۔ محض ہندوؤں سے اتفاق پیدا کرنے اور ان کو خوش کرنے کے لئے گائے کی قربانی کو موقوف کردینا اور ہمیشہ کے لئے گائے کی قربانی کا گوشت چھوڑ دینا درست نہیں۔ اس لئے کہ گائے کا ذبح کرنا شعائر اسلام سے ہے۔ اور گائے کا ذبح نہ کرنا اور اس کے گوشت سے مذہبی حیثیت سے نفرت کرنا شعائر کفر سے ہے۔ اسلامی شعائر کو چھوڑ کر کفر کے شعائر کو اختیار کرنا، اور اس خیال سے خود ذبح کو چھوڑ دینا اور کسی کو ترغیب نہ دینا بلکہ ترک کی رغبت دلانا کہ مخالفین اسلام خوش رہیں، یہ مداراۃ ناجائز اور مداہنہ فی الدین ہے۔ ہماری شریعت مطہرہ نے ہرگز اس کی اجازت نہیں دی ہے۔

یحلفون باللہ لکم لیرضوکم میں تصریح ہے کہ اللہ ورسول کو...... ناراض کرکے جب مسلمانوں کو راضی کرنا بھی موجب عقاب وعتاب ہے۔ تو اللہ ورسول کو ناراض کرکے کافروں کو راضی کرنا تو کس طرح موجب عتاب نہ ہوگا اور اس امر کو معمولی نہ سمجھیں۔

دوسرے مذہب کی رعایت میں گوشت خوری ترک کرنا شریعت کی روشنی میں

فرمایا گوشت خوری وغیرہ میں بعض مسلمان کچھ کام کرنے لگتے ہیں کہ یہ واجب یا

شعائر اسلام میں سے تو ہے نہیں (پھر اس پر اتنا اصرار کیوں؟) مگر اس رائے کا مذموم ہونا اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اونٹ کا گوشت ترک کرنا چاہا تھا تو اس پر آیت نازل ہوئی:

یایھا الذین امنوا ادخلوا فی السلم کافۃً ولا تتبعوا خطوات الشیطٰن.

ترجمہ:۔ اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو اور شیطان کے قدم بقدم مت چلو۔

تشریح:۔ حضرت عبداللہ بن سلام وغیرہ جو پہلے علماء یہود تھے اور اس مذہب میں اونٹ کا گوشت حرام تھا۔ ان صاحبوں کو اسلام کے بعد یہ خیال ہوا کہ شریعت موسویہ میں اونٹ کا گوشت کھانا حرام تھا۔ اور شریعت محمدیہ میں اس کا کھانا فرض نہیں سو اگر ہم بدستور اونٹ کا گوشت باوجود حلال اعتقاد رکھنے کے صرف عملاً ترک کر دیں تو شریعت موسویہ کی بھی رعایت ہو جائے اور شریعت محمدیہ کے بھی خلاف نہ ہو اور اس میں خدا تعالیٰ کی زیادہ اطاعت اور دین کی زیادہ رعایت معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس خیال کی اصلاح اہتمام سے فرمائی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اسلام کامل فرض ہے اور اس کا کامل ہونا جب ہے کہ جو امر اسلام میں قابل رعایت نہ ہو اس کی رعایت دین ہونے کی حیثیت سے نہ کی جائے اور ایسے امر کو دین سمجھنا یہ ایک شیطانی (مکر اور) لغزش ہے۔ (بیان القرآن ص ۷۱۱ ج ۱)

اور اس مکر شدید کی جڑ تھی ملت منسوخہ کی رعایت، پس مکر کا حاصل یہ ہوا کہ جب وہ ملت اسلامیہ کے معارض ہے اور اس گوشت کو اسلام نے قبیح نہیں قرار دیا پھر ایسا کیوں کیا جاتا ہے (کہ دوسرے مذہب کی رعایت و اتباع میں گوشت چھوڑ دیا جائے) اسی کو اتباع شیطانی فرمایا۔ پھر بھی اگر کسی کی رائے ہو کہ گاؤکشی چھوڑ دیں تو چونکہ اس رائے کی بنیاد ملت کفریہ کی رعایت ہے یہ اس سے بھی اشد (سنگین) ہوگا۔

ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ یہ تو گویا جائز کو واجب قرار دے دیا۔

میں نے کہا کہ خصوصیت کے اعتبار سے گو فی نفسہ یہ واجب نہیں لیکن ملت کفریہ کی رعایت کے مقابلہ میں بیشک اہل اسلام کا شعار ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ گائے کا گوشت کھانے سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں ہے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمانے سے شدید تعلق معلوم ہوتا ہے۔

من صلیٰ صلوٰ تناو استقبل قبلتنا واکل نبیحتنا. (حسن العزیز ص ۴۹۲ ج ۲)

مزید تحقیق وتفصیل

بعض مسلمان ہندوؤں کے میل جول کی وجہ سے گائے کا ذبح کرنا اور اس کا گوشت کھانا پسند نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ اسلام کچھ گوشت خوری پر موقوف نہیں۔ اسلام میں گوشت کھانا اور نہ کھانا دونوں یکساں ہیں گائے کا گوشت نہ کھا کر بکری کا کھالیا تو اس میں کیا حرج ہے۔ گائے کا گوشت کھانا فرض تھوڑی ہے۔

افسوس ان لوگوں نے شریعت خداوندی کے مقابلہ میں اپنی ایک شریعت گھڑ لی ہے ان لوگوں نے یہ مسئلہ ہندوؤں سے لیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ گائے ہندوؤں کا معبود ہے اس کا ذبح کرنا اس لئے ان کو ناگوار ہے۔ پھر ان مسلمانوں کو شرم نہیں آتی جس غرض کا منشاء شرک ہو اس میں وہ ہندوؤں کی موافقت وحمایت کرتے ہیں۔ (سنت ابراہیم ص ۳۲ ج ۱۷)

جو چیز عام طور پر اسلام وکفر میں امتیاز پیدا کرنے والی ہو وہی شعار اسلام ہے اور ظاہر ہے کہ ہندوستان میں مسلمان کو ہندوؤں سے امتیاز گائے کے ذبح اور اس کا گوشت کھانے ہی سے ہوتا ہے اور اس وقت تجربہ نے بتلا دیا کہ جو لوگ اس شعار اسلام کے تارک تھے زیادہ تر وہی فتنہ ارتداد کے دام میں مبتلا ہوئے۔ اور جو اس شعار کو اختیار کئے ہوئے ہیں ان کی طرف کوئی رخ بھی نہیں کرتا تو علاوہ شعار اسلام ہونے کے یہ بڑا پہرہ دار بھی ہے۔ (محاسن اسلام ص ۲۶۷ ج ۱۲)

غلط فہمی کا ازالہ

ازروئے شرع گائے کی قربانی سے روکنا جائز بھی ہے یا نہیں؟ بعض بھولے لوگوں کو اس میں غلطی ہوئی ہے وہ کہتے ہیں کہ مطلق قربانی واجب ہے خواہ بکری کی ہو یا گائے کی۔ پھر کیا ضرورت ہے آپس میں اختلاف پیدا کرنے کی۔ گائے کی قربانی چھوڑ دیں۔ بکری کی

کیا کریں۔ بظاہر تو یہ رائے بہت مناسب ہے لیکن غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ بالکل لچر اور (ضعیف بات ہے)۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ دیکھنا چاہئے کہ گائے کی قربانی ترک کرنا دوسری قوم کے نزدیک مذہبی امر پر مبنی ہے یا ملکی مصالح پر۔ تو واقع میں ان کے یہاں یہ مذہب کا جز ہے پس اس وقت ہمارا ترک کرنا کفر کی رعایت کرنا ہے اس لئے ہرگز جائز نہیں ہے۔

بعض لوگ گاؤکشی کے متعلق اخباروں میں اپنی رائے لکھ کر ہم سے بھی درخواست کرتے ہیں کہ ہم بھی اخباروں میں اس کے متعلق اپنی رائے لکھیں مگر ہمارے نزدیک اخباروں میں آج کل ایسا مضمون لکھنا حکام کو اپنی طرف سے بدگمان کرنا ہے۔ کیونکہ نامہ نگاروں کو حکام عموماً مفسد سمجھتے ہیں اس لئے ہم کسی کو بدگمان نہیں کرنا چاہتے۔

ہمارے اصول میں ہے **اتقوا مواضع التهم** تہمت کے مواقع سے بچو۔

نیز اخبار میں مضمون لکھ کر اس مضمون کو بے قدر کرنا ہے۔ اس مضمون کی عام مسلمانوں اور دینداروں کی نظروں میں کچھ وقعت نہیں ہوتی اس لئے ہم کو اخبار میں مضمون لکھنا پسند نہیں۔ اور یہ بھی پسند نہیں کہ ہندوؤں کو چڑا چڑا کر گاؤکشی کریں کہ اس میں دل آزاری اور بلا ضرورت فتنہ ہے جیسے پہلے سے کرتے ہو اسی طرح کرتے رہو۔ (الضحایا ملحقہ سنت ابراہیم ص ۱۶۰)

غیر مسلموں کو قرآن مجید جلانے سے متعلق
ایک استفتا اور اس کا جواب

سوال:۔ ہولی ہندوؤں کی عید کا دن ہے وہ اس دن کھیل کود کرتے ہیں ہندوؤں کے محلّہ میں ایک مسجد ہے جس میں کھڑکی میں قرآن شریف رکھا تھا جسے ہندوؤں کے بچوں نے وہاں سے اٹھا کر باہر لا کر آگ میں جلا دیا۔ جلے ہوئے اوراق مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ انہوں نے افسوس کے ساتھ مقدمہ دائر کر دیا جو چل رہا ہے۔ ہندوؤں اور ان کے وکیلوں نے مسلمانوں سے کہا کہ مقدمہ اٹھا لو۔ تمہارا مذہب اس بارے میں جو فیصلہ کرے گا ہم سب کو قبول ہوگا۔ مسلمانوں نے بندہ کو طلب کر کے شرعی حکم مانگا۔ میں نے کہا کہ میں اس

مسئلہ سے ناواقف ہوں علماء مفتیان کرام کولکھ رہا ہوں جوفتویٰ آئے گا اسے پیش کردوں گا فتویٰ آنے تک انہوں نے سرکار سے مہلت لے لی ہے۔ معاملہ چونکہ نہایت اہم ہے اس لئے جواب میں حوالہ کتب ضرور تحریر فرمائیں۔

نیز یہ بھی واضح فرمائیں کہ اگر بالفرض بے حرمتی بجائے بچوں کے بڑوں سے ظاہر ہوتو کیا حکم ہوگا۔ اور ہوش یا بے ہوشی کی حالت میں ہوتو کیا حکم ہے۔

الجواب:ا:۔(صورت مسئلہ میں) دریافت کردہ فعل میں ''تعزیر'' (یعنی سزا) واجب ہے۔

۲:۔اور شرعاً تعزیر کی مقدار معین نہیں ہے بلکہ حاکم کی صوابدید پر موقوف ہے۔

۳:۔اور حاکم کے لئے ضروری ہے کہ جرم کے درجہ اور مجرم کی حالت پر نظر کرے دونوں باتوں پر اچھی طرح غوروخوض کرکے ایسی سزا تجویز کرے جس سے تعزیر کا مقصد حاصل ہو۔ یعنی اس قسم کے جرائم سے رکاوٹ (وبندش) ہو۔ ناظرین کو عبرت وسبق ملے۔ اور شعائر اسلامی کے احترام وتقدس کی حفاظت ہو۔

اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ واقعہ تو ہولناک اور انتہائی اضطراب انگیز ہے اگر کافی سزا تجویز نہ کی جائے گی تو شعائر اسلام کے بے وقعتی کا سبب اور مسلمانوں کے دل ٹوٹنے کا باعث نیز اہل اسلام کے غضب کو جوش میں لانے والا، اس کے علاوہ مستقبل میں سنگین مفاسد اور بڑے فتنوں کو جنم دینے والا ہوگا۔ اور نابالغ ہونا مانع تعزیر نہیں اور نشہ میں ہونا بھی تعزیر سے مانع نہیں۔ (امداد الفتاویٰ ص ۵۳۸ ج ۲ دلائل کے لئے اصل کتاب ملاحظہ فرمائیں)

مکتوب گرامی

اس کے ساتھ مندرجہ ذیل خط بھی روانہ فرمایا۔

السلام علیکم! قرائن سے دل میں یوں آتا ہے کہ ہندوؤں کے وکیلوں نے کتابوں کے مطالعہ سے یقین کرلیا ہے کہ اس جرم میں قانونی سزا کے مقابلہ میں شرعی سزا زیادہ ہلکی پھلکی ہے۔ اسی وجہ سے وہ شرعی سزا پر راضی ہوتے ہیں۔ اور شرعی سزا حاکم پر موقوف ہے، اور حاکم کا حال معلوم ہے لہٰذا اندیشہ ہے کہ ہلکی (معمولی) سزا ہی تجویز کردے جس سے

جرائم کی بندش کا مقصد بھی حاصل نہ ہو۔ (جو تعزیر کا اصل مقصد ہے) اس لئے احقر کی رائے یہ ہے کہ عقلاء بھی اتفاق کرلیں تو بھی اس قسم کی درخواست کو قبول نہ کریں۔

اور یہ حکم شرعی کا رد کرنا نہیں ہے بلکہ چوں کہ بصورت دیگر اس قسم کے جرائم کی بندش کی مصلحت حاصل ہونے کی امید نہیں ہے۔ لہٰذا (گویا) یہ امر غیر شرعی کا رد کرنا ہے اور سرکاری حاکموں سے قانونی سزا کے اجراء کی درخواست کریں کہ یہ مذکورہ بندش پر مرتب ہونے کے سبب گویا) شرعی سزا ہی پر مشتمل ہے۔ واللہ اعلم۔ (امداد الفتاویٰ ص ۵۳۸، ج ۲ سوال نمبر ۶۴۶)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی

ایک مقام پر ایک گستاخ کافر نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ حالات شائع کئے تھے۔ مسلمانوں کے مواخذہ پر اس نے علماء کی ایک باقاعدہ جمعیت سے معافی چاہی اور آئندہ احتیاط رکھنے کا اور فی الحال اپنی اس غلطی اور معافی کی درخواست کا اخباروں میں اعلان کردینے کا وعدہ کیا۔ اکثر مسلمانوں کی رائے کو منظور کرلینے کی ہوگئی اور بعض نے اختلاف کیا۔ اور حکومت موجودہ میں استغاثہ ہی کو ترجیح دی۔

اور دلیل یہ بیان کی کہ یہ حق اللہ ہے اس کی معافی کا حق صرف سلطان اسلام کو ہے اس کے متعلق سوال آیا تھا۔ جس کا جواب حسب ذیل لکھا گیا۔

''معافی کی جو حقیقت صاحب شبہ نے سمجھی ہے اس معنی کو یعنی معافی کے بعد ناگواری نہ رہنا'' یہ معافی صورۃً معافی ہے۔ اسی لئے بعض حضرات کو شبہ ہوگیا کہ حق تعالیٰ کے معاف کرنے کا کسی کو حق نہیں مگر حقیقت میں یہ معافی نہیں بلکہ صلح ہے اور صلح سے کوئی امر مانع نہیں، اور صلح جیسے بلاشرط ہوسکتی ہے اسی طرح شرط پر بھی ہوسکتی ہے۔ جیسے یہاں پر شرط مقرر کی جاتی ہے کہ آئندہ ایسی حرکت نہ کرے۔ البتہ صلح میں یہ شرعاً قید ہے کہ مسلمانوں کے حق میں وہ مصلحت ہو اور یہاں مصلحت ہونا ظاہر ہے کہ فی الحال اسلام کی عزت اور کفر کی ذلت ہے اور فی الحال ایک منکر قبیح کفری (یعنی آئندہ کے لئے ایک کفریہ منکر) کی بندش ہے خود عہد کرنے والے سے بھی اور امید ہے کہ دوسرے لوگوں میں (بھی اس کا اثر ہوگا) کہ اس منکر کا نتیجہ دیکھ کر بعض لوگ عبرت پکڑیں گے۔ اور بعض لوگ مسلمانوں کی رواداری سے متاثر ہوں گے۔

اور حکومت سے استغاثہ میں ان توقعات کا گمان بھی نہیں۔ چنانچہ موجودہ فضاء اس کی شاہد ہے۔ پھر اگر خدانخواستہ استغاثہ میں کامیابی نہ ہوئی تو اس پر جو مفاسد مرتب ہوں گے ان کے انسداد (بندش) پر مسلمانوں کو کوئی کافی قدرت نہیں۔ ہمیشہ کے لئے ایسے لوگوں کی جرأت بڑھ جائے گی۔

بلکہ ترقی کر کے کہا جاتا ہے کہ اگر کامیابی بھی ہوگئی تو ظاہر ہے کہ سزائے موت کا تو احتمال بھی نہیں قید یا جرمانہ ہوسکتا ہے سو بہت سے مفسد (ظالم) ایسے ہیں کہ قید اور جرمانہ کی پرواہ بھی نہیں کرتے۔ ان کو ایک نظیر ہاتھ آ جائے گی (اور آئندہ بھی خطرہ ہوگا)۔

رہا یہ شبہ کہ معافی کا حق صرف سلطان اسلام کو ہے عام مسلمانوں کو نہیں اور اس کی جو دلیل بیان کی گئی ہے کہ یہ حق اللہ ہے اس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ سلطان کو بھی یہ حق نہیں کیونکہ سلطان حقوق اللہ کو معاف نہیں کرسکتا۔ (ملفوظات کمالات اشرفیہ ص ۴۰۱ ص ۴۰۲)

حکام کی اطاعت کا بیان

حکام کی اطاعت کے حدود اور مسئلہ کی مختلف صورتیں

جس صورت میں سلطان نے کوئی حکم دیا ہے اس کی مختلف صورتیں ہیں۔

۱:۔ اگر وہ حکم ایسا ہو کہ اس میں عام لوگوں کی مصلحت ہے (اور اس کے) خلاف کرنے میں عام ضرر ہو۔ اس میں (حاکم کی اطاعت قانون کی پابندی) ظاہراً و باطناً واجب ہے۔ (یعنی علانیہ طور پر بھی واجب ہے اور خفیہ طور پر یعنی حاکم کو اطلاع بھی نہ ہو تب بھی واجب ہے)۔

۲:۔ اور اگر ایسا نہیں ہے (یعنی خلاف کرنے میں عام ضرر نہیں ہے) تو صرف ظاہراً (حاکم کی اطاعت) واجب ہے تاکہ فتنہ نہ ہو۔ باطناً واجب نہیں (یعنی اگر حاکم کو اطلاع نہ ہو تو خفیہ طور پر اس حکم کے خلاف کرنے میں گناہ نہیں) کیونکہ اپنے نقصان کے التزام کا ہر شخص کو اختیار ہے۔

۳:۔ (حاکم نے جو حکم دیا ہے) ایسا حکم دائمی نہیں ہوسکتا حاکم کی حیات تک باقی رہے گا پھر باطل ہو جائے گا۔ اس کے بعد کے حاکم کو خصوصیت کے ساتھ تجدید کی حاجت ہوگی۔ (مزید تفصیل دلائل کے لئے ملاحظہ ہو نمبر ۲)

حکام کی اطاعت اور حکومت کے قوانین کی پابندی کا شرعی ضابطہ

یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے (راجح یہ ہے کہ) حکام اسلام کی اطاعت مباحات میں بھی ضروری ہے۔ اگر حاکم کسی مباح کو منع کردے۔ محکومین (رعایا) پر اطاعت واجب ہوجاتی ہے......
آیات واحادیث میں امراء مسلمین کی اطاعت واجب ہونے کا حکم مصرح ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا محل (موقع) وہی امر ہے جو فی نفسہ مباح ہے۔ یعنی جائز ہے۔ ورنہ واجب یا حرام میں خود امر و نہی شرعی (یعنی شریعت کا حکم کرنا) کافی ہے۔ اس میں اولوالامر کا کیا دخل۔

(اسی طرح) امر مجتہد فیہ میں (یعنی جس مسئلہ میں اختلاف ہو اس میں) حکام مسلم اگر ایک شق متعین کردے تو وہ واجب ہوجاتی ہے۔

حاکم کے ظلم کرنے کی صورت میں شرعی حکم

(حاکم اگر) ایسا فسق اختیار کرے جس کا اثر دوسروں تک پہنچے جس کو ظلم کہتے ہیں (اس کی دو صورتیں ہیں یا تو اس کا تعلق دنیا سے یعنی مال سے ہوگا یا اس حکم کا تعلق دین سے ہوگا اگر) اس ظلم کا محل صرف مال ہو یعنی لوگوں کے مال ناحق لینے لگے۔ اس کی بھی دو صورتیں ہیں، ایک صورت تو یہ ہے کہ اس میں جائز ہونے کا شبہ ہوسکتا ہے۔ دوسرے جس میں جائز ہونے کا شبہ نہ ہو اگر پہلی صورت ہے یعنی اس میں جواز کا اشتباہ بھی ہوسکتا ہے۔ جیسے مصالح سلطنت کے نام سے (یعنی حکومت کے فائدے اور مصلحت کے نام سے) ٹیکس وغیرہ وصول کرنے لگے۔ (اس کا حکم یہ ہے کہ حاکم کے حکم کی اور اس کے قانون کی پابندی) اور اطاعت کرے۔

(دوسری صورت میں یعنی جب حاکم) مالی ظلم کرے مگر اس میں جواز کا بھی اشتباہ نہ ہو بلکہ صریح ظلم ہو (اس کا حکم یہ ہے کہ) اپنے اوپر سے ظلم کو دفع کرے اگرچہ قتال کی نوبت آجائے (البتہ) صبر کرنا بھی جائز ہے بلکہ غالباً اولیٰ ہے اور یہ قتال للخروج (بغاوت) نہیں ہے بلکہ دفاع کے لئے ہے اور حدیث میں فاسمع و اطع کا امر ہے۔ جو ظاہر اً وجوب کے لئے ہے اس کی تفسیر عدم خروج (یعنی بغاوت نہ کرنا) ہے پس کوئی تعارض (اور اشکال بھی) نہیں مگر چونکہ یہ دفاع بھی صورۃً

خروج (بغاوت) تھالہذا صبر کی افضلیت ظاہر ہے..... جس کی فضیلت احادیث میں آئی ہے۔

حاکم اگر دینی امور میں ظلم وزیادتی کرنے لگے اس صورت کا شرعی حکم

(حاکم اگر ایسا) فسق وظلم اختیار کرے جس کا محل دین ہو یعنی ان کو معاصی شریعت کے خلاف باتوں پر مجبور کرے۔ مگر یہ فسق (ظلم اسی، وقت تک ہے جب کہ اس کا منشاء استخفاف، یا استقباح دین اور استحسان کفر (یعنی دین کو حقیر اور برا جاننا اور کفر کو اچھا سمجھنا) نہ ہو ورنہ یہ بھی حقیقتاً کفر ہوگا۔ (جس کا حکم پہلے گزر چکا) یا فی الحال تو اس کا منشاء (سبب) استخفاف وغیرہ نہ ہو، لیکن اکراہ عام قانونی شکل میں ایسے طریقہ پر ہو کہ ایک مدت تک اس پر عمل ہونے سے ظن غالب یہ ہو کہ آئندہ چل کر طبیعتوں میں استخفاف (یعنی اس شرعی حکم کی حقارت) پیدا ہو جائے گی تو ایسا اکراہ اور قانون بنانا بھی کفر کے حکم میں ہوگا۔ چنانچہ فقہاء کا اذان وختنہ کو (جو کہ سنت ہیں) عام طور پر ترک کرنے کو استخفاف دین یا تارکین (چھوڑنے والوں) سے لڑائی کا موجب قرار دینا صریح دلیل ہے۔ ایسے عموم کے کفر میں ہونے کی۔

اس صورت کا حکم یہ ہے کہ یہ (صورتیں یعنی ظلم وزیادتی) اکراہ علی المعاصی کے قبیل سے ہیں اس کا مستقلاً حکم کتاب الاکراہ میں مذکور ہے وہاں معلوم کیا جائے۔

حاکم کے ظلم کرنے کی صورت میں مظلومین کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لئے شرعی حکم

یہ حکم تو خود مظلومین کا تھا باقی دوسروں کے لئے امام (حاکم) کے مقابلہ میں ان مظلومین کی اعانت (مدد) کرنا، یا ان کے مقابلہ میں امام کی اعانت کرنا (شرعاً اس کا حکم کیا ہے؟) سو امام کی اعانت تو اس صورت میں بالاتفاق حرام ہے باقی مظلومین کی اعانت (وحمایت) کرنا اس میں جامع الفصولین اور فتح کی عبارت میں اختلاف ہے۔ علامہ شامی نے تطبیق کی کوشش کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر اس اعانت (یعنی مظلومین کی حمایت) کے مفید ہونے کی امید ہو تو اعانت ہے۔ اور قواعد سے مفید ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی

فتنہ مرتب نہ ہو ورنہ اعانت نہ کرے۔ واللہ اعلم۔

بعض حالات میں غیر اسلامی حکومتوں کی نصرت واجب ہے

اصولیین وفقہاء کا مسلمہ مسئلہ ہے کہ ما اجتمع الحلال والحرام الا وقد غلب الحرام یعنی حلال وحرام کا مجموعہ حرام ہی ہوتا ہے۔ اور یہی مسئلہ عقلی بھی ہے کہ کامل اور ناقص کا مرکب ناقص ہی ہوتا ہے تو کفار اور مسلم سے جو سلطنت مرکب ہوگی، ایسی حکومت بھی غیر اسلامی ہوگی۔ پس جب کہ ترکی میں (جمہوریت) قائم ہوگئی ہے جو مسلم اور غیر مسلم سے مشترک ہے تو وہ اسلامی سلطنت نہ ہوگی لیکن مسلمانوں پر اس کی نصرت واجب ہے کیونکہ دوسری سلطنتیں اس کا مقابلہ اسلامی سلطنت سمجھ کر کرتی ہیں۔

وقد افتی استاذی بنصرة بعض اهل البدعة فی مقابلة اهل الکفر لان اهل الکفر انما زاحموهم فی البدعة زعما منهم انها من الاسلام.

حاکم وقت کسی امر مباح کا حکم دے تو وہ واجب ہوتا ہے

فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ حاکم وقت اگر کسی امر مباح کا حکم دے یا منع کرے تو اس کی اطاعت واجب ہوجاتی ہے اور اس کی دلیل وہ نصوص ہیں جن میں سمع واطاعت حکم دیا گیا ہے اور میرے نزدیک اسی پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مبنی ہے وما کان لمومن ولا مومنه الایه کیونکہ یہ نکاح جس کی وجہ سے یہ آیت نازل کی گئی واجب نہیں تھا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی وجہ سے واجب ہوگیا تھا۔ لہٰذا اس قول کی بھی کوئی ضرورت نہیں کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم وحی کی وجہ سے تھا اور حاکم جب مصلحت دیکھے گا اپنے اجتہاد سے حکم دے گا۔ (بیاض اشرفی)

حکومت کی چوری

حکومت کے قوانین کی خلاف ورزی اور چوری کرنا جائز نہیں

عوام الناس کا فتویٰ یہی ہے کہ کافروں کا مال جس طرح بھی ملے لے لیا جائے سب جائز ہے۔

چنانچہ ریل میں بے احتیاطیوں کا مشاہدہ ہوتا ہے (کوئی بغیر ٹکٹ کے سفر کرتا ہے کوئی خلاف قانون زیادہ سامان لاد کر لے جاتا ہے) اس طرف توجہ ہی نہیں کہ قانون سے زیادہ سامان ریل پر لے جانا چاہئے، یا نہیں؟

بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ کفار کا قانون ماننا ضروری تھوڑی ہے مگر خوب سمجھ لیجئے کہ یہ قانون (اور اس طرح کے بہت سے قوانین صرف) ملکی قانون نہیں ہے۔ جو یہ عذر کیا جائے بلکہ یہ شرعی قانون اجارۃ کے متعلق ہے۔

(بالفرض) اگر سلطنت ہونے کی حیثیت سے اس کا ماننا ضروری نہ بھی ہو تو اجارۃ کے شرعی قانون کے لحاظ سے تو ماننا ضروری ہے شرائط اجارۃ میں سلطنت اور غیر سلطنت برابر ہیں۔ جن شرائط پر اجرت طے ہو ان کا پورا کرنا واجب ہوتا ہے۔ تو ان کا قانون (یعنی حکومت کا قانون) شرعی اجارۃ کے قانون کے لحاظ سے واجب العمل ہے جب انہوں نے قانون مقرر کر دیا ہے کہ (مثلاً) پندرہ کلو سے زیادہ سامان کسی کو بغیر کرایہ کے لے جانے کی اجازت نہیں تو اگر تھوڑا بھی اس سے زیادہ ہوگا تو اس وجہ سے کہ (شرائط اجارۃ اور قانون کے خلاف ہے نیز) غیر کی حق تلفی ہے اس لئے اس کا لے جانا ہرگز جائز نہ ہوگا۔

بہت سے لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ کفار کا مال ہے چاہے جس طرح تصرف کرو۔ یہ ان کی غلطی ہے۔

کافروں کا مال کھانا ان کا حق دبانا جائز نہیں

فرمایا بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ کافروں کا ہم پر کوئی حق نہیں اور ان کا مال ہر طرح کھانا جائز ہے اور اس سے کوئی وبال نہیں پڑتا۔ حالانکہ اس کا وبال مسلمانوں کا حق دبانے سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس واسطے کہ نصوص (قرآن حدیث) سے ثابت ہے کہ قیامت کے دن حق والے کو اس ظالم (یعنی حق دبانے والے اور ناحق مال کھانے والے کی) نیکیاں دلائی جائیں گی یا پھر حق والے کے گناہ اس پر ڈالے جائیں گے...... اگر کافر کے گناہ مسلمان پر ڈالے گئے تو کافر کے گناہ ظاہر ہے کہ زیادہ سخت ہوتے ہیں وہ اس پر ڈالے جائیں گے کتنی سخت بات ہے۔

غلط فہمی کا ازالہ اور احتیاط کا مقتضیٰ

عوام الناس کا تو فتویٰ ہے کہ کفار کا مال جس طرح بھی ملے سب جائز ہے (اس میں پڑھے لکھے لوگ بھی مبتلا ہیں) یہ ان کی غلطی ہے۔

بعض لوگوں نے اس کی یہ وجہ گھڑی ہے کہ ہمارے بہت سے حقوق گورنمنٹ کے ذمہ رہ گئے ہیں اسی لئے ہمارے لئے جائز ہے کہ ہم خفیہ طور سے وصول کریں۔

اول تو اس میں یہ بات ہے کہ کیا.......... ہر شخص کا حق گورنمنٹ کے ذمہ رہ گیا ہے اور پھر جن کے حقوق گورنمنٹ کے ذمہ ہوں بھی تو کیا ان کے پاس اس کا حساب ہے کہ کتنے حقوق گورنمنٹ کے ان کے ذمہ ہیں یہ سب نفس کی تاویلیں ہیں بلکہ اگر ثابت بھی ہو جائے کہ اس کا حق گورنمنٹ کے ذمہ رہ گیا ہے تب بھی نفس کی حفاظت کا تقاضا یہی ہے کہ ایسا نہ کیا جائے وجہ اس کی یہ ہے کہ نفس کو جیسی عادت ڈالی جاتی ہے ویسی ہی پڑ جاتی ہے اگر اس کی عادت ڈالی گئی تو وہ اس کا عادی ہو جائے گا اور آئندہ حد سے آگے بڑھے گا جہاں قطعاً جائز نہ ہوگا وہاں بھی اسی عادت پر عمل کرے گا نفس کو تو ذرا سا بہانہ چاہئے۔

الغرض۔ اگر ثابت بھی ہو جائے کہ گورنمنٹ کے ذمہ ہمارا حق رہ گیا ہے جب بھی ایسا نہ کریں علاج کا مقتضیٰ یہی ہے، ورنہ عادت ہو جانے کے بعد اپنا حق وصول ہو جانے پر بھی نفس (یہ حرکت) نہیں چھوڑے گا۔

جن ٹکٹوں پر مہر نہ لگی ہو اس کا دوبارہ استعمال کرنا درست نہیں

میرے پاس کثرت سے ایسے خطوط آتے ہیں کہ جن پر یا تو ڈاکخانہ کی مہر نہیں ہوتی یا ہوتی بھی ہے تو ٹکٹ پر مہر نہیں ہوتی۔

اگر میری نیت بری ہو تو میں ان ٹکٹوں سے دوبارہ نفع اٹھا سکتا ہوں کہ دوسرے خطوط پر لگا کر بھیج دوں، مگر شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی کیونکہ جو پیسے لفافہ کے دیئے گئے ہیں وہ اجرت کے طور پر ہیں، اور وہ لفافہ کی شکل اصل میں ان پیسوں کی رسید ہے پس جب ڈاک پہنچی تو وہ پیسے وصول ہو گئے اب اس رسید سے (یعنی لفافہ یا ٹکٹ سے) دوسری بار

وصول کرنا حرام ہے۔ پس میں ایسے ٹکٹوں کو پھاڑ کر پھینک دیتا ہوں۔

ریل کے ٹکٹ سے اسی طرح ڈاک کے ٹکٹ سے دوبارہ نفع اٹھانا جائز نہیں۔ کیونکہ جتنے کام کی یہ رسید تھی اتنا کام تو آپ نے ڈاک سے لے لیا۔ اب اگر دوسرا کام لینا ہو تو دوسرا ٹکٹ خریدنا پڑے گا، اس سے نفع لینا حرام ہوگا۔

بغیر ٹکٹ یا خلاف قانون سفر کرنا درست نہیں

ایک طالب علم نے مسئلہ پوچھا کہ میں فلاں جگہ سے سوار ہو کر فلاں جگہ اترا، حالانکہ ریل کا ٹکٹ میں نے صرف تھوڑی ہی دور (قریب والے اسٹیشن) تک کا لیا تھا، پھر چوری سے بیٹھے ہوئے دور تک چلا آیا۔ اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟

فرمایا فلاں جگہ سے فلاں جگہ تک کا جو کرایہ ہو اس میں سے جو تم دے چکے ہو اس کو گھٹا کر باقی ادا کر دو۔ (یعنی اتنی دور تک کا ٹکٹ لے کر پھاڑ کر پھینک دو)۔

ایک مرتبہ ایک طالب علم سفر کر رہے تھے میں بھی ریل میں سوار تھا ہم تو درمیانی درجہ میں تھے وہ تیسرے درجہ میں (یعنی تھرڈ کلاس میں) یہ شخص محبت سے ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئے اور ایک دو سٹیشن تک بیٹھے رہے اس کے بعد اتر کر اپنے درجہ میں جانے لگے، میں نے ان سے کہا کہ تم نے اتنی مسافت درمیانہ درجہ میں طے کی ہے اور تمہارے پاس ٹکٹ تیسرے درجہ کا ہے اتنی مقدار تمہارے ذمہ محصول کی دین ہے۔ تم اس کو ادا کر دینا۔ اور آسان ترکیب بتلا دی، کہ جس قدر محصول (کرایہ) درمیانہ درجہ کا تیسرے درجہ سے زائد ہو، اس کا ٹکٹ اسی لائن کا خرید کر چاک کر دینا (یعنی پھاڑ کر پھینک دینا) بس ادا ہو جائے گا۔ ورنہ گناہ ہوگا۔ اس گناہ کی تلافی یہی ہے کہ اس کا بدل ادا کر دے۔ کیونکہ یہ گناہ حقوق العباد سے متعلق ہے۔

حکومت کی طرف سے دی ہوئی سرکاری پنسل کو بھی اپنے کام میں لانا جائز نہیں

ایک صاحب نے عرض کیا کہ پنسل (وغیرہ) دفتر میں سرکاری ملازمین کو دی جاتی ہے اور ایک ماہ کے خرچ کے لئے ایک پنسل ملتی ہے اور اس میں سے کچھ بچ جاتی ہے اس کو اپنے

کام میں لانا درست ہے یا نہیں۔ بہت سے لوگ بچی ہوئی کو اپنے کام میں لیتے ہیں۔

فرمایا کہ جائز نہیں یہ تو سرکاری کام میں استعمال کے لئے دی جاتی ہے ان کو مالک تھوڑی بنایا جاتا ہے اور اس کا ایک آسان امتحان یہ ہے کہ جو بچ جائے اس کو پیش کر کے (یعنی واپس کر کے) دیکھ لو۔ اطلاع کرنے پر بھی یہ حکم نہ ہوگا کہ جو بچی ہوئی ہے وہ تمہاری ہے۔ اور اس کا ایک مہینہ کے لئے مقرر کرنا یہ صرف انتظامی چیز ہے۔ یہ نہیں کہ ان کو ایک مہینہ کا ٹھیکہ دے دیا ہے۔

کافر کا مال لینا، مسلمان کا مال لینے سے بھی زیادہ برا ہے

مولانا محمد قاسم صاحب نے اس کے متعلق ایک عجیب بات فرمائی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کا مال لینا مسلمان کے مال لینے سے بھی زیادہ برا ہے چنانچہ مولانا نے فرمایا کہ بھائی اگر کسی کا مال ہی رکھنا ہو تو مسلمان کا رکھ لے کافر کا نہ رکھے کیونکہ قیامت کے دن ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دی جائیں گی تو اگر کسی مسلمان پر ظلم کیا تو نماز، روزہ ظالم کا اس کے بھائی ہی کو ملے گا خیر اگر ظاہر میں ظلم کیا تو باطن میں قومی ہمدردی بھی تو کی، کہ اپنی نیکیاں اسے دے دیں۔ اور اگر کافر کا حق رکھا۔ تو ایک تو اپنی نیکیاں پرائے گھر گئیں پھر اس صورت میں نہ تمہارا بھلا، نہ اس کا بھلا۔ کیونکہ وہ تو پھر بھی جہنم میں ہی گیا۔ اگر کوئی کہے کہ پھر اسے نفع کیا ہوا جب نیکیاں اس کے کار آمد نہ ہوئیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ نفع تو ہوگا مگر اتنا کم ہوگا کہ اسے محسوس نہ ہوگا۔ جیسے اگر کسی کے پاس من بھر سونے کا ایک ڈھیر ہے اور اس میں کسی نے ایک رتی بھر سونا چرالیا تو واقع میں تو کمی ہوئی مگر محسوس نہ ہوئی لیکن کوئی عقلمند اس کی اجازت نہ دے گا کہ اتنا سا چرالیا کرو۔

بہر حال مولانا کی تقریر سے معلوم ہوا کہ کافر کا مال لینا مسلمان کے مال لینے سے بھی زیادہ برا ہے۔

ایک استدلال اور اس کا جواب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

لا یحل مال امری مسلم الا بطیب نفس منه

یہاں ایک شبہ نئے مجتہدوں کی طرف سے ہوسکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو

مسلم کی قید لگائی ہے اس لئے کافر کا مال جبراً (زبردستی) لینے میں کیا حرج ہے؟

حدیث میں تو مسلم کی قید ہے اس لئے مسلمان کا مال تو بغیر اس کی دلی مرضی کے حلال نہیں ہوگا۔ لیکن کافر کا تو ضرور حلال ہے۔ اور شاید پھر اس استدلال کے پیش نظر ریل میں بغیر ٹکٹ کے سفر کرتے ہوں کہ وہ مسلمان کی نہیں ہے غیر مسلم اس کے مالک ہیں، اور بعض لوگ اسے سرکاری سمجھ کر یہ تاویل کرتے ہیں کہ ہم گورنمنٹ سے اپنا حق وصول کرتے ہیں۔

(حالانکہ) یہ مسئلہ بھی خود اپنی جگہ پر قابل بحث ہے کہ غیر جنس سے حق وصول کرنا جائز ہے یا نہیں۔ مگر بہت سے لوگ اس جگہ مسلم کی قید دیکھ کر یوں سمجھے ہوں گے کہ کافروں کا مال لینے میں کچھ حرج نہیں خواہ اس پر ہمارا حق ہو یا نہ ہو۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو مسلمان کا مال جبراً لینے کو منع فرمایا ہے۔

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ قید اتفاقی ہے کیونکہ عادۃً مسلمانوں کو سابقہ مسلمانوں ہی سے (زیادہ تر) پڑتا ہے (اس لئے مسلمانوں کا مال ناحق لینے کا زیادہ امکان ہوتا ہے) ورنہ عام نصوص کی وجہ سے اس طرح کسی کا بھی مال لینا حلال نہیں۔ چنانچہ بعض احادیث میں آیا ہے۔

الرجل یقتطع مال الرجل

دوسرا جواب یہ ہے کہ۔ کافر، ذمی (جو اسلامی حکومت کی ماتحتی میں ہو) اور کافر مسالم (یعنی جن سے معاہدہ ہو) حقوق ظاہرہ اور معاملات میں شرعاً مثل مسلمان کے ہی۔

لهم مالنا وعليهم ماعلينا

(جو حکم ہمارے لئے وہ ان کے لئے بھی) البتہ حربی کافر کا مال مباح ہے، مگر وہاں بھی فریب مکر (یعنی دھوکہ جھوٹ وغیرہ) جائز نہیں۔

تیسرا جواب یہ کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی عادل امت سے یہ احتمال ہی نہ تھا کہ کوئی مسلمان کسی کافر کو نقصان پہنچائے گا۔ اگر کرے گا تو اپنے بھائی ہی کی گلوتراشی کرے گا...... اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو اس سے بھی روک دیا۔

غرض دلی مرضی کے بغیر کسی کا بھی مال حلال نہیں ہوتا (گو وہ کافر ہی کیوں نہ ہو)۔

دارالحرب اور سود

دارالحرب میں حربیوں سے سود لینے کا مطلب

ایں قدر ظاہر است کہ گرفتن سود از حربیاں بایں وجہ
حلال است کہ مال حربی مباح است اگر در ضمن آن نقض
عہد نباشد وحربی چوں خود بخود بد ہد بلاشبہ حلال خواہد بود

ترجمہ:۔ اتنی مقدار ظاہر ہے کہ حربیوں سے سود لینا اس وجہ سے حلال ہے کہ حربی کا مال مباح ہے اگر اس کے ضمن میں نقض عہد نہ ہو اور حربی جب خود بخود دے تو بلاشبہ حلال ہوگا۔

اور مسلمان کا کسی غیر مسلم کو سود دینا کسی کے نزدیک جائز نہیں۔

مسلک کی توضیح

ربو بین المسلمین والحربی (یعنی دارالحرب میں حربیوں سے سود لینے کا مسئلہ) مختلف فیہ ہے۔ امام صاحب اور امام محمدؒ چند قیود کے ساتھ جواز کی طرف گئے ہیں، اور ابو یوسفؒ اور ائمہ ثلاثہ عدم جواز کی طرف (یعنی ان کے نزدیک جائز نہیں)۔

قائلین جواز کی دلیل

جو لوگ (دارالحرب میں حربی سے سود لینے کو اور) بینک کے سود کو جائز کہتے ہیں وہ شرعی دلائل سے ربوٰ کی حرمت کے لئے مال محترم کی قید لگاتے ہیں اور ''مال محترم'' سے مراد وہ مال ہے جو غیر مباح ہو۔ اور مال محترم کی اس سے زیادہ آسان تعبیر یہ ہے کہ جس مال میں عقد صحیح کے بغیر تصرف جائز نہ ہو وہ مال محترم ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ آسان تعبیر یہ ہے کہ جس مال پر جہاد میں بھی قبضہ جائز نہ ہو وہ مال محترم ہے پس ایسا مال تو مومن یا ذمی کا ہے۔ باقی حربی کا مال عارضی عہد کی وجہ سے محترم ہو جاتا ہے ورنہ فی نفسہ محترم نہیں کیونکہ مال کے اندر احترام صاحب مال کے احترام کی وجہ سے آتا ہے اور کافر غیر ذمی محترم نہیں، لہٰذا اس کا مال بھی محترم نہیں۔ جب احترام نہیں تو اس

میں ربوٰ بھی نہیں یہ حاصل ہے ان قائلین جواز کے قول کا۔

جواز کے شرائط

جن حضرات کے نزدیک (دارالحرب میں حربیوں سے سود لینا) جائز ہے ان کے نزدیک بھی اس میں اتنی قیدیں ہیں۔

۱:۔وہ محل دارالحرب ہو۔

۲:۔ربوٰ کا معاملہ حربی سے ہو۔

۳:۔مسلم اصلی سے نہ ہو۔اور نہ ذمی سے ہو۔اور مسلم اصلی وہ ہے جو دارالحرب میں آنے کے قبل اسلام لایا ہو،خود یا اپنے آباؤ اجداد کی اتباع میں۔

۴:۔معاملہ کرنے والا وہ مسلم ہو جو دارالاسلام سے دارالحرب میں امن لے کر آیا ہو۔یا وہ مسلم ہو جو دارالحرب ہی میں اسلام لایا ہو،وہ مسلم اصلی نہ ہو جو خود دارالحرب میں رہتا ہو۔اس قید رابع (چوتھی قید) کی تصریح کہیں نظر سے نہیں گزری مگر اس قاعدہ کی تصریح ہے کہ روایات فقیہہ کے مفاہیم حجت ہیں۔اس بناء پر اوپر کی روایات سے یہ قید لازم ہے۔

اب جو مسلمان یہ معاملہ کرتے ہیں (یعنی غیر مسلموں سے سود لیتے ہیں) وہ یہاں ہی رہتے ہیں،کسی دارالاسلام سے یہاں نہیں آئے۔اس میں بینک سے معاملہ کرنے والے بھی داخل ہیں کہ یہ قید چہارم ان میں نہیں پائی جاتی تو اس بنا پر خود امام صاحب کے قول پر بھی یہ معاملہ جائز نہ ہوا۔

حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی رائے

(دارالحرب میں حربی سے سود لینا اور) بینک کے سود کا مسئلہ علماء کے درمیان مختلف فیہ ہے۔میری رائے اس میں یہ ہے کہ میں اس کو ناجائز سمجھتا ہوں۔

کسی نے کہا کہ شاہ عبدالعزیز صاحب غیر دارالاسلام میں عقد ربوٰ کو جائز لکھتے ہیں۔اور دلیل یہ ہے کہ

لاربوٰ بین المسلمین والحربیین (یعنی مسلم وحربی کے درمیان ربوٰ کا تحقق ہی نہیں ہوتا)

فرمایا کہ میری تحقیق یہ ہے کہ عقد جائز نہیں،ہمارے بعض اکابر جائز فرماتے تھے اس

کی وجہ سے مجھ پر اعتراض ہوا کہ آپ نے اپنے بڑوں کی مخالفت کی۔

میں نے جواب دیا کہ یہ مخالفت نہیں، خلاف تو جب ہوتا کہ وہ جائز کہتے، اور میں ناجائز کہتا۔ میں نے تو احتیاط کو لیا ہے۔ احتیاط تو اچھی چیز ہے۔

حضرت تھانویؒ اور دیگر علماء کی رائے کا فرق

جو لوگ دار الحرب میں حربی کے مال کو بلا غدر (یعنی دھوکہ عہد شکنی جھوٹ کے بغیر اس کی رضامندی سے خواہ عقود فاسدہ ہی کے ذریعہ (یعنی صورۃً سودی معاملہ کے ذریعہ) سے کیوں نہ ہو لینا جائز کہتے ہیں ان کے نزدیک حلال ہوگا۔

میری رائے اس میں یہ ہے کہ وہ مال تو حلال اور طیب ہوگا لیکن چونکہ اس نے عقد فاسد کرنے کا ارتکاب کیا ہے نص کے عموم کی وجہ سے اس کا گناہ ہوگا۔

وما فی الکتب الفقهیه من انه لاربوٰ بین المسلم والحربی فلا یستلزم اباحة المال اباحة العقد والله اعلم:۔

یعنی مال کی اباحت سے عقد کی اباحت لازم نہیں آتی۔

حضرت تھانویؒ کی رائے کی دلیل

فرمایا الہامی تحقیق کے طور پر ایک بات لکھ لو، وہ یہ کہ حدیث شریف میں جو آیا ہے کہ

"لاربوٰ بین المسلم والحربی فی دارالحرب"

اس سے ربوٰ کے جواز پر استدلال نہیں کر سکتے کیونکہ اس قسم کی ترکیب کے دو مطلب ہوا کرتے ہیں ایک تو یہ کہ **لا مضائقه فیه** (یعنی اس میں کوئی مضائقہ نہیں) دوسرے یہ کہ **لا یتحقق حقیقته ولا یترتب جمیع احکامه** (یعنی سود کی حقیقت نہیں پائی جاتی اور اس کے جملہ احکام مرتب نہیں ہوتے) مثلاً لاربوٰ کے یہ معنی ہوں گے کہ ان میں ربوٰ کی حقیقت ہی مرتب نہیں تو اس کا اثر زائد سے زائد یہ ہوگا کہ اس پر تمام احکام مرتب نہ ہوں گے۔ مثلاً یہ کہ اس (رقم) کا واپس کرنا واجب نہ ہوگا۔ اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ربوٰ کے دوسرے آثار بھی مرتب نہ ہوں مثلاً گنہگار ہونا کہ اس کا تحقق ربوٰ کی حقیقت نہ پائے جانے کے باوجود بھی ہوگا۔

اوراس کی دلیل یہ ہے کہ خود فقہاء نے بھی لا ربوٰ بین العبد و سیدہ (یعنی غلام اور اس کے آقا کے درمیان سود نہیں ہوتا) میں ربوٰ کی حقیقت کا نہ پایا جانا تسلیم کیا ہے لیکن صورۃً سودی معاملہ کے ارتکاب سے دونوں گنہگار رہوں گے۔

اس کی نظیر یہ ہے کہ لا صلوٰۃ الا بطھور (پاکی کے بغیر نماز نہیں ہوتی) اس میں نفی کے معنی یہی ہیں کہ بغیر وضو کے نماز کی حقیقت محقق نہ ہوگی۔ لیکن اس کے باوجود اس طرح (بلا وضو) نماز کی ہیئت (وصورۃ) بنانے سے اس پر گناہ ہوگا۔

اسی طرح لا نکاح بین المحارم (محارم مثلاً ماں بہن کے درمیان نکاح نہیں) اس میں بھی یہی مراد ہے۔ جس کا اثر یہ ہے کہ (نکاح کے بعد بھی) مہر اور نفقہ واجب نہ ہوگا۔ لیکن نفس اس فعل سے گناہ ضرور ہوگا۔

اسی طرح لا صوم یوم عید (عید کے دن روزہ نہیں) اس میں بھی یہی ہے (کہ روزہ نہیں ہوگا اور صورۃً روزہ رکھنے سے گناہ ہوگا)

اسی طرح لا رضاع بعد الفطام (یعنی دودھ چھڑانے کی مدت کے بعد رضاعت ثابت نہیں ہوتی) اس میں بھی یہی معنی ہیں۔ کہ رضاعت کی حقیقت کا تحقق نہ ہوگا چنانچہ حرمت رضاعت ثابت نہ ہوگی۔ لیکن مدت رضاعت کے بعد دودھ پلانے کا گناہ ضرور ہوگا۔

پس جب حدیث لا ربوٰ الخ اس معنی کو محتمل ہے اور خود احادیث میں اس کے مؤیدات ونظائر اس قدر موجود ہیں، تو اس حدیث سے ربوٰ کی حلت (یعنی جائز ہونے) پر استدلال کافی نہیں ہوگا۔

گنجائش کی صورت اور سودی رقم کا مصرف

ا:۔ مجبوری اور اشد ضرورت میں ان لوگوں کے قول پر عمل جو جواز ربوٰ فی دار الحرب کے قائل ہیں (یعنی حربی سے سود لینے کو جائز کہتے ہیں)

۲:۔ اگر غلطی سے روپیہ (بینک میں) جمع ہو چکا تو اخف المفسد تین (یعنی کم درجہ کا مفسدہ) یہ ہے کہ لے کر غرباء پر تقسیم کر دیا جائے۔

۳:۔ بعض علماء کے نزدیک اس کا لینا جائز ہے اگر اس قول پر عمل کر لیا جائے گنجائش ہے اور بہتر ہے کہ امداد مجروحین (یعنی ...... زخمی مفلس، بدحال بھائیوں کی مدد) میں دے دیا جائے، انشاء اللہ تعالیٰ گناہ نہ ہوگا۔

شرعی دلیل

وفی المقام تفریعان لطیفان یتعلقان بقصة موسیٰ علیه السلام مبینان علی کون ماقص الله ورسوله علینا من غیر نکیر حجة لنا:
احدهما اباحة مال الحربی برضاہ ولو بعقد فاسد فان استیجار الامر لارضاع الا بن عقد فاسدوھو مذھب الحنیفة. (بوادر النوادر ص ۱/۱۰۸)

ترجمہ:۔ دولطیف مسئلے جو موسیٰ علیہ السلام کے قصہ سے متعلق ہیں اور اس اصل پر مبنی ہیں کہ جس قصہ کو اللہ ورسول نے بغیر نکیر کے بیان فرمایا ہو وہ ہمارے لئے حجت ہے ان میں سے ایک مسئلہ جو حربی کے مال کی اباحت کا ہے۔ جب کہ اس کی رضامندی کے ساتھ ہو اگرچہ عقد فاسد کے واسطہ سے ہو۔ کیونکہ حقیقی بیٹے کو دودھ پلانے کی اجرت کا معاملہ (یعنی ماں اپنے بیٹے کو دودھ پلانے کی اجرت لے یہ معاملہ) فاسد ہے (ابوحنیفہ کا یہی مذہب ہے)۔

سوال وجواب

سوال:۔ سرکاری ملازمین جو قوانین شریعت کے خلاف فیصلہ کرتے ہیں ان کی تنخواہ حلال ہے یا مشتبہ؟

الجواب:۔ فی نفسہ تو مشتبہ ہے **(لکونه عوضاً عما یوافق وعمالا یوافقه)** لیکن اباحت مال غیر مسلم وغیر ذمی کی بنا پر (یعنی غیر مسلم وغیرہ ذمی کا مال مباح ہے) اس وجہ سے حنفیہ کے نزدیک طیب ہے۔

ایک وکیل صاحب نے دعوت کی...... حضرت نے فرمایا وکالت کی آمدنی میں خود فقہاء کو کلام ہے خواہ مقدمات سچے ہی آتے ہوں۔ اور جھوٹے مقدمات میں تو کسی کو اس کے ناجائز ہونے میں کلام نہیں مگر ہندوؤں سے آمدنی کا حصہ زیادہ آتا ہے۔ اور امام صاحب کے نزدیک کافر غیر ذمی سے اس کی رضامندی سے اس کا مال لینا درست ہے۔ اس لئے امام صاحب کے اس قول پر فتویٰ کی رو سے کھانا جائز ہے۔

حربیوں سے سود لینے کے متعلق
حضرت تھانویؒ کی سب سے آخری تحریر

تکلموا فی امثال هذا المعاملات هل یکون العقد موثماً والمال مباح ام یباحان جمیعاً فبعض العلماء ذهب الی الاول...... فی تعذیر الاخوان عن مولانا محمد یعقوب فی تاویل قول الامام بجواز الربافی۔ دارالحرب ان معناه لواخذ مسلم درهمین بدرهم من الحربی فی دارالحرب لم یتعرض له الامام کمالا یحده اذا زنی فی دارالحرب وحاصله الجواز قضاءً لا دیانةً فحل المال لا یقتضی حل العقد لان حلة لیس مستفادا من العقد بل من جهة اخری فیکون العقد موثماً واجاب خصمهم بان محمداً قد صرحوابجواز العقد فی غیر موضع من السیر الکبیر...... واکثر العلماء ذهب الی الثانی مستدلین بعبارات غیر فارقه بین العقد والمال۔ والله اعلم۔

(۲۵ ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ)

(ترجمہ):۔ فقہاء نے اس قسم کے مسائل میں بحث کی ہے کہ آیا عقد ربٰو (یعنی دارالحرب میں حربی سے سود لینے کے لئے کوئی عقد کرنا) گناہ ہے اور وہ مال مباح ہوگا۔ یا عقد اور مال دونوں ہی مباح ہوں گے۔ بعض علماء اول کے قائل ہیں (یعنی یہ کہ مال تو مباح لیکن عقد ناجائز ہوگا) اور تحذیر الاخوان میں مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے منقول ہے کہ امام صاحب کے اس قول کا مطلب "کہ دارالحرب میں سود جائز ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی حربی سے دارالحرب میں ایک درہم کے عوض دو درہم لے لے تو حاکم اس سے تعرض نہ کرے گا۔ جس طریقہ سے کہ دارالحرب میں اگر کوئی زنا کرلے تو امام اس پر حد زنا جاری نہ کرے گا۔

اس کا حاصل یہ نکلا کہ قضا تو جائز ہے دیانتاً جائز نہیں۔ مال کے حلال ہونے سے عقد کا حلال ہونا لازم نہیں آتا۔ کیونکہ مال کی حلت عقد کی وجہ سے نہیں بلکہ دوسری جہت سے

ہے۔ لہٰذا عقد تو موجب گناہ یعنی ناجائز ہوگا۔

دوسرے فریق (یعنی مال کے ساتھ عقد کے بھی قائلین جواز) نے اس کا جواب دیا کہ امام محمدؒ نے سیر کبیر میں متعدد مواقع میں عقد کے جواز کی بھی تصریح فرمائی ہے اور اکثر علماء فقہاء نے دوسرے مسلک کو اختیار کیا ہے (یعنی یہ کہ مال کے ساتھ عقد بھی جائز ہے) اور وہ استدلال کرتے ہیں ان فقہی عبارات سے جس میں عقد و مال کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا گیا۔ واللہ اعلم :۔ (بیاض اشرفی)

مشہور شخصیت سے مسلمان نہ کرانا چاہئے

تجربہ سے یہ معلوم ہوا کہ ایسے موقع پر غیر مشہور شخص مسلمان کرلے۔ مشہور شخص مسلمان نہ کرے۔ اس میں یہ مصلحت ہے کہ کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔

میری تو ہر حالت میں یہی رائے ہے کہ مشہور ہستیوں سے ایسے کام نہ لینے چاہئیں اس میں فتنے کا احتمال ہے۔ دشمنی بڑھے گی، سوتے ہوئے فتنہ کو جگانا ہے۔ اور غیر مشہور ہستیوں میں یہ فتنہ نہیں۔ کسی کو توجہ بھی نہیں ہوتی کہ کیا ہو رہا ہے۔ (الافاضات الیومیہ ص ۲/ ۳۱)

صیانۃ المسلمین

اسلامی تنظیم چلانے کا مفید دستور العمل

سوال :۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس بات میں کہ آج کل مسلمانان ہند حق جن پریشانیوں میں مبتلا ہیں اور آئندہ اس سے زیادہ مبتلا ہونے کا خطرہ ہے ان سے خود محفوظ رہنے اور دوسرے بھائیوں کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک جماعت نے ایک مجلس قائم کرنے کا ارادہ کیا ہے جس کی دفعات حسب ذیل ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ دفعات شریعت مطہرہ کے خلاف تو نہیں تاکہ ایسی دفعہ کو بدل کر شریعت کے موافق کرلیا جاوے۔ وہ دفعات یہ ہیں۔

۱:۔ احکام شرعیہ پر پورے اہتمام سے عمل کرنا اور جن اعمال پر قدرت نہ ہو ان میں معذوری ہے۔

۲:۔ دوسروں کو ان احکام کی اور ان کی پابندی کی تبلیغ کرنا۔

۳:۔ خصوص احکام ذیل جن کو خاص دخل ہے حفاظت مقصودہ میں وہ احکام یہ ہیں۔
اسلام پر قائم رہنا، علم دین سیکھنا اور سکھانا، قرآن مجید کا پڑھنا، پڑھانا اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت درجہ عشق میں رکھنا، تقدیر پر ایمان لانا اور خدا تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا، دعا مانگنا، نیک لوگوں کے پاس بیٹھنا، اور جو ان میں گزر گئے ہیں ان کے اچھے حالات کی کتابیں پڑھنا یا سننا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کا پڑھنا یا سننا، مسلمانوں کے حقوق کا خاص خیال رکھ کر ادا کرنا، اپنی جان کے حقوق ادا کرنا، اس میں یہ بھی داخل ہے کہ حکام کا مقابلہ نہ کریں بلکہ تہذیب سے اپنی تکلیف کی اطلاع کر دیں اگر حسب مرضی انتظام نہ ہو صبر کریں اور اگر کسی مخالف کی طرف سے کوئی شورش ہو تو حکام ہی کے ذریعہ سے اس کی مدافعت کریں پھر خواہ وہ خود انتظام کر دیں خواہ تم کو انتقام کی اجازت دے دیں نیز جان کے حقوق میں یہ بھی داخل ہے کہ ورزش کریں حدود قانون کے اندر فن سپہ گیری سیکھیں، نماز کی پابندی رکھنا، ضرورت کے مقام پر مسجد بنانا کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا، زکوٰۃ دینا، نیز دوسرے نیک کاموں میں خرچ کرنا، روزے رکھنا، حج کرنا، اور اگر وسعت یا ہمت ہو روضہ شریف کی زیارت بھی کرنا، قربانی کرنا اور اگر اس میں کوئی روک ٹوک کرے تو اس دستور العمل کو اختیار کریں جو ابھی اپنی جان کے حقوق میں مذکور ہوا آمدنی اور خرچ کا انتظام رکھنا، نکاح سے نسل بڑھانا، دنیا سے دل نہ لگانا، گناہوں سے بچنا، صبر و شکر کرنا، صبر میں یہ بھی داخل ہے کہ جہاں شریعت کا حکم ہو وہاں مالی یا جانی کیسی ہی تکلیف ہو اس کو برداشت کرنا، مشورے کے قابل امور میں مشورہ لینا، باہم محبت و ہمدردی و اتفاق رکھنا، امتیاز قومی یعنی اپنا لباس اپنی وضع اپنی بول چال اپنا برتاؤ وغیرہ وغیرہ مذہب والوں سے الگ رکھنا (ان اعمال کی تفصیل رسالہ حیوۃ المسلمین میں کی گئی ہے جو قابل ملاحظہ ہے)۔

۴:۔ طریق عمل احقر کے ذہن میں یہ ہے کہ جس جگہ جس جماعت کو گو وہ قلیل ہی ہو توفیق ہو ایک مجلس بنا کر ان احکام پر عمل کرنے اور کرانے کی کوشش شروع کر دیں۔

۵:۔ سہولت نظم کے لئے اس مجلس کا کوئی لقب بھی تجویز کر لیا جائے مثلاً صیانۃ المسلمین یا اور کچھ اور باقاعدہ اس کے کچھ عناصر بھی مقرر کر دیئے جاویں۔ جن کی خدمت کا

کوئی معاوضہ نہ ہوگا۔

۶:۔ یہ عناصر تین قسم کے ہوں گے۔ ایک ارکان، یہ وہ لوگ ہوں گے جن کا مشورہ مجلس کے کام کے لئے شرط ہوگا اور رکن کا چندہ گزار ہونا شرط نہیں دوسرے معین، یہ چندہ گزاروں کا لقب ہوگا۔ تیسرے عامل، یہ ان لوگوں کا لقب ہوگا جو نہ مشیر ہیں نہ چندہ گزار بلکہ محض بلا معاوضہ اپنی خدمات مجلس کے لئے وقف کرتے ہیں اور مجلس کی طرف سے جو خدمت ان کے سپرد کی جاوے وہ اس کو حسبۃ للہ بجالاتے ہیں۔ ان تینوں عناصر کا تعلق باضابطہ ہے۔ چوتھے محبین جو محض خیر خواہی و دعا میں مشغول ہیں اور کوئی مناسب رائے خیال میں آتی ہے اس کی اطلاع مجلس میں کرتے ہیں اس طبقہ کا تعلق باضابطہ نہیں۔

۷:۔ طبقہ ارکان میں سے ایک شخص کو اس مجلس کا صدر تجویز کیا جاوے جس کا انتخاب ارکان کے اتفاق سے ہوگا۔

۸:۔ ارکان کا عدد بہت زیادہ ہونا چاہئے بلکہ ہر مقام پر ایسا عدد ہو جن کا اجتماع مشورہ کے لئے سہل ہو خواہ وہ مقامی ہوں یا بیرونی ہوں مگر ضرورت کے وقت بسہولت جمع ہو سکتے ہوں۔ اور بقیہ تین طبقوں کی تعداد کی کوئی حد نہیں۔

۹:۔ جدید رکنیت کے لئے قدیم ارکان کی متفقہ منظوری شرط ہے جس میں وہ مختار ہیں اور بقیہ تین عناصر کی خدمات کا قبول کر لینا ارکان کے ذمہ لازم ہے۔ **الا لمانع شرع مفوض الی رایھم۔**

۱۰:۔ ایک شخص دو خدمتیں لے کر دو طبقوں میں بھی شمار کیا جاسکتا ہے۔

۱۱:۔ کوئی شخص خود رکنیت کی درخواست نہ کر سکے گا بلکہ ارکان سابق خود اس سے رکنیت کی درخواست کریں گے اور معین اور عامل خود درخواست کر سکتے ہیں ان کی درخواست پر ان کو ایک فارم دیا جائے گا جن میں ان کا اپنا نام و نشان اور وعدہ خدمت لکھنا ہوگا جس کا نقشہ ارکان تجویز کر سکتے ہیں اور یہ سب فارم مجلس میں محفوظ رہیں گے اور محبین خود بھی درخواست کر سکیں گے اور ان سے بھی درخواست کی جاسکتی ہے۔ مگر یہ سب زبانی ہوگی اور اگر کسی جانب سے بھی خالص درخواست نہ ہو تب بھی ہر مسلمان سے عام درخواست اس وقت کی جاتی ہے کہ نیک مشوروں سے دعا سے اس مجلس کی مدد فرماتے رہیں۔

۱۲:۔صدر اور رکن کا تقرر جیسے اتفاق ارکان سے ہوا تھا اسی طرح ان کا عزل بھی اتفاق ارکان سے ہوگا۔

۱۳:۔اور صدر اور رکن کا استعفاء کسی کی منظوری پر موقوف نہیں لیکن ان کا احسان ہوگا اگر دو ہفتہ قبل اطلاع دے دیں۔

۱۴:۔باستثناء وقتی کاموں کے کوئی کام بدوں مشورہ نہ کیا جاوے۔

۱۵:۔مشورہ کے لئے صدر اور تین مشیروں کا اجتماع کافی ہے۔اگر صدر کو کچھ عذر ہو وہ وقتی مشورہ کے لئے کسی رکن کو اپنا قائم مقام بنادے، اور اگر صدر سفر میں ہو خود ارکان کسی کو صدر کا قائم مقام بنالیں۔

۱۶:۔اگر اہل شوریٰ میں اختلاف ہوجاوے تو جس جانب صدر کی رائے ہو قطع نظر اقلیت یا اکثریت سے اس کو ترجیح ہوگی اور اگر اہل شوریٰ اور صدر میں اختلاف ہوجاوے تو احتیاط کے پہلو کو ترجیح دی جائے گی۔یعنی اگر امر متنازع فیہ ایک رائے میں نافع محض غیر محتمل الضرر ہو اور دوسری رائے میں نہ نافع ہو نہ مضر، تو نافع والی رائے کو ترجیح ہوگی اور اس کام کو کرلیا جاوے گا اور اگر ایک رائے میں مضر ہو اور دوسری رائے میں نافع مگر غیر ضروری تو مضر والی کو ترجیح ہوگی اور اس کام کو ترک کردیا جائے گا اور اگر ایک رائے میں مضر ہو، اور دوسری رائے میں نافع اور ضروری اور صرف یہ اختلاف اہم واشد ہے تو صدر کی رائے کو ترجیح ہوگی۔

۱۷:۔کوئی کام خلاف شرع نہ کیا جائے گا نہ کوئی رائے خلاف شرع قبول کی جائے گی اگر جواز وعدم جواز میں تردد ہو علماء سے استفتاء کیا جائے گا اگر انتخاب مفتی میں اختلاف ہوجائے یا علماء کے فتاوے میں اختلاف ہوجاوے تو صدر کے تجویز شدہ مفتی کا فتویٰ معمول بہ ہوگا لیکن جس رکن کو اس میں شرح صدر نہ ہو وہ عمل پر مجبور نہ کیا جائے گا اس کو سکوت اور اس کام میں شریک نہ ہونے کی اجازت دی جائے گی مگر مناقشہ کی اجازت نہ ہوگی اسی طرح کوئی کام خلاف قانون بھی نہ کیا جائے گا۔

۱۸:۔اس مجلس میں شریک ہونے کے لئے کسی پر اصرار نہ کیا جاوے بہتر تو یہ ہے کہ ترغیب بھی نہ دی جائے لیکن اگر کسی مقام پر اس میں مصلحت ہو تو ترغیب میں مخاطب کی طیب

خاطر وانشراح قلب سے تجاوز نہ کیا جاوے صرف مجلس کے اغراض ومقاصد کی خصوصی یا عمومی اطلاع دی جاوے جو شخص خود یا جائز ترغیب سے شرکت کرے اس کو شریک کرلیا جاوے۔

۱۹:۔ اس مجلس کی طرف سے کچھ مخلص و اہل مبلغ بھی مقرر کئے جائیں کہ وہ احکام شرعیہ کی عموماً اور احکام مذکورہ نمبر۳ کی خصوصاً اشاعت کریں اور یہ تبلیغ بہ خطاب عام ہوگی اور اس تبلیغ میں غیر مسلموں کو اسلام قبول کرنے کی بھی ترغیب دیا کریں اور مناظرہ وغیرہ کسی سے نہ کریں اگر کوئی خود درخواست کرے اس کو مناظرین کا پتہ بتلادیں۔

۲۰:۔ اس مجلس کی طرف سے کچھ فہیم وسلیم رضا کار بھی مقرر کئے جائیں کہ ان کا کام تبلیغ خطاب خاص ہوگا۔ مثلاً نمازوں کے وقت مشغولین غافلین کو نرمی اور محبت سے نماز کا یاد دلانا۔ کوئی شخص خلاف شرع کام کرتا ہو یا اس کا ارادہ کرتا ہوا دیکھا جاوے جیسے بدکاری یا شراب خوری یا قمار بازی اس کو نرمی سے شرعی وعیدیں یاد دلا کر سمجھا دینا لیکن اگر اس سے کوئی نہ مانے تو پھر اس پر مسلط ہو جانا یا کسی طرح سے زور دینا خواہ سختی سے خواہ ہاتھ جوڑ کر یا راستہ میں لیٹ کر یہ مناسب نہیں بلکہ جب ناصح کی باضابطہ حکومت نہ ہو ایسا کرنا اکثر مضر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سے اگر یہ رضا کار کسی پر ظلم ہوتا ہوا دیکھیں مثلاً کوئی شخص ایک مباح معاملہ کر رہا ہے۔ جیسے کپڑا خریدنا یا بیچنا اور دوسرا اس کو معاملہ نہ کرنے پر مجبور کر رہا ہے تو یہ رضا کار اس مظلوم کی مدد کریں لیکن صرف مدافعت کی حد تک رہیں ظالم سے انتقام نہ لینے لگیں اسی طرح راستہ میں کسی حاجت مند کا بوجھ اٹھوا دینا، کسی کو سوار ہونے میں مدد دے دینا کسی پیاسے کو پانی پلا دینا، کسی انجان کو راستہ بتلا دینا، دو شخص لڑتے ہوں ان میں صلح کرا دینا۔ یہ سب رضا کاروں کی خدمات ہیں اور اس مظلوم یا حاجت مند میں یہ نہ دیکھا جائے کہ یہ اپنے مذہب کا ہے یا دوسرے مذہب کا سب کی مدد کرنا چاہئے۔ رضا کاری کے یہ شرائط ہیں۔ اسلام عقل بلوغ ذکورت، طالب علمی میں مشغول نہ ہونا خواہ علم معاش ہو، خواہ علم معاد ہو کسی کا ماتحت یا ملازم نہ ہونا۔

۲۱:۔ ان مبلغین اور رضا کاروں کی کوئی امتیازی علامت بھی ہو تو قرین مصلحت ہے۔

۲۲:۔ یہ مبلغین اور رضا کار سب صدر مجلس کے ماتحت ہوں گے کوئی کام بدوں اس کی اجازت کے نہ کرسکیں گے۔

۲۳:۔ یہ رضا کار روزانہ اور مبلغین ماہانہ صدر کے پاس یا صدر جس کو اپنی نیابت میں اس کام کے لئے منتخب کر دے اس کے پاس جمع ہو کر اپنی کارگزاری کی اطلاع دیا کریں اور آئندہ کے لئے مناسب احکام حاصل کیا کریں اور مجلس کا جلسہ کم از کم ماہانہ ہوا کرے جس میں ضروری مشورے طے ہوا کریں۔

۲۴:۔ ان مبلغین و رضا کاروں کی مالی خدمت کے لئے کچھ چندہ کا انتظام بھی کیا جاوے مگر اس میں شرعی حدود کا اہتمام واجب ہے اگر چندہ کم ہو کام مختصر پیمانے پر کیا جاوے اور جن رضا کاروں کو دلچسپی ہو ان کو ورزش وغیرہ بھی سکھائی جاوے۔

۲۵:۔ اگر مجلس میں ایسے حضرات شریک ہو جائیں جو مسلمانوں کو دکان کھلوانے کا انتظام کر سکیں تو مجلس اس خدمت کو بھی اپنے فرائض میں داخل کرے۔

۲۶:۔ اور اگر مجلس میں ایسے حضرات شریک ہو جائیں جو مسلمانوں کی تکالیف کا چارہ کار یا ان کے حقوق آئین اور تہذیب کے حدود میں رہ کر گورنمنٹ سے طلب کر سکیں تو مجلس اس خدمت کو بھی اپنے فرائض میں داخل کر لے۔

۲۷:۔ وقتاً فوقتاً مجلس کی کارگزاری مع حساب چندہ شائع ہونا چاہئے۔

۲۸:۔ اس کارگزاری کی عام روئداد بھی اور اس کی جزئیات وقتیہ خاص طور پر زبانی بھی حکام رس حضرت کے توسط سے حکام کو پیش کرتے رہیں تا کہ کسی مخالف کو بدگمانی پیدا کرنے کی گنجائش نہ ہو۔

۲۹:۔ اس مجلس کا مرکزی مقام دہلی ہوگا اور دوسرے مقامات پر اہل مقام کو اختیار ہے خواہ مستقل طور پر اپنے یہاں ایسی مجالس قائم کریں خواہ اس مرکزی مجلس کی شاخیں بنا دیں اور شاخ بنانے کی صورت میں مرکز اور شاخوں کے باہمی تعلقات و حقوق و شرائط کے متعلق زبانی مشورہ کر لیا جاوے۔

۳۰:۔ شعبہ تبلیغ کے تحت میں مفید رسالے بھی حسب ضرورت و حسب وسعت وقتاً فوقتاً خرید کر مجلس میں محفوظ رہیں گے اور ایک خاص وقت میں عام...... مسلمانوں کو وہاں آ کر مطالعہ کی اجازت ہوگی اور اگر وسعت ہو تو ایسے رسائل چھپوا کر یا خرید کر عام مسلمانوں میں شائع بھی ہو جایا

کریں گے مگر مجلس کے سرمایہ سے کوئی اخبار نہ خریدا جاوے گا۔ اگر کوئی مالک اخبار بلا معاوضہ بھیج دیا کرے یا ارکان یا غیر ارکان بطور خود خرید کر خواہ مجلس میں داخل کردیں خواہ بطور خود مطالعہ کر کے استحضار واقعات سے مشورہ میں کام لیں اس کی اجازت ہے مگر ہر حالت میں یہ وصیت کی جاتی ہے کہ محض اخبار میں کسی واقعہ کے درج ہونے سے بدوں اذن شرعی کوئی اثر نہ لیں۔

۳۱:۔ چونکہ مذکورہ بالا کارگزاریوں کے لئے ضبط کی بھی ضرورت ہوگی اس لئے مجلس میں ایک فہیم مستعد محرر کا مقرر کرنا بھی ضروری ہے جس کی خدمت کی نگرانی صدر کے یا جس کو صدر تجویز کردیں اس کے ذمہ ہوگی۔ اسی طرح دفتر کے لئے ایک مکان کی بھی ضرورت ہوگی اور یہی مکان انعقاد مجلس کے بھی کام آوے گا۔

نوٹ:۔ یہ مجلس خالص مذہبی ہے۔ سیاسیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں نہ کسی کو مدافعت میں نہ مخالفت میں اور محکومین کا حکام سے اپنا جائز حق حدود قانون میں مانگنا سیاست نہیں جیسا جائز ملازمت کی درخواست کو کوئی شخص سیاست نہیں کہہ سکتا۔

الجواب:۔ یہ سب دفعات بالکل شریعت کے ایسے موافق ہیں کہ دلائل کی بھی حاجت نہیں لیکن چونکہ اس مجموعہ کی ضرورت اجتہادی ہے اس لئے اگر باوجود اعتقاد ان کے استحسان کے ان کو عمل میں لانے سے کسی کو دلچسپی نہ ہو اور وہ اپنے لئے ذوقاً یکسوئی کو اسلم سمجھے اور اس مسلک کو پسند کرے جس کو احقر نے رسالہ ''معاملة المسلمین'' کے نوٹ نمبر ۲ میں اپنے لئے طریق عمل تجویز کیا ہے اس پر اس مجلس کی شرکت کے لئے اصرار نہ کیا جاوے۔ چنانچہ خود مجلس مسئول عنہ کی دفعہ نمبر ۱۸ میں بھی اس کی تصریح کی ہے۔ اب اس جواب کو اس دعا پر ختم کرتا ہوں۔ کتبہ اشرف علی

انتخابات میں ووٹ کی شرعی حیثیت

از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

انتخابات میں ووٹر اور امیدوار کی شرعی حیثیت

اسلام کا ایک یہ بھی معجزہ ہے کہ مسلمانوں کی پوری جماعت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوتی۔ ہر زمانہ اور ہر جگہ کچھ لوگ حق پر سختی سے قائم رہتے ہیں جن کو اپنے ہر کام میں حلال وحرام کی فکر اور خدا اور رسول کی رضا جوئی پیش نظر رہتی ہے پھر قرآن کریم کا ارشاد ہے۔ آپ نصیحت کی بات کہتے رہیں کیونکہ نصیحت مسلمانوں کو نفع دیتی ہے۔'' اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ انتخابات میں امیدواری اور ووٹ کی شرعی حیثیت اور ان کی اہمیت کو قرآن اور سنت کی رو سے واضح کردیا جائے۔ شاید کچھ بندگان خدا کو تنبیہ ہو اور کسی وقت یہ غلط کھیل صحیح بن جائے۔

امیدواری

کسی مجلس کی ممبری کے انتخابات کے لئے جو امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہو وہ گویا پوری ملت کے سامنے دو چیزوں کا مدعی ہے ایک یہ کہ وہ اس کام کی قابلیت رکھتا ہے جس کا امیدوار ہے دوسرے یہ کہ وہ دیانت داری سے اس کام کو انجام دے گا اب اگر واقع میں وہ اپنے اس دعویٰ میں سچا ہے، یعنی قابلیت رکھتا ہے اور امانت و دیانت کے ساتھ قوم کی خدمت کے جذبے سے اس میدان میں آیا تو اس کا یہ عمل کسی حد تک درست ہے اور بہتر طریق اس کا یہ ہے کہ کوئی شخص خود مدعی بن کر کھڑا نہ ہو بلکہ مسلمانوں کی کوئی جماعت اس کو اس کام کا اہل سمجھ کر نامزد کردے اور جس شخص میں اس کام کی صلاحیت ہی نہیں وہ اگر امیدوار ہو کر کھڑا ہو تو قوم کا غدار اور خائن ہے۔ اس کا ممبری میں کامیاب ہونا ملک وملت کے لئے خرابی کا سبب تو بعد میں بنے گا، پہلے تو وہ خود غدار اور خیانت کا مجرم ہو کر عذاب جہنم کا مستحق بن جائے گا۔ اب ہر وہ شخص جو کسی مجلس کی ممبری کے لئے کھڑا ہوتا ہے اگر اس کو کچھ آخرت کی بھی فکر ہے تو اس میدان میں آنے سے پہلے خود اپنا جائزہ لے لے اور یہ سب سمجھ لے کہ

اس ممبری سے پہلے تو اس کی ذمہ داری صرف اپنی ذات اور اپنے اہل وعیال تک محدود تھی کیونکہ بنص حدیث ہر شخص اپنے اہل وعیال کا بھی ذمہ دار ہے اور اب کسی مجلس کی ممبری کے بعد جتنی خلق خدا کا تعلق اس مجلس سے وابستہ ہے ان سب کی ذمہ داری کا بوجھ اس کی گردن پر آتا ہے اور وہ دنیا و آخرت میں اس ذمہ داری کا مسئول اور جواب دہ ہے۔

ووٹ اور ووٹر

کسی امیدوار ممبری کو ووٹ دینے کی آزروئے قرآن و حدیث چند حیثیتیں ہیں ایک حیثیت شہادت کی ہے کہ ووٹر جس شخص کو اپنا ووٹ دے رہا ہے اس کے متعلق اس کی شہادت دے رہا ہے کہ یہ شخص اس کام کی قابلیت بھی رکھتا ہے اور دیانت اور امانت بھی اور اگر واقع میں اس شخص کے اندر یہ صفات نہیں ہیں اور ووٹر یہ جانتے ہوئے اس کو ووٹ دیتا ہے تو وہ ایک جھوٹی شہادت ہے۔ جو سخت کبیرہ گناہ اور وبال دنیا و آخرت ہے صحیح بخاری کی حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت کاذبہ کو شرک کے ساتھ کبائر میں شمار فرمایا ہے۔ (مشکوٰۃ) اور ایک دوسری حدیث میں جھوٹی شہادت کو اکبر کبائر فرمایا ہے۔ (بخاری ومسلم) جس حلقے میں چند امیدوار کھڑے ہوں اور ووٹر کو یہ معلوم ہے کہ قابلیت اور دیانت کے اعتبار سے فلاں آدمی قابل ترجیح ہے تو اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو ووٹ دینا اس اکبر کبائر میں اپنے آپ کو مبتلا کرنا ہے۔

''اب ووٹ دینے والا اپنی آخرت اور انجام کو دیکھ کر ووٹ دے محض رسمی مروت یا کسی طمع وخوف کی وجہ سے اپنے آپ کو اس وبال میں مبتلا نہ کرے، دوسری حیثیت ووٹ کی شفاعت یعنی سفارش کی ہے کہ ووٹر اس کی نمائندگی کی سفارش کرتا ہے اس سفارش کے بارے میں قرآن کریم کا یہ ارشاد ہر ووٹر کو اپنے سامنے رکھنا چاہئے'' جو شخص اچھی سفارش کرتا ہے اس میں اس کو بھی حصہ ملتا ہے اور بری سفارش کرتا ہے۔ تو اس کی برائی میں اس کا بھی حصہ لگتا ہے'' اچھی سفارش یہی ہے کہ قابل اور دیانت دار آدمی کی سفارش کرے جو خلق خدا کے حقوق صحیح طور پر ادا کرے۔ اور بری سفارش یہ ہے کہ نااہل، نالائق، فاسق، ظالم کی سفارش کر کے اس کو خلق خدا پر مسلط کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے ووٹوں سے کامیاب ہونے والا امیدوار اپنے پنج سالہ دور میں جو نیک یا بد عمل کرے گا ہم اس کے شریک سمجھے جائیں گے۔

ووٹر کی ایک تیسری حیثیت وکالت کی ہے کہ ووٹ دینے والا اس امیدوار کو اپنا نمائندہ اور

وکیل بناتا ہے لیکن اگر یہ وکالت اس کے کسی شخصی حق کے متعلق ہوتی اور اس کا نفع نقصان صرف اس کی ذات کو پہنچتا اور اس کا یہ خود ذمہ دار ہوتا مگر یہاں ایسا نہیں کیونکہ یہ وکالت ایسے حقوق کے متعلق ہے جن میں اس کے ساتھ پوری قوم شریک ہے۔ اس لئے اگر کسی نا اہل کو اپنی نمائندگی کے لئے ووٹ دے کر کامیاب بنایا تو پوری قوم کے حق کو پامال کرنے کا گناہ بھی اس کی گردن پر رہا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارا ووٹ تین حیثیتیں رکھتا ہے۔ ایک شہادت دوسرے سفارش تیسرے حقوق مشترکہ میں وکالت، تینوں حیثیتوں میں جس طرح نیک، صالح، قابل آدمی کو ووٹ دینا موجب ثواب عظیم ہے اور اس کے ثمرات اس کو ملنے والے ہیں۔ اسی طرح نا اہل یا غیر متدین شخص کو ووٹ دینا جھوٹی شہادت بھی ہے اور بری سفارش بھی اور ناجائز وکالت بھی اور اس کے تباہ کن ثمرات بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھے جائیں گے۔

ضروری تنبیہ: مذکورالصدر بیان میں جس طرح قرآن وسنت کی رو سے یہ واضح ہوا کہ نا اہل، ظالم، فاسق اور غلط آدمی کو ووٹ دینا گناہ عظیم ہے اسی طرح ایک اچھے، نیک اور قابل آدمی کو ووٹ دینا ثواب عظیم ہے بلکہ ایک فریضہ شرعی ہے۔ قرآن کریم نے جیسے جھوٹی شہادت کو حرام قرار دیا ہے اسی طرح سچی شہادت کو واجب ولازم بھی فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

كُوْنُوْا قَوّٰامِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ

اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا کہ

كُوْنُوْا قَوّٰامِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ

ان دونوں آیتوں میں مسلمانوں پر فرض کیا ہے کہ سچی شہادت سے جان نہ چرائیں، اللہ کے لئے ادائیگی شہادت کے واسطے کھڑے ہو جائیں تیسری جگہ سورۃ طلاق میں ارشاد ہے۔

ترجمہ:۔ ”اللہ کے لئے سچی شہادت کو قائم کرو۔“

ایک آیت میں یہ ارشاد فرمایا کہ

ترجمہ:۔ ”سچی شہادت کا چھپانا حرام اور گناہ ہے۔

ارشاد ہے۔

ترجمہ:۔ ”شہادت کو نہ چھپاؤ اور جو چھپائے گا اس کا دل گناہ گار ہے۔“

ان تمام آیات نے مسلمانوں پر یہ فریضہ عائد کر دیا ہے کہ سچی گواہی سے جان نہ

چرائیں۔ضرور ادا کریں۔آج جو خرابیاں انتخابات میں پیش آرہی ہیں ان کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ نیک صالح حضرات عموماً ووٹ دینے ہی سے گریز کرنے لگے جس کا لازمی نتیجہ وہ ہوا جو مشاہدہ میں آرہا ہے کہ ووٹ عموماً ان لوگوں کے آتے ہیں جو چند ٹکوں میں خرید لئے جاتے ہیں اور ان لوگوں کے ووٹوں سے جو نمائندے پوری قوم پر مسلط ہوتے ہیں وہ ظاہر ہے کہ کس قماش اور کس کردار کے لوگ ہوں گے اس لئے جس حلقہ میں کوئی بھی امیدوار قابل اور نیک معلوم ہو اسے ووٹ دینے سے گریز کرنا بھی شرعی حرام اور پوری قوم وملت پر ظلم کا مترادف ہے اور اگر کسی حلقہ میں کوئی بھی امیدوار صحیح معنی میں قابل اور دیانت دار نہ ہو مگر ان میں کوئی ایک صلاحیت کار اور خداترسی کے اصول پر دوسروں کی نسبت سے غنیمت ہو تو تقلیل شر اور تقلیل ظلم کی نیت سے اس کو بھی ووٹ دے دینا جائز بلکہ مستحسن ہے جیسا کہ نجاست کے پورے ازالہ پر قدرت نہ ہونے کی صورت میں تقلیل نجاست کو اور پورے ظلم کو دفع نہ کرنے کا اختیار نہ ہونے کی صورت میں تقلیل ظلم کو فقہاء رحمہم اللہ نے تجویز فرمایا ہے۔

مختصر یہ کہ انتخابات میں ووٹ کی شرعی حیثیت کم از کم ایک شہادت کی ہے جس کا چھپانا بھی حرام ہے اور اس میں جھوٹ بولنا بھی حرام اس پر کوئی معاوضہ لینا بھی حرام، اس میں محض ایک سیاسی ہار جیت اور دنیا کا کھیل سمجھنا بڑی بھاری غلطی ہے آپ جس امیدوار کو ووٹ دیتے ہیں شرعاً آپ اس کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ شخص اپنے نظریئے اور علم و عمل اور دیانتداری کی رو سے اس کام کا اہل اور دوسرے امیدواروں سے بہتر ہے جس کام کے لئے یہ انتخابات ہورہے ہیں اس حقیقت کو سامنے رکھیں تو اس سے مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

ا:۔آپ کے ووٹ اور شہادت کے ذریعے جو نمائندہ کسی اسمبلی میں پہنچے گا وہ اس سلسلہ میں جتنے اچھے یا برے اقدامات کرے گا ان کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوگی۔آپ بھی اس کے ثواب یا عذاب میں برابر کے شریک ہوں گے۔

۲:۔اس معاملہ میں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ شخصی معاملات میں کوئی غلطی بھی ہو جائے تو اس کا اثر بھی شخصی اور محدود ہوتا ہے ثواب بھی عذاب بھی محدود۔قومی اور ملکی معاملات سے پوری قوم متاثر ہوتی ہے اس کا ادنیٰ نقصان بھی بعض اوقات پوری قوم کی تباہی کا سبب بن جاتا ہے اس لئے اس کا ثواب و عذاب بھی بہت بڑا ہے۔

۳:۔ سچی شہادت کا چھپانا از روئے قرآن حرام ہے۔ اس

لئے آپ کے حلقہ انتخاب میں اگر کوئی صحیح نظریہ کا حامل اور دیانتدار نمائندہ کھڑا ہے تو اس کو ووٹ دینے میں کوتاہی کرنا گناہ کبیرہ ہے۔

۴:۔ جو امیدوار نظریہ اسلامی کے خلاف کوئی نظریہ رکھتا ہے اس کو ووٹ دینا ایک جھوٹی شہادت ہے جو گناہ کبیرہ ہے۔

۵:۔ ووٹ کو پیسوں کے معاوضے میں دینا بدترین قسم کی رشوت ہے اور چند ٹکوں کی خاطر اسلام اور ملک سے بغاوت ہے۔ دوسروں کی دنیا سنوارنے کے لئے اپنا دین قربان کر دینا کتنے ہی مال و دولت کے بدلے میں ہو کوئی دانشمندی نہیں ہو سکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ شخص سب سے زیادہ خسارے میں ہے جو دوسرے کی دنیا کے لئے اپنا دین کھو بیٹھے۔

وما علینا الا البلاغ المبین

عورت کی سر براہی

از حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی مدظلہ العالی

عورت کی سر براہی کے متعلق
حضرت مولانا یوسف لدھیانوی صاحب کی خدمت میں
ایک سوال اور حضرت کا جامع جواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفی

مکرم و محترم جناب حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی صاحب مدظلہ العالی۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

ناچیز نے آپ کے رسالہ عورت کی سر براہی پڑھا تھا جس سے اس موضوع سے متعلق خلجان دور ہو گیا تھا لیکن آج کے جنگ اخبار مورخہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۹۳ء میں مولانا کوثر نیازی صاحب نے اس موضوع پر ایک مضمون لکھا ہے جس کو پڑھ کر پھر کچھ پریشانی لاحق ہے، مولانا کوثر نیازی نے جو مثالیں عورتوں کی سر براہی کی رضیہ سلطانہ، چاند بی بی اور شجرۃ الدر کی دی ہیں وہ بے چاری عورتیں بہت ناکام اور مختصر عرصے کے لئے سر براہ رہیں۔ ان کی رقابتیں اور اخلاقی کمزوریاں، تاریخ دانوں کے لئے بہت اندوہ گیں ہیں۔ شیکسپیئر کا قول ان پر صادق آتا ہے "Frailty! Thy name is Woman" ''کمزوری! تیرا نام عورت ہے۔'' تینوں بری طرح قتل ہوئیں۔ مولانا کوثر نیازی کی زیادہ تر مثالیں اہل کفر کی ملکاؤں کی ہیں جن کی مسلمان معاشرہ پر تطبیق درست نہیں۔

اہل علم حضرات تو چاہے ان کا تعلق علم دین سے ہو چاہے ان کا مطالعہ و مشاہدہ سینکڑوں ممالک کی ہزاروں سال کی تاریخ پر محیط ہو، مولانا کوثر نیازی کی مثالوں کو چندان

گنی چنی دوراز کار مستثنیات کا درجہ دیں گے۔ لیکن ہمارے مسلمان موصوف کی شرح تفسیر و حدیث سے ضرور شبہات کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اس لئے آں جناب کا عوام الناس پر بڑا احسان ہوگا کہ اگر آپ مولانا کوثر نیازی صاحب کے فقہی ارشادات کی تصحیح فرماویں۔

جزاکم اللہ احسن الجزاء ڈاکٹر شہیر الدین کراچی۔

جواب:۔ اس مضمون کا مختصر جواب روزنامہ جنگ کراچی ۶ نومبر ۱۹۹۳ء میں لکھ چکا ہوں۔ مفصل جواب حسب ذیل ہے۔

اس مسئلہ کے اہم ترین پہلو یہ ناکارہ اپنے رسالہ ''عورت کی سربراہی'' میں لکھ چکا ہے۔ اس کا مطالعہ غور و تدبر کے ساتھ ایک بار پھر کر لیجئے۔ انشاء اللہ شکوک و شبہات کا بھوت کبھی قریب نہیں پھٹکے گا اور ہمیشہ کے لئے اس ''آسیب'' سے نجات مل جائے گی۔ تاہم آں جناب کے خط کے حوالے سے مولانا کوثر نیازی کے مضمون پر گفتگو کرنے سے پہلے چند امور کا بطور اصول موضوعہ ذہن نشین رکھنا ضروری ہے۔

پہلا اصول:۔ جوں جوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے بُعد ہو رہا ہے اور قرب قیامت کا دور قریب آرہا ہے اسی رفتار سے فتنوں کی بارش تیز سے تیز تر ہو رہی ہے، ان فتنوں کے طوفان بلا خیز میں سفینہ نجات بس ایک ہی چیز ہے، اور وہ یہ کہ سلف صالحین کی تشریحات کے مطابق کتاب و سنت کا دامن مضبوطی سے تھام لیا جائے اور اس بارے میں ایسی اولوالعزمی اور ایمان کی پختگی کا مظاہرہ کیا جائے کہ فتنوں کی ہزاروں آندھیاں بھی ہمارے ایمان و یقین کو متزلزل نہ کر سکیں، اور کتاب و سنت اور سلف صالحین کا دامن ہمارے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ ''**علیکم بدین العجائز**.''

دوسرا اصول:۔ تمام فقہائے امت جو کتاب و سنت کے فہم میں حجت اور سند کا درجہ رکھتے ہیں اس پر متفق ہیں کہ کسی خاتون خانہ کو سربراہ مملکت بنانا حرام ہے، کیونکہ شرعاً وہ جس طرح نماز کی امامت کی صلاحیت نہیں رکھتی، جس کو امامت صغریٰ (چھوٹی امامت) کہا جاتا ہے، اسی طرح وہ امامت کبریٰ یعنی ملک کی سربراہی کی صلاحیت بھی نہیں رکھتی، اگر کوئی مرد عورت کی اقتداء میں نماز ادا کرے تو اس کی نماز نہیں ہوگی۔ اسی طرح اگر عورت کو حاکم اعلیٰ بنا دیا جائے تو

شرعاً اس کی حکومت لائق تسلیم نہیں ہوگی۔ اس سلسلہ میں اس ناکارہ نے اپنے رسالہ ''عورت کی سربراہی'' میں اکابر امت کے جو حوالے نقل کیے ہیں ان کو ایک بار پھر ملاحظہ فرمالیجئے۔

تیسرا اصول:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان واجب الاذعان برحق ہے کہ ''وہ قوم ہرگز فلاح کو نہیں پہنچے گی جس نے زمام حکومت عورت کے سپرد کردی'' اس حدیث شریف کو تمام فقہائے امت اور اکابر ملت نے قبول کیا ہے، امامت وقضا کے مسائل میں اس سے استناد کیا ہے اور اسی پر اپنے اجماع واتفاق کی بنیاد رکھی ہے۔ اور اصول یہ ہے کہ جس حدیث کو تمام فقہائے امت نے قبول کرلیا ہو اور جس پر اجماع امت کی مہر ثبت ہو وہ حجت قاطعہ بن جاتی ہے اور ایسی حدیث کو ''حدیث متواتر'' کا درجہ حاصل ہوجاتا ہے امام ابوبکر جصاص رازی احکام القرآن (ص ۳۸٦ جلد اول) میں لکھتے ہیں۔

''جس خبر واحد کو تمام لوگوں نے قبول کرلیا وہ ہمارے نزدیک متواتر کے حکم میں ہے جس کی وجہ ہم کئی جگہ بیان کرچکے ہیں۔

پس ایسی حدیث جو سب کے نزدیک مسلم الثبوت ہو اس کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی اور نہ امت کے مسلم الثبوت مفہوم کو بدلنے کی۔

چوتھا اصول:۔ دینی مسائل میں اجماع امت مستقل حجت شرعیہ ہے خواہ سند اجماع (یعنی قرآن وحدیث سے اس اجماعی مسئلہ کا ثبوت) ہمیں معلوم نہ ہو کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی، پس اجماعی مسائل ''سبیل المومنین'' ہیں اور مسلمانوں کا راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ اپنانے کی کسی کے لئے گنجائش نہیں۔ حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے ''اور جو شخص رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرے گا بعد اس کے کہ اس کو امر حق ظاہر ہوچکا تھا اور مسلمانوں کا راستہ چھوڑ کر دوسرے راستہ پر ہولیا تو ہم اس کو جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے اور اسکو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بری جگہ ہے جانے کی۔ (النساء ۱۱۵)

پس جو شخص اجماع امت کے خلاف کوئی نظریہ پیش کرے اس کا نظریہ لائق التفات نہیں، ہر شخص کو ایسے نظریات سے پناہ مانگنی چاہئے جن کا نتیجہ دنیا میں اہل ایمان کے راستہ سے انحراف اور آخرت میں جہنم ہو۔

پانچواں اصول:۔ دلائل شرع، جن سے شرعی مسائل کا ثبوت پیش کیا جائے، چار ہیں۔ (۱) کتاب اللہ (۲) سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم (۳) اجماع امت (۴) ائمہ مجتہدین کا اجتہاد واستنباط۔ ان چار چیزوں کو چھوڑ کر کسی اور چیز سے شرعی مسائل پر استدلال کرنا صحیح نہیں۔

چھٹا اصول:۔ اللہ تعالیٰ نے دین قیم کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے اور وعدہ خداوندی کے مطابق یہ دین اصولاً وفروعاً الحمدللہ آج تک محفوظ ہے اور انشاء اللہ قیامت تک محفوظ رہے گا۔ مختلف ادوار میں ابوالفضل اور فیضی جیسے لوگوں نے دین کے مسلمہ مسائل میں نئی راہیں نکالنے کی کوشش کی لیکن الحمدللہ ان کی کوششیں ناکام ہوئیں ورنہ آج تک یہ دین مسخ ہو چکا ہوتا جس طرح پہلی قوموں نے اپنے دین کو مسخ کر دلیا تھا آج بھی جو لوگ دین کے مسلمہ اجماعی مسائل کو بدلنا چاہتے ہیں، اطمینان رکھئے کہ ان کی کوششیں بھی ناکامی سے ہمکنار ہوں گی اور اللہ کا دین انشاء اللہ جوں کا توں محفوظ رہے گا۔

ساتواں اصول:۔ مومن کا کام یہ ہے کہ اگر وہ گناہ سے نہ بچ سکتا ہو تو کم سے کم گناہ تو سمجھے، اور اگر کسی برائی کے خلاف جہاد نہ کر سکتا ہو تو دل سے برائی کو برائی ہی جانے یہ ایمان کا کم سے کم درجہ ہے کسی گناہ کو گناہ ہی نہ سمجھنا اور کسی برائی کو برائی سمجھنے کے بجائے اس کو بھلائی ثابت کرنے کی کوشش کرنا تقاضائے ایمان کے خلاف ہے اور یہ بڑی خطرناک حالت ہے۔

آٹھواں اصول:۔ جو شخص کسی غلطی میں مبتلا ہو اس کا منشا کبھی تو ناواقفی اور غلط فہمی ہوتی ہے اور کبھی اس کا منشا ''جہل مرکب'' ہوتا ہے کہ آدمی کسی بات کو ٹھیک سے نہ سمجھتا ہو، مگر اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کر وہ اس مسئلہ کو سمجھتا ہے، دوسرے نہیں سمجھتے۔ ان دونوں حالتوں میں چند وجہ سے فرق ہے۔

اول یہ کہ ناواقف آدمی حقیقت کی تلاش وجستجو میں رہتا ہے اور جو شخص جہل مرکب میں مبتلا ہو وہ باطل کو حق سمجھ کر حق کی تلاش سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

دوم یہ کہ ناواقف آدمی کو اگر صحیح مسئلہ بتا دیا جائے تو بصد شکریہ اس کو قبول کر لیتا ہے۔ لیکن جہل مرکب کا مریض چونکہ اپنے قلب میں قبول حق کی استعداد وصلاحیت نہیں رکھتا اس لئے وہ اپنی غلطی پر متنبہ پر اپنی اصلاح کرنے کی بجائے غلطی کی نشاندہی کرنے والوں پر خفا ہوتا ہے۔

''سو پوچھ لو اہل علم سے، اگر تم کو علم نہیں۔'' (النحل ۴۳)

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا تھا:

''جب ان کو علم نہیں تھا تو انہوں نے کسی سے پوچھا کیوں نہیں؟ کیونکہ مرض جہل کا علاج تو پوچھنا ہے۔'' (ابوداؤد ص ۴۹ ج ا)

لیکن ''جہل مرکب'' ایک لاعلاج بیماری ہے، اس کا علاج نہ لقمان حکیم کے پاس ہے، نہ سقراط و بقراط کے پاس۔ دنیا بھر کے علماء و فضلاء، غوث قطب اور نبی وولی اس کے علاج سے عاجز ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ناواقفی و لاعلمی کا منشا تو غفلت ہے، سوتے کو جگا دینا اور بے علم کو آگاہ کر دینا ممکن ہے جب کہ ''جہل مرکب'' کا منشا کبر ہے، جو شخص ''جہل مرکب'' میں مبتلا ہو، اس کو ''انا ولا غیری'' کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے، وہ اپنے کو عقل کل سمجھتا ہے اور اپنی رائے کے مقابلے میں دنیا بھر کے علماء وعقلاء کو ہیچ سمجھتا ہے۔ ایسے شخص کو کس دلیل اور کس منطق سے سمجھایا جائے اور کس تدبیر سے اسے حق کی طرف واپس لایا جائے؟

صحیح مسلم وغیرہ کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایسا شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر کبر ہو۔ عرض کیا گیا کہ یارسول اللہ ایک شخص چاہتا ہے کہ اس کا لباس اچھا ہو، اس کا جوتا اچھا ہو، کیا یہ بھی کبر ہے؟ فرمایا نہیں یہ تو جمال ہے اللہ تعالیٰ خود صاحب جمال ہیں اور جمال کو پسند فرماتے ہیں کبر یہ ہے کہ آدمی حق بات کو قبول کرنے سے سرکشی کرے اور دوسروں کو نظر حقارت سے دیکھے۔'' (مشکوٰۃ شریف ص ۴۳۳)

الغرض آدمی کا کسی شرعی مسئلہ میں ناواقفی کی بنا پر چوک جانا کوئی عار کی بات نہیں، بشرطیکہ یہ جذبہ دل میں موجود ہو کہ صحیح مسئلہ اس کے سامنے آئے تو اسے فوراً مان لے گا اور اس کے قبول کرنے سے عار نہیں کرے گا اور جو شخص حق کھل جانے کے باوجود اسکے قبول کرنے سے عار کرتا ہے وہ ''جہل مرکب'' میں مبتلا ہے اور اس کی بیماری لاعلاج ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مومن کو اس سے پناہ میں رکھیں۔

ان اصول موضوعہ کے بعد گزارش ہے کہ مولانا کوثر نیازی کو مسئلہ کی صحیح نوعیت کے سمجھنے میں بہت سی غلط فہمیاں ہوئی ہیں اور موصوف نے مذکورہ بالا اصول موضوعہ کی روشنی

میں مسئلہ پر غور نہیں فرمایا اور نہ مسئلہ کے مالہ وما علیہ پر طائرانہ نظر ڈالنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ اگر موصوف نے سلامتی فکر کے ساتھ اس مسئلہ کی گہرائی میں اتر کر اس پر غور وفکر کیا ہوتا تو مجھے توقع تھی کہ ان کو غلط فہمیاں نہ ہوتیں۔

اس ناکارہ کا منصب نہیں کہ ان کی خدمت میں کچھ عرض کرنے کی گستاخی کرے اور ان کی بارگاہ عالی میں شنوائی ہو کیونکہ وہ آشیان اقتدار کے مکین، وزیر اعظم کے مشیر وہمنشین اور صاحب سخنہائے دل نشین ہیں اور ادھر یہ ناکارہ فقیر بے نوا، زاویہ خمول کا گدا اور صاحب نالہ ہائے نارسا ہے۔

کب وہ سنتا ہے کہانی میری　　　اور پھر وہ بھی زبانی میری؟

لیکن بزرگوں کا ارشاد ہے:

گاہ باشد کہ کودک نادان　　　بہ غلط برہدف زند تیرے

اس لئے اپنے فہم نارسا کے مطابق کچھ عرض کرتا ہوں کہ صاحب موصوف کی بارگاہ میں شرف قبول پائے تو زہے سعادت ورنہ:

حافظ وظیفہ تو دعا گفتن است وبس　　　دربند آں مباش کہ نشنید یا شنید

بہرحال مولانا موصوف کو مسئلہ کی صحیح نوعیت کے سمجھنے میں جو مغالطے ہوئے یہ ناکارہ ان کو ایک ایک کر کے ذکر کرتا ہے۔ اور نتائج کا فیصلہ خود ان کے فہم انصاف پر اور اگر وہ داد انصاف نہ دیں تو اللہ تعالیٰ کی عدالت پر چھوڑتا ہوں۔

مولانا موصوف اپنے مضمون کی تمہید اٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۱۹۶۴ء میں صدر ایوب خاں اور محترمہ فاطمہ جناح کے درمیان صدارتی انتخاب کا معرکہ برپا ہوا تو صدر ایوب کے حامی بہت سے علمائے کرام نے یہ فتویٰ جاری کیا کہ عورت کا صدر مملکت بننا حرام ہے، اس لئے محترمہ فاطمہ جناح کو ووٹ دینا جائز نہیں، اس پر میں نے جامع مسجد شاہ عالم مارکیٹ لاہور میں خطبہ دیتے ہوئے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی جو بعد میں ہفت روزہ ''شہاب'' لاہور میں شائع ہونے کے علاوہ ایک کتابچہ کی صورت میں بھی چھاپ دی گئی تھی، بعد میں پشتو اور سندھی زبانوں میں بھی اس کے ترجمے ہوئے اور یہ کتابچہ

لاکھوں کی تعداد میں ملک بھر میں پھیل گیا۔ میں نے اپنے اس خطبہ میں قرآن وحدیث اور تاریخ کے حوالوں سے علمائے کرام کے مذکورہ بالا فتوے کی ''مدلل تردید'' کی تھی۔ مزید تفصیل کے لئے رسالہ ''عورت کی سربراہی'' از مولانا یوسف لدھیانوی ملاحظہ فرمائیں۔

چند شبہات کا جواب

گذشتہ سطور میں ہم نے قرآن وحدیث اور ائمہ دین کے حوالوں سے واضح کیا ہے کہ عورت سربراہ حکومت بننے کی صلاحیت نہیں رکھتیں بعض حضرات کی تحریروں میں اس سلسلہ میں چند شبہات کا اظہار کیا گیا ہے، مناسب ہوگا کہ علمی انداز میں ان پر بھی غور کرلیا جائے۔

الرجال قوامون علی النساء پر شبہ

بعض حضرات سے آیت کریمہ **الرجال قوامون علی النساء** (النساء۳۴) کے بارے میں فرمایا کہ یہ آیت صرف ازدواجی زندگی اور تدبیر منزل (گھریلو مسائل) کے بارے میں ہے، امور مملکت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ عورت کے اخراجات کی ذمہ داری اس کے شوہر پر ہے۔ شوہر کے اخراجات کا ذمہ عورت پر نہیں۔ اس کی وجہ عورت کو مرد سے وفادار رہنا چاہیئے۔

ان حضرات نے اس پر غور نہیں فرمایا کہ جب ازدواجی زندگی اور تدبیر منزل میں قرآن کریم نے مرد کو نگران اور حاکم اور عورت کو اس کے تابع اور مطیع قرار دیا ہے تو امور مملکت میں قرآن کریم عورت کو حاکم اور مردوں کو اس کا مطیع وفرمانبردار کیسے قرار دے سکتا ہے؟ اس نکتہ کی وضاحت یہ ہے کہ مرد وعورت، شریعت کے مقرر کردہ دستور کے مطابق ازدواجی رشتہ میں منسلک ہوتے ہیں تو اس سے ایک ''گھر'' وجود میں آتا ہے یہ انسانی تمدن کا پہلا زینہ ہے۔ یہیں سے تدبیر منزل (گھریلو مسائل) کا آغاز ہوتا ہے۔ پھر چند گھروں سے مل کر ایک بستی آباد ہو جاتی ہے اور یہاں سے ''سیاست مدینہ'' کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ انسانی تمدن کا گویا دوسرا زینہ ہے۔ پھر چند شہروں کے مجموعہ سے ایک ملک وجود میں آتا ہے اور اس سے ''امور مملکت'' کی بنیاد فراہم ہوتی ہے۔ یہ انسانی تمدن کا تیسرا مرحلہ ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی تمدن کے پہلے قدم اور پہلے مرحلہ پر ہی قرآن حکیم اعلان کردیتا ہے، **الرجال قوامون علی النساء** گویا قرآن کریم کی نظر میں انسانی تمدن کے پہلے مرحلہ کا فطری نظام یہ ہے کہ مرد حاکم ہو اور عورت اس کی مطیع و فرمانبردار ہو۔ اس کے برعکس اگر عورت حاکم اور مرد اس کا مطیع و فرمانبردار ہو تو یہ نظام قرآن کریم کی نظر میں غیر صالح اور خلاف فطرت ہوگا۔ اب غور فرمائیے کہ جب تمدن کی پہلی اکائی اور اولین قدم پر عورت حاکمیت کی صلاحیت نہیں رکھتی تو تمدن کے آخری زینہ (ملکی سیاست) میں عورت کی حاکمیت کا مقام قرآن کریم کی نظر میں کیا ہوگا۔ آپ اسے مختصر الفاظ میں یوں تعبیر کرلیجئے کہ قرآن کریم جب ایک چھوٹے سے گھر میں (جس کی ابتدائی تشکیل صرف دوافراد سے ہوتی ہے) عورت کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتا تو کروڑوں انسانوں کی آبادی کے ملک میں عورت کی حاکمیت کو کیسے تسلیم کرسکتا ہے؟

اور پھر ان حضرات نے اس پر بھی غور نہیں فرمایا کہ عائلی زندگی میں مرد کی حاکمیت کا اعلان کرتے ہوئے قرآن کریم نے اس کی پہلی وجہ مرد کی فضیلت قرار دی۔ **بما فضل اللہ بعضھم علی بعض** اس توجیہ و تعلیل میں صراحت کردی گئی ہے کہ مرد کی حاکمیت کا اصل سبب اس کی فضیلت ہے۔ لہٰذا جو معاشرہ مردوں اور عورتوں کے مجموعہ پر مشتمل ہو (جس کی بالکل ابتدائی شکل تدبیر منزل ہے اور اس کی آخری شکل سیاست ملکیہ ہے (اس میں مرد بوجہ اپنی فضیلت کے حاکم ہوگا اور عورت اس کے تابع فرمان ہوگی) **فالصٰلحٰت قنتٰت** الآیہ۔

اور مرد کی حاکمیت کا دوسرا سبب یہ بیان فرمایا ہے کہ مردوں پر عورتوں کے مہر اور نان و نفقہ کی ذمہ داری ہے، عورتوں پر مردوں کے نان ونفقہ کی ذمہ داری تو کیا ہوتی خود ان کے اپنے نان ونفقہ کی ذمہ داری بھی ان پر نہیں ڈالی گئی، ایسا کیوں کیا گیا؟ اس لئے کہ کسب معاش کے لئے گھر سے باہر جانے اور کھلے بندوں پھرنے کی ضرورت ہے، اس کی صلاحیت صرف مرد رکھتا ہے، عورت اپنی صنفی خصوصیات کی بنا پر اس کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اس لئے قرآن کریم ان کے نان ونفقہ کی ذمہ داری مردوں کے کندھوں پر ڈال کر خود ان پر گھر میں رہنے اور حجاب و تستر اختیار کرنے کی پابندی عائد کردیتا ہے۔

"وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاھلیة الاولی." (الاحزاب ۳۳)

''اور تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور قدیم زمانہ جاہلیت کے دستور کے موافق مت پھرو۔'' (ترجمہ: حضرت تھانویؒ)

اب انصاف فرمایئے کہ جو قرآن گھر میں عورت کو حکمران تسلیم نہیں کرتا جو مرد کی فضیلت کا حوالہ دے کر اس کی حاکمیت کا اعلان کرتا ہے جو عورت کے نان ونفقہ کا بار مرد پر ڈال کر عورت پر حجاب وستر اور گھر میں جم کر بیٹھنے کی پابندی عائد کرتا ہے، کیا یہ عقل ودانش کی بات ہوگی کہ وہی قرآن عورت کو ملک کی حاکم اعلیٰ بن کر سب کے سامنے بے حجابانہ گھومنے پھرنے اور ساری دنیا کے لوگوں سے ملاقاتیں کرنے کی اجازت دے؟

الغرض آیت کریمہ مرد کی قوامیت کا اعلان کرتے ہوئے عورت کی حکومت وولایت کی نفی کرتی ہے، اکابر امت نے آیت کا یہی مفہوم سمجھا ہے جیسا کہ متعدد اکابر مفسرین کے حوالے پہلے گزر چکے ہیں۔ یہاں حضرت مولانا ظفر احمد تھانویؒ کی کتاب احکام القرآن کا حوالہ مزید پیش کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"القوام والقیم واحد والقوام ابلغ وھو القائم بالمصالح والتدبیر والتادیب وعلل ذالک بامرین وھبی وکسبی فقال "بما فضل اللہ بعضھم علی بعض" یعنی فضل الرجال علی النساء فی اصل الخلقه وکمال العقل وحسن التدبیر وبسطة فی العلم والجسم ومزید القوة فی الاعمال وعلوالا ستعداد. ولذالک خصوا بالنبوة والامامة والقضاء والشھادة فی الحدود والقصاص وغیر ھما ووجوب الجھاد والجمعة والعیدین والاذان والخطبة والجماعة وزیادة السھم فی الارث ومالکیته النکاح وتعدد المنکوحات والاستبداد بالطلاق وکمال الصوم والصلوٰة من غیر فتور وغیرہ ذالک، وھذا امروھبی ثم قال وبما انفقوا من اموالھم فی نکاحھن من المھور والنفقات الراتبة وھذا امر کسبی." (احکام القرآن ج ۲، ص ۱۷۶)

''قوام اور قیم کے ایک ہی معنی ہیں اور قوام زیادہ بلیغ ہے قوام وہ ہے جو کسی کے مصالح،

تدبیر اور تادیب کا ذمہ دار ہو۔ ''مرد عورتوں کے قوام ہیں'' اس کی دو وجہیں ذکر فرمائی ہیں۔ ایک وہبی اور دوسری کسبی چنانچہ فرمایا ''اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ ''یعنی اللہ تعالیٰ نے مردوں کو فضیلت دی ہے اصل خلقت میں، کمال عقل میں، حسن تدبیر میں، علم و جسم کی فراخی میں، اعمال کی مزید قوت میں اور استعداد کی بلندی میں اسی بناء پر درج ذیل امور مردوں سے مخصوص ہیں، نبوت، امامت، قضا حدود و قصاص وغیرہ پر شہادت دینا، وجوب جہاد، جمعہ، عیدین، اذان، خطبہ، جماعت، وراثت میں زیادہ حصہ ملنا، نکاح کا مالک ہونا، ایک سے زیادہ نکاح کرنا، طلاق دینے کا اختیار، بغیر وقفہ کے نماز روزہ کا پورا کرنا وغیرہ ذالک۔ اور یہ امر وہبی ہے۔ پھر فرمایا ''اور اس وجہ سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں۔'' یعنی نکاح میں مہر اور نان و نفقہ مردوں پر لازم ہے اور یہ کسبی امر ہے۔''

اگر کسی کو قرآن کریم کو اپنے خود ساختہ معنی و مفہوم پہنانے اور خود ہی اپنے ذہنی خیالات کو قرآن کریم سے اگلوانے کی ضد ہو اس کا مرض تو لاعلاج ہے ورنہ قرآن کریم کا بالکل سیدھا سادھا مفہوم سامنے رکھئے اور پھر بتایئے کہ کیا قرآن مردوں پر عورت کی حاکمیت کا اعلان کرتا ہے یا اس کے برعکس اس کا اعلان یہ ہے کہ ''مرد حاکم ہیں عورتوں پر۔''

واقعہ یہ ہے کہ قران کریم نے معاشرہ میں مرد و عورت کے مقام و منصب کا جو تعین کیا ہے، اور خواتین کے بارے میں نکاح، طلاق عدت اور ستر و حجاب کے جو تفصیلی احکام دیئے ہیں اگر کوئی شخص ان سے واقف بھی ہے اور ان پر ایمان بھی رکھتا ہے تو اسے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ قرآن کریم کی خصوصی ہدایات کی روشنی میں عورت کے سربراہ مملکت و سربراہ حکومت بننے کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہاں! جو شخص احکام و ہدایات سے واقفیت ہی نہ ہو وہ بے چارہ اپنے جہل کی وجہ سے معذور ہے۔

''لن یفلح قوم ولوا امرہم امراۃ'' پر شبہات

ا:۔ کیا یہ حدیث موضوع ہے؟

بعض حضرات نے حدیث نبوی ﷺ ''وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جس نے

حکومت عورت کے سپرد کردی۔'' کو موضوع قرار دینے کی کوشش کی ہے، ان حضرات پر اس حبشی کی حکایت صادق آتی ہے جسے راستہ میں کہیں آئینہ پڑا ہوا مل گیا۔ اسے اٹھایا تو اپنی مکروہ شکل نظر آئی اسے پتھر پر مار کر توڑ دیا اور کہا کہ تو ایسا ہی بدشکل تھا تبھی تو تجھے کسی نے یہاں پھینک دیا۔ ان حضرات کو بھی حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے آئینہ میں اپنی شکل بھیانک نظر آئی تو انہوں نے اس حدیث کو ہی مجروح کرنے کی کوشش کی یہ حدیث نہ موضوع ہے نہ کمزور، بلکہ اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے۔ اس حدیث کے لئے درج ذیل کتابیں ملاحظہ فرمائیے۔

☆ صحیح بخاری جلد ص ۶۳۷ (باب کتاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی کسری وقیصر۔ جلد ۲ ص ۱۰۵۲، باب الفتنۃ التی تموج کموج البحر)

☆ نسائی جلد ۲ ص ۳۰۴ (باب النھی عن استعمال النساء فی الحکم)

☆ ترمذی جلد ۲ ص ۵۱ (قبیل ابواب الرؤیا)

☆ مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۱۱۹

☆ سنن کبری للبیھقی جلد ۳ ص ۹۰ باب لا یاتم رجل بامراۃ جلد ۱۰ ص ۱۱۸ باب لا یولی الوالی امراۃ الخ)

☆ مسند احمد جلد ۵ ص ۳۸، ۴۳، ۴۷، ۵۱۔

اس حدیث کا صحیح بخاری میں ہونا ہی اس کی صحت کی کافی ضمانت ہے امام حاکمؒ اس کو نقل کر کے ''صحیح علی شرط الشیخین'' فرماتے ہیں۔ اور امام ذہبیؒ تلخیص مستدرک میں اس کو صحیح علیٰ شرط الشیخین تسلیم کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں اس حدیث کو بے شمار ائمہ حدیث اور فقہائے امت نے نقل کیا، اس سے اہم ترین مسائل کا استخراج کیا ہے مگر کسی نے کبھی یہ بحث نہیں اٹھائی کہ یہ حدیث صحیح بھی ہے یا نہیں؟ آج اس حدیث کی صحت کے بارے میں وہ لوگ شک وشبہ کا اظہار کرتے ہیں، جو ابوبکر اور ابوبکرہ کے درمیان فرق نہیں کر سکتے اور یہ محض اس لئے کہ ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کی خواہش نفس کے خلاف ہے، اسی مضمون کی دوسری حدیث مستدرک حاکم (جلد ۴ ص ۲۹۱) میں ہے:

''عن ابی بکرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اتاہ بشیر یبشرہ بظفر خیل لہ وراسہ فی حجر عائشہ رضی اللہ تعالیٰ

عنها، فقام، فخرللہ تعالٰی ساجداً فلما انصرف انشاء یسال الرسول، فحدثه، فکان فیما حدثه من امر العدو: وکانت تلیهم امراة فقال النبی صلی اللہ علیه وسلم هلکت الرجال حین اطاعت النساء."
(قال الحاکم هذا صحیح الاسناد ولم یخرجاه واقره الذهبی)

"حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک قاصد اس لشکر کی کامیابی کی خوشخبری لے کر آیا جو آپ نے کسی مہم پر بھیجا تھا۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی گود میں تھا۔ آپ اٹھے اور خوشخبری سن کر سجدہ شکر بجالائے۔ سجدہ سے اٹھے تو قاصد سے حالات دریافت فرمانے لگے۔ اس نے دشمن کے حالات بتاتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ ان کی حکمران ایک عورت تھی، یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہلاک ہوگئے مرد جب انہوں نے عورتوں کی ماتحتی قبول کرلی۔"

امام حاکم اس حدیث کی تخریج کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے، امام ذہبی حاکم کی تصدیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

۲:۔ کیا ابوبکر بن العربی نے اس حدیث کو موضوع کہا ہے:

ایک صاحب نے تو اس حدیث کو موضوع ثابت کرنے کے لئے ایک بہت بڑے فقیہ و محدث قاضی ابوبکر ابن العربیؒ نے اپنی کتاب کا حوالہ بھی دے ڈالا، وہ لکھتے ہیں:

"علامہ ابوبکر ابن العربی نے اپنی کتاب "عواصم القواصم" میں اس حدیث پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ کی احتجاجی مہم کو ان کا غلط فیصلہ ثابت کرنے کے لئے یہ حدیث وضع کی گئی۔" (روزنامہ جنگ کراچی ص ۷، ۲۴ دسمبر ۸۸ء)

جن حضرات نے قاضی ابوالعربیؒ (المتوفی ۵۴۳ھ) کی "العواصم من القواصم" کا مطالعہ کیا ہے انہیں معلوم ہوگا کہ اس پوری کتاب میں زیر بحث حدیث کا کہیں ذکر نہیں آیا اور جس حدیث کا کتاب میں ذکر ہی نہ آیا ہو اس پر کلام کرنے یا اس کو موضوع و مجروح قرار دینے کا کیا سوال؟ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے قصہ میں قاضی ابوبکر ابن العربیؒ نے حدیث جواب کو ذکر کرکے اس کے بارے میں لکھا ہے؟

''واما الذی ذکرتم من الشهادة علی ماالحواب، فقدبوتم فی ذکرها باعظم حوب، ماکان قط شیٔ مما ذکرتم، ولا قالی النبی صلی اللہ علیه وسلم ذالک الحدیث.'' (العواصم من القواصم ص ۱۶۱)

''اور یہ جو تم نے ماحواب'' پر شہادت کا ذکر کیا ہے، اس کو ذکر کر کے تم نے سب سے بڑے گناہ (جھوٹی شہادت) کا ارتکاب کیا ہے، جو واقعہ تم نے ذکر کیا ہے وہ کبھی ہوا ہی نہیں اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث کبھی ارشاد فرمائی۔''

مضمون نگار کی اس خیانت و بددیانتی اور بہتان طرازی کی داد دیجئے کہ محض جھوٹا اور صریح غلط حوالہ دے کر ایک صحیح حدیث کو (نعوذ باللہ) ''موضوع'' ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مضمون نگار نے صحیح حدیث کو رد کرنے کے لئے قاضی ابوبکر بن العربی پر جو بہتان باندھا ہے اس کی تردید کے لئے خود قاضی ابوبکر کی اپنی تصریحات کافی ہیں قاضی ابوبکر العربی اپنی کتاب احکام القرآن میں سورۃ النمل کی آیت ۲۳ کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

"فیها ثلاث مسائل...... المساله الثالثة: روی فی الصحیح عن النبی صلی اللہ علیه وسلم قال حین بلغه ان کسری لمامات ولی قومه ابنته "لن یفلح قوم ولو امرهم امراة" ...... وهذا نص فی ان المراة لاتکون خلیفة ولا خلاف فیه.'' القرآن ج ۳، ص ۱۴۵۷)

''اس آیت میں تین مسئلے ہیں...... تیسرا مسئلہ: صحیح بخاری میں روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی کہ کسریٰ کے مرنے پر اس کی قوم نے حکومت اس کی بیٹی کے حوالے کر دی تو آپ نے ارشاد فرمایا: ''وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جس نے حکومت عورت کے سپرد کر دی۔'' اور یہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اس مسئلہ کی نص صریح ہے کہ عورت خلیفہ نہیں ہو سکتی اور اس مسئلہ میں کسی کا اختلاف نہیں۔'' اور شرح ترمذی میں قاضی ابوبکر ابن العربی لکھتے ہیں۔

"ذکر عن ابی بکرة قول النبی صلی اللہ علیه وسلم : "لن یفلح قوم ولوا امرهم امراة" (العارضه) هذا یدل ان الولایه للرجال، لیس لنساء فیها مدخل بالاجماع." (عارضته الاحوذی بشرح صحیح الترمذی جلد ۹ ص ۱۱۹)

''امام ترمذی نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ ''وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جس نے حکومت عورت کے سپرد کردی۔'' یہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اس اجماعی مسئلہ کی دلیل ہے کہ حکومت مردوں کے ساتھ مخصوص ہے، عورتوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔''

آپ دیکھ رہے ہیں کہ دونوں کتابوں میں قاضی ابوبکر ابن العربی اس مسئلہ پر اجماع نقل کررہے ہیں کہ عورت، حکومت کی سربراہ نہیں بن سکتی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکور الصدر ارشاد کو اس کی دلیل اور نص صریح قرار دے رہے ہیں۔

کیا یہ حدیث عمومی حکم نہیں رکھتی؟

انہی مضمون نگار صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے:

''علاوہ ازیں یہ حدیث ایک خاص واقعہ سے تعلق رکھتی ہے اس سے عمومی حکم ثابت کرنا بہت مشکل ہے۔''

کس آیت اور حدیث سے عمومی حکم ثابت ہوتا ہے اور کس سے نہیں؟ اس کو ائمہ مجتہدین اور فقہائے امت بہتر سمجھتے ہیں۔ ہم جیسے لوگ جو قاضی ابوبکر ابن العربیؒ کی کتاب کے نام کی املا صحیح نہیں لکھ سکتے اور ''العواصم من القواصم'' کی جگہ ''عواصم القواصم'' لکھ جاتے ہیں اور جو ''ابن عربی'' اور ابن العربی'' کے درمیان فرق نہیں جانتے وہ کسی آیت یا حدیث کے عموم و خصوص کا فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں۔ اور اگر ہم اپنی ذاتی خواہش پر ایسے فیصلے صادر بھی کریں تو ہمارے علم و فہم اور ہماری دیانت و امانت کے پیش نظر ایسے فیصلوں کی کیا قیمت ہوگی؟ اہل علم اس سے خوب واقف ہیں۔ تعجب ہے کہ جو شخص ایک حوالہ بھی صحیح نقل نہیں کرتا، اور جو کتاب اور مصنف کے نام تک غلط لکھتا ہے وہ (تمام ائمہ فقہاء کے علی الرغم) حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اجتہاد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ حکم عام نہیں بلکہ ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے۔

حالانکہ بہت موٹی سی بات ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حدیث میں صرف اہل ایران کے عدم فلاح کو بیان کرنا ہوتا تو اس کے لئے ایک لفظ کافی تھا یعنی ''لن یفلحوا (کہ یہ لوگ کبھی فلاح نہیں پائیں گے) اس چھوٹے سے مضمون کو ادا کرنے کے لئے

اتنا طویل فقرہ استعمال نہ فرمایا جاتا۔

اہل علم جانتے ہیں کہ اس حدیث میں ''قوم'' کا لفظ نکرہ ہے جو سیاق نفی میں واقع ہے اور یہ قطعی عموم کا فائدہ دیا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اول سے آخر تک تمام اہل علم نے اس حدیث سے بالاجماع یہ سمجھا ہے کہ یہ حکم عام ہے اور یہ کہ اس ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں یہ طے شدہ امر ہے کہ عورت حکومت کی سربراہ نہیں بن سکتی۔ اس کے بعد یہ کہنا کہ ''اس میں عمومی حکم نہیں بلکہ ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے'' ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی خواہش کے مطابق ڈھالنے کی کوشش ہے، جسے کسی بھی طرح مستحسن نہیں کیا جا سکتا۔

کیا خبر واحد حلال و حرام میں حجت نہیں؟

یہی صاحب اپنے مضمون میں مزید لکھتے ہیں:

علاوہ ازیں یہ حدیث خبر واحد ہے۔ متواتر یا مشہور حدیث نہیں، خبر واحد سے حلال و حرام کا کوئی مسئلہ ثابت نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سے زیادہ کسی عمل کو مکروہ ثابت کیا جا سکتا ہے لیکن مکروہ اور جائز ایک دوسرے کے قریب ہیں۔''

اس عبارت میں تین دعوے ہیں اور تینوں غلط ہیں۔ موصوف کا یہ دعویٰ کہ حدیث خبر واحد ہے متواتر یا مشہور حدیث نہیں۔ ''اس لئے غلط ہے کہ اس حدیث کے مضمون پر امت کا اجماع ہے۔ جیسا کہ امام قرطبیؒ ابوبکر ابن العربیؒ علامہ عبدالعزیز فرہارویؒ اور دیگر اکابر کی تصریحات سے معلوم ہو چکا ہے اور جس حدیث پر امت کا اجماع ہو اور امت نے اسے بالاتفاق قبول کیا ہو وہ حدیث حجت قطعیہ بن جاتی ہے اور اسے تواتر معنوی کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ امام ابوبکر جصاصؒ اپنی بے نظیر کتاب ''احکام القرآن'' میں ایک حدیث پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وقد استعملت الامه هذين الحديثين فى نقصان العدة وان كان وروده من طريق الاحادفصار فى حيز التواتر لان ماتلقاه الناس بالقبول من اخبار الا حاد فهو عندنا فى معنى المتواتر لما بيناه فى مواضع. '' (احکام القرآن جلد ۱ ص ۳۸۶)

''امت نے نقصان عدت کے مسئلہ میں ان دونوں حدیثوں سے استدلال کیا ہے، اگرچہ یہ

حدیث خبر واحد کے طریق سے وارد ہوئی ہے لیکن یہ متواتر کے درجہ میں ہے کیونکہ جس خبر واحد کو تمام لوگوں نے قبول کیا ہو وہ ہمارے نزدیک متواتر کے حکم میں ہے۔ جس کی وجہ ہم کئی جگہ بیان کر چکے ہیں۔"

علمائے اصول نے تصریح کی ہے کہ جب خبر واحد کے حکم پر اجماع ہو جائے تو حکم قطعی ہو جاتا ہے اور اس حدیث کے ثبوت و عدم ثبوت کی بحث ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ مولانا عبدالحلیم لکھنوی نور الانوار کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

"وفائدة الاجماع بعد وجود السند سقوط البحث وصيرة الحكم قطعيا." (حاشیہ نور الانوار ص ۲۲۲)

"اور سند اجماع کے وجود کے بعد اجماع کا فائدہ یہ ہے کہ بحث ختم ہو جاتی ہے اور وہ حکم قطعی ہو جاتا ہے۔"

شیخ یحییٰ ہارون مصری، شرح منار لابن ملک کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

"وفائدة الاجماع بعد وجود السند سقوط البحث عن الدليل وحرمه المخالفه وضرورة كون الحكم قطعيا." (شرح المنار و حواث من الاصول جلد ۲ ص ۷۴۵)

"اور سند اجماع کے بعد اجماع کا فائدہ یہ ہے کہ دلیل کے بارے میں بحث ختم ہو جاتی ہے، اس کی مخالفت حرام ہو جاتی ہے، اور حکم بدیہی طور پر قطعی ہو جاتا ہے۔"

اوپر گزر چکا ہے کہ حدیث نبوی لن یفلح قوم ولوا امرہم امراۃ کو تمام علمائے امت اور ائمہ دین نے قبول کیا ہے اور اس سے استدلال کرتے ہوئے بالاتفاق یہ فیصلہ دیا ہے کہ عورت حکومت کی سربراہ نہیں بن سکتی جس طرح نماز میں مردوں کی امام نہیں بن سکتی پس جب یہ حدیث تمام اہل علم اور ائمہ دین کے اجماع کی سند ہے تو اس کو خبر واحد کہہ کر رد کر دینا ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے ساتھ ناروا گستاخی ہے اور دوسری طرف تمام ائمہ دین کے اجماع کو باطل قرار دینا ہے۔ امام فخر الاسلام بزدویؒ فرماتے ہیں:

ومن انكر الاجماع فقد ابطل الدين كله لان مدار اصول الدين كلها ومرجعها الى اجماع المسلمين." (اصول بزودی ص ۲۴۷)

''اور جس شخص نے اجماع کا انکار کر دیا اس نے پورے دین کو باطل کر دیا کیونکہ دین کے تمام اصول کا مدار و مرجع مسلمانوں کا اجماع ہی ہے۔''

مضمون نگار کا یہ دعویٰ کہ ''خبر واحد سے حلال و حرام کا کوئی مسئلہ ثابت نہیں ہو سکتا'' قطعاً غلط اور مہمل ہے۔ جس شخص کو دین کی معمولی سوجھ بوجھ بھی ہو وہ جانتا ہے کہ دین اسلام کے بے شمار مسائل اخبار آحاد ہی سے لئے گئے ہیں۔ موصوف کے نظریے سے یہ تمام مسائل باطل قرار پائیں گے۔ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے بقول:

''ایں اعتقاد نکند مگر جاہلے کہ از جہل خود بے خبر است یا زندیقے کہ مقصودش ابطال شطر دین است۔'' (مکتوبات دفتر دوم مکتوب ۵۵)

خبر واحد کا جائز و ناجائز اور حلال و حرام میں حجت ہونا اہل حق اور ائمہ ہدیٰ کا مسلمہ اصول ہے علم اصول کے مبتدی طلبہ کو بھی یہ فقرہ یاد ہوگا:

"خبر الواحد يوجب العمل لا العلم."

''خبر واحد عمل کو واجب کرتی ہے۔ یقین کا فائدہ نہیں دیتی''۔

مضمون نگار کا تعلق اگر منکرین حدیث سے نہیں تو انہیں غلط سلط اصول گھڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو رد کرنے کی جرأت نہیں کرنی چاہئے تھی۔

موصوف کا تیسرا دعویٰ یہ ہے کہ ''مکروہ اور جائز ایک دوسرے کے قریب ہیں۔'' یہ بھی غلط اور مغالطہ آمیز ہے۔ کیونکہ مکروہ کا لفظ کبھی حرام کے لئے بولا جاتا ہے، کبھی مکروہ تحریمی کے لئے اور کبھی مکروہ تنزیہی کے لئے۔ مکروہ تحریمی حرام کے قریب ہے اور مکروہ تنزیہی جائز کے قریب ہے۔ علامہ شامیؒ مکروہات وضو کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"(قوله ومكرهه) هو ضد المحبوب، قديطلق على الحرام كقول القدوری فی مختصره: ومن صلى الظهر فی منزله يوم الجمعه قبل صلاة الامام ولا عذر له كره له ذلک، وعلى المكروه تحريما وهو ما كان الى الحرام اقرب، ويسميه محمد حراماً ظنياً. وعلى المكروه تنزيهاً : وهو ماكان تركه اولىٰ من فعله ويرادف خلاف الاولىٰ كما قدمناه" (شامی. ردالمحتار جلد ۱ ص ۱۳۱)

”مکروہ کا لفظ محبوب کی ضد ہے۔ یہ کبھی حرام پر بولا جاتا ہے، کبھی مکروہ تحریمی پر، اور مکروہ تحریمی وہ ہے جو حرام سے قریب تر ہو۔ امام محمد (رحمۃ اللہ علیہ) اسی کو ”حرام ظنی“ فرماتے ہیں۔ اور کبھی مکروہ تنزیہی پر بولا جاتا ہے، اور مکروہ تنزیہی وہ ہے جس کا چھوڑنا اس کے کرنے سے بہتر ہو۔ اسی کو خلاف اولیٰ بھی کہتے ہیں۔“

اور مکروہ کا لفظ جب جائز و ناجائز کے باب میں مطلق بولا جائے تو اس سے مکروہ تحریمی مراد ہوتا ہے جیسا کہ علامہ شامیؒ نے کتاب الحظر والاباحۃ میں تصریح کی ہے۔ (جلد۶ ص ۳۳۷)

اس لئے موصوف کا مطلقاً یہ کہنا ”مکروہ اور جائز ایک دوسرے کے قریب ہیں“ نہ صرف مغالطہ ہے بلکہ لوگوں کو مکروہات شرعیہ کے ارتکاب پر جری کرنے والا ہے۔

ملکہ سبا کے قصہ سے استدلال

بعض حضرات نے ملکہ سبا کے قصہ سے جو قرآن مجید میں مذکور ہے، یہ استدلال کیا ہے کہ عورت حکومت کی سربراہ بن سکتی ہے۔ لیکن اس قصہ سے استدلال نہایت عجیب ہے۔ اس لئے کہ وہ ایک مشرک قوم کی ملکہ تھیں جن کے بارے میں قرآن کریم نے فرمایا ہے ”فہم لایہتدون“۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعوت پر وہ آپ کے تابع فرمان ہوگئی تھیں اور کسی صحیح روایت میں یہ وارد نہیں ہے کہ ان کے اسلام لانے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان کو حکومت پر برقرار رکھا تھا۔ امام قرطبیؒ نے اس سلسلہ میں اسرائیلی قصے ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

”لم یرد فیہ خبر صحیح لا فی انہ تزوجھا ولا فی انہ زوجھا۔“

(قرطبی الجامع لاحکام القرآن جلد ۱۳ ص ۲۱۰، ۲۱۱)

”اس بارے میں کوئی صحیح روایت وارد نہیں ہوئی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان سے خود شادی کرلی تھی اور نہ یہ کہ کسی دوسرے سے شادی کردی تھی۔“

جب تک کسی صحیح روایت سے یہ ثابت نہ ہو کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان کو حکومت پر برقرار رکھا تھا تب تک یہ بھی ثابت نہیں ہوسکتا کہ کم از کم حضرت سلیمان علیہ السلام کی شریعت میں عورت کو حکومت کا سربراہ بنانا جائز تھا۔

علاوہ ازیں انبیاء سابقین علیہم السلام کے واقعات سے استدلال اس وقت جائز ہے جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں ہمیں اس سے کوئی مختلف ہدایت نہ فرمائی ہو۔ زیر بحث مسئلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاف ہدایت موجود ہے کہ عورت سربراہ حکومت نہیں ہوسکتی اور اسی پر امت محمدیہ کا اجماع ہے۔ جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا، اب اگر کسی قطعی دلیل سے یہ بھی ثابت ہو جائے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کو حکومت پر برقرار رکھا تھا تو ہدایت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع امت کے بعد اس سے استدلال کرنا صریح طور پر غلط ہوگا۔

حضرت اقدس مفتی محمد شفیعؒ دیوبندی (سابق مفتی اعظم پاکستان) نے احکام القرآن میں اس آیت پر بہت نفیس کلام فرمایا ہے جو بہت سے فوائد پر مشتمل ہے۔ یہاں اس کا ضروری اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

المراۃ لا تصلح تکون ملکۃ او اماماً

"فعلم ان المراۃ لا تصلح ان تکون ملکه فی شریعة محمد صلی اللہ علیه وسلم وکان واقعة بلقیس من عمل الکفرۃ فلا یحتج به علٰی ماقاله الا لوسی. وان قیل ان اسلوب القرآن الحکیم فی عامته مواضعه انه اذا ذکر فعلا منکراً من الکفار صرح علیه بالانکار. فعدم الانکار علیه فی هذه الایة لعله کان مشیراً الی الجواز قلنا اولاً لا یعلم عموم ماقیل وثانیاً لایلزم ان یکون التصریح بالانکار فی ذلک الموضع بل یکفی الانکار علیه فی شیء من آیاته ولو فی موضع آخر بل فی حجته من حجج الشرعیة فاذا وردالانکار علیه فی حدیث البخاری کفٰی لبیان کونه منکراً کما یرشدک النظر فی امثال هذه المواضع افاده شیخنا دامت عوارفه ویوید حدیث البخاری مارواه الذهبی فی تلخیص المستدرک عن ابی بکرۃ ان النبی صلی اللہ علیه وسلم اتاه بشیر یبشر بظفر خیل له وراسه فی حجر عائشة رضی اللہ عنها فقام فخر للہ ساجداً فلما انصرف انشاء یسال الرسول فحدثه فکان فیما

حدثه من امر العدوو كانت تليهم امراة فقال النبی صلی الله علیه وسلم هلكت الرجال حين اطاعت النساء قال الذهبی صحيح."

(مستدرک ص ۱۹۱ ج ۴) (مفتی محمد شفیعؒ۔ احکام القرآن جلد ۵ ص ۱۸)

عورت ملکہ یا امام بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی

(روح المعانی اور درمختار کی عبارت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں) ''معلوم ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں عورت ملکہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ بلقیس کا واقعہ کافروں کا عمل ہے لہٰذا اس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ آلوسیؒ نے کہا ہے۔ اور اگر کہا جائے کہ قرآن کریم کا انداز عام مقامات میں یہ ہے کہ جب وہ کفار کے کسی منکر فعل کا ذکر کرتا ہے تو اس پر صراحۃً انکار کرتا ہے، اس آیت میں اس فعل پر انکار نہ کرنا شاید جواز کی طرف مشیر ہو۔ ہم کہتے ہیں کہ اول تو قرآن کریم کا جو اسلوب اوپر ذکر کیا گیا ہے اس کا عموم معلوم نہیں۔ علاوہ ازیں ضروری نہیں کہ انکار کی تصریح اسی موقع پر کر دی جائے بلکہ اس کی کسی آیت میں انکار کا پایا جانا کافی ہے۔ خواہ کسی دوسری جگہ ہو۔ بلکہ دلائل شرعیہ میں سے کسی دلیل میں انکار کا پایا جانا بھی کافی ہے۔ پس جب کہ صحیح بخاری میں عورت کی حکمرانی پر نکیر آ چکی ہے، تو اس فعل کے منکر ہونے کو بیان کرنے کے لئے کافی ہے جیسا کہ اس قسم کے مواقع میں نظر کرنا تمہاری رہنمائی کرے گا۔ یہ ہمارے شیخ (حضرت حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ) دامت عوارفہ، کا افادہ ہے۔ صحیح بخاری کی حدیث کی تائید تلخیص مستدرک کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔'' (یہ حدیث اوپر گزر چکی ہے)۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ سے استدلال

بعض حضرات نے عورت کی سربراہی کے مسئلہ پر جنگ جمل کے واقعہ سے استدلال کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جنگ جمل میں قیادت کی تھی۔ اور طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما جیسے جلیل القدر صحابہ نے ان کی قیادت کو تسلیم کیا تھا۔

واقعہ یہ تھا کہ حضرت ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو نہ اس موقع پر خلافت و امارت کا دعویٰ تھا نہ انہیں کسی مہم کے لئے کسی نے امیر منتخب کیا تھا، نہ اس کے سیاسی مقاصد تھے اور نہ وہ جنگ وقتال کے لئے نکلی تھیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مظلومانہ شہادت کے موقع پر وہ دیگر امہات المومنین کے ساتھ حج پر گئی ہوئی تھیں۔ اکابر صحابہ وہاں جمع ہوئے اور انہوں نے اصرار کیا کہ مادر مشفق کی حیثیت سے انہیں امت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو مجتمع کرنے اور ہولناک صورت حال کی اصلاح کرنے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہئے۔ کیونکہ ان کی لائق صد احترام شخصیت اس فتنہ کو فرو کرنے میں موثر کردار ادا کر سکتی ہے۔ اس وقت نہ حضرت ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی امارت کسی کے گوشہ ذہن میں تھی اور نہ کسی کو خیال تھا کہ انہیں حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ سے لڑا دیا جائے گا۔ چنانچہ بصرہ پہنچنے کے بعد جب قعقاع بن حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے تشریف آوری کا مقصد پوچھا تو انہوں نے فرمایا:

"ای بنی! لا صلاح بین الناس!"

بیٹا! میرے آنے کا مقصد لوگوں کے درمیان اصلاح کرانا ہے۔"

اور حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے ساتھ حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کی مصالحتی گفتگو میں "اصلاح بین الناس" کا نقشہ مرتب بھی کر لیا گیا تھا۔ لیکن مفسدوں کو اس میں اپنی موت نظر آئی اور انہوں نے ایک سوچی سمجھی سازش کے ذریعہ رات کی تاریکی میں حملہ کر دیا اس طرح اصلاح کی مخلصانہ کوشش "جنگ جمل" میں تبدیل کر دی گئی۔ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

"فان عائشہ لم تقاتل ولم تخرج لقتال وانما خرجت بقصد الاصلاح بین المسلمین وظنت ان فی خروجها مصلحة للمسلمین...... ولم یکن یوم الجمل لهولا قصد فی القتال، ولکن وقع الاقتتال بغیر اختیارهم، وانه لما تراسل علی وطلحة والزبیر وقصد والاتفاق علیٰ المصلحة، وانهم اذا تمکنوا طلبوا قتله عثمان اهل الفتنه...... فخشی القتله ان یتفق علی معهم علیٰ امساک القتله فحملوا علی عسکر طلحه

والزبير، فظن طلحه والزبير ان علياً حمل عليهم فحملوا دفعاً عن انفسهم فظن علی انهم حملوا علیه فحمل دفعاً عن نفسه فوقعت الفتنه بغير اختيارهم وعائشه راكبه، لاقاتلت ولاامرت بالقتال، هكذا ذكره غير واحد من اهل المعرفه بالاخبار." (منهاج السنه جلد ۲ ص ۱۸۵)

"کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے نہ قتال کیا اور نہ قتال کے لئے نکلی تھیں وہ تو اصلاح بین المسلمین کے قصد سے تشریف لائی تھیں۔ اور ان کا خیال تھا کہ ان کی تشریف آوری میں مسلمانوں کی مصلحت ہے...... اور جنگ جمل کے دن ان حضرات کا قتال کا قصد نہیں تھا لیکن ان کے اختیار کے بغیر قتال کی نوبت آئی۔ قصہ یہ ہوا کہ جب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حضرت طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما سے مراسلت ہوئی اور انہوں نے مصالحت پر اتفاق کرنے کا عزم کرلیا اور یہ طے ہوا کہ جب قدرت ہوگی حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قاتلین اہل فتنہ پر گرفت ہوسکے گی...... قاتلین عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ے لئے یہ خطرہ کی گھنٹی تھی کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ قاتلین عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر گرفت کرنے میں ان حضرات کے ساتھ متفق ہوجائیں...... چنانچہ انہوں نے حضرت طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما کے کیمپ پر شبخون مارا، طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما یہ سمجھے کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان پر حملہ کردیا ہے۔ انہوں نے مدافعانہ حملہ کیا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ سمجھے کہ ان لوگوں نے حملہ کیا ہے انہوں نے اپنی مدافعت میں جنگ شروع کردی۔ یوں ان کے اختیار کے بغیر یہ فتنہ برپا ہوکر رہا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا (ہودج میں) سوار تھیں، وہ نہ لڑیں نہ انہوں نے لڑنے کا حکم دیا۔ بہت سے مورخین نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔"

مسند الہند شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہ نے تحفہ اثنا عشریہ میں اس کو مفصل لکھا ہے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کے اصرار کو بیان کرتے ہوئے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وعائشہ رانیز باعث شدند کہ تارفع فتنہ وحصول امن ودرستی امور خلافت وملاقات ماہا خلیفہ وقت ہمراہ ماباش تاپاس ادب تو کہ مادر مسلمانی وحرم محترم رسول واز جملہ ازواج محبوب

ترومقبول بوده ایں اشقیا قصد مانکنند و مارا تلف نہ سازند، ناچار عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بقصد اصلاح وانتظام امور امت وحفظ جان چندے ازاکبراصحابہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہ ہم اقارب او بودند بسمت بصرہ حرکت فرمود۔" (تحفہ اثنا عشریہ ص ۳۴۴، مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور)

"ان حضرات نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے یہ بھی اصرار کیا کہ جب تک فتنہ نہیں اٹھ جاتا امن کامل نہیں ہوجاتا، امور خلافت درست نہیں ہوجاتے اور خلیفہ وقت سے ہماری ملاقات نہیں ہوجاتی، آپ بھی ہمارے ساتھ رہیں کیونکہ آپ مسلمانوں کی مادر مشفق ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائق صداحترام حرم ہیں۔ اورازواج مطہرات میں سب سے محبوب ومقبول تھیں، اس لئے آپ کے پاس ادب کے وجہ سے یہ اشقیاء ہمارا قصد نہیں کریں گے، ہمیں تلف نہیں کریں گے، لہٰذا حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے لوگوں کے درمیان صلح کرانے، امور امت کو نظم میں لانے اور چند اکابر صحابہ جو آپ کے عزیز بھی ہوتے تھے، ان کی جان کی حفاظت کی خاطر بصرہ کا رخ کیا۔"

الغرض حضرت ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا اس لشکر کی نہ امیر تھیں، نہ سپہ سالار، نہ ان کے سیاسی مقاصد تھے اور نہ حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ سے مقابلہ ومقاتلہ ان کا مقصود تھا۔ ان کو اکابر صحابہ نے مادر مشفق کی حیثیت سے اپنے ساتھ رہنے پر مجبور کیا تاکہ ان کی لائق صداحترام شخصیت کی وجہ سے اصلاح احوال میں سہولت ہو۔

اس کے باوجود ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اپنے فعل پر ندامت ہوئی۔ راستہ میں جب ایک مقام، ہواب، پر پہنچیں تو واپسی کا ارادہ فرمایا، لیکن اس میں کامیاب نہ ہوسکیں۔ قیس بن ابی حازم البجلی کا بیان ہے۔

"لمااقبلت عائشه فلما بلغت مياه بنى عامر ليلاً نبحت الكلاب، فقالت اى ماهذا؟ قالوا ماء الحواب، قالت ماظننى الا اننى راجعه قال بعض من كان معها: بل تقلمين فيراک المسلمون' فيصلح الله ذات بينهم، قالت ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال ذات يوم: "كيف باحداكن تنبح عليها كلاب الحواب." (سير اعلام النبلاء جلد: ص: ۱۷۷)

''حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جب مکہ سے بصرہ روانہ ہوئیں، دوران سفر جب رات کے وقت بنو عامر کی آبادی میں پہنچیں تو کتے بھونکے، دریافت فرمایا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ بتایا گیا کہ یہ حواب ہے فرمایا: میرا خیال ہے مجھے یہیں سے واپس لوٹنا ہے۔ آپ کے بعض ہمراہیوں نے کہا کہ نہیں آپ کو آگے چلنا چاہئے۔ آپ کو دیکھ کر مسلمان متفق ہو جائیں گے، اس طرح آپ کی برکت سے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی حالت کی اصلاح فرمادیں گے، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن فرمایا تھا ''تم (ازواج مطہرات) میں سے ایک کی کیا حالت ہوگی، جب کہ اس پر حواب کے کتے بھونکیں گے۔''

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

''حضرت عائشہ درین اصرار معذور بود زیرا کہ وقت خروج از مکہ نمید انست کہ درین راہ چشمہ حواب نام واقع خواہد شد و بر آن گزشتن لازم خواہد آمد و چون بر آن آب رسید و دانست ارادہ رجوع مصمم کرد لکن میسرش نشد زیرا کہ کسے از اہل لشکر ہمراہ اور رفاقت در رجوع نہ کرد و در حدیث نیز بعد از وقوع واقع ہیچ ارشاد نہ فرمودہ اند کہ چہ باید کرد ناچار بقصد اصلاح ذات البین کہ بلاشبہ مامور بہ ست پیشتر روانہ شد پس حالت حضرت عائشہ درین مرور حالات شخصی است کہ طفلے را از دور دید کہ میخواہد در چاہے بیفتد بے اختیار برائے خلاص کردن او دوید و در اثنائے دویدن بے خبر محاذی نماز گزارندہ مرور واقع شدہ او را در وقت محاذات اطلاع دست داد کہ من محاذی نماز گزارندہ ام پس اگر بر عقب میگردد آن طفل در چاہ می افتد ایں مرور واقع شدہ را تدارک نمیتواند شد ناچار قصد خلاصی طفل خواہد کرد این مرور را در حق خود معفو خواہد شناخت۔'' (تحفہ اثناء عشریہ، ص ۳۳۲)

''حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اس اصرار میں معذور تھیں کہ مکہ سے نکلتے وقت انہیں معلوم نہیں تھا کہ اس راستے میں حواب نامی چشمہ واقعہ ہوگا اور اس پر سے گزرنا پڑے گا، اور جب اس پر پہنچیں اور علم ہوا تو واپسی کا پختہ ارادہ کیا، لیکن واپسی میسر نہ آئی۔ کیونکہ اہل لشکر میں سے کسی نے رجوع میں ان کے ساتھ رفاقت نہیں کی اور حدیث (حواب) میں بھی کوئی ارشاد نہیں فرمایا گیا کہ واقعہ کے وقوع میں آنے کے بعد کیا کرنا چاہئے۔ اس لئے

ناچار اصلاح ذات البین کی غرض سے، جو بلاشبہ مامور بہ ہے، آگے روانہ ہوئیں۔ پس اس گزرنے میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حالت اس شخص کے مشابہ ہے کہ جس نے دور سے کسی بچے کو دیکھا کہ کنویں میں گرا چاہتا ہے، دیکھتے ہی اس کو بچانے کے لئے دوڑ پڑا، اور دوڑتے ہوئے بے خبری میں کسی نمازی کے سامنے سے مرور واقع ہوا اور عین سامنے آنے کے وقت معلوم ہوا کہ میں نمازی کے آگے سے گزر رہا ہوں۔ اب اگر پیچھے ہٹتا ہے تو وہ کنویں میں گر جائے گا، اور یہ جو نمازی کے سامنے آچکا ہے اس کا تدارک نہیں ہوسکتا، ناچار اس نے بچے کو بچانے کا قصد کیا، اور اس گزرنے کو اپنے حق میں لائق عفو سمجھا۔

بعد میں جب انہیں جنگ جمل کا واقعہ یاد آتا تو نہایت افسوس کرتیں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی لکھتے ہیں۔

''ہر گاہ یوم الجمل رایاد فرمود آن قدر میگریست کی معجر مبارکش باشک ترمی گشت بسبب آنکہ در خروج عجلت فرمود و ترک تامل نمود از پیشتر تحقیق نہ فرمود کہ آب حواب در راہ واقع است یانہ تا آنکہ این قسم واقعہ عظمی وداد۔'' (تحفہ اثنا عشریہ، ص: ۳۳۵)

''آپ جب یوم الجمل کو یاد کرتیں تو اتنا روتیں کہ آنچل مبارک آنسوؤں سے تر ہوجاتا کیونکہ اس کا سبب یہ تھا خروج میں عجلت فرمائی، تامل نہیں فرماسکیں اور پہلے سے تحقیق نہ فرمائی کہ آب حواب راہ میں واقع ہے یا نہیں یہاں تک کہ اس قسم کا واقعہ عظمی رونما ہوا۔''

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''ثم تبین لها فیما بعدان ترک الخروج کان اولی فکانت اذا ذکرت خروجها تبکی حتی تبل خمارها'' (منہاج السنۃ جلد ۲، ص ۱۸۵)

''پھر بعد میں ان کو ظاہر ہوا کہ ترک خروج بہتر تھا۔ چنانچہ جب اپنے خروج کو یاد کرتیں تو اس قدر روتیں کہ آنچل بھیگ جاتا۔''

علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

ولا ریب ان عائشة ندمت ندامه کلیته علی مسیرها الی البصرة وحضورها یوم الجمل، وما ظنت ان الامر یبلغ مایلغ.'' (سیر اعلام النبلاء جلد ۲، ص ۱۷۷)

''اس میں شک نہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بصرہ جانے اور جنگ جمل کے دن وہاں موجود ہونے پر کلی ندامت ہوئی انہیں یہ وہم وخیال بھی نہ تھا کہ معاملہ کی نوبت یہاں تک پہنچے گی۔''

اظہار ندامت کے طور پر فرماتی تھیں۔

"ودت انی کنت ثکلت عشرة مثل الحارث بن هشام وانی لم اسر مسیری مع ابن الزبیر." (مستدرک حاکم جلد ۳، ص ۱۱۹)

''میں آرزو کرتی ہوں کہ میرے حارث بن ہشام جیسے دس لائق بیٹے پیدا ہوکر مر گئے ہوتے اور میں ابن زبیر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے ساتھ (بصرہ) نہ جاتی۔''

کبھی فرماتی تھیں۔

"ودت انی جلست کما جلس غیری فکان احب الی من اکون ولدت من رسول الله صلی الله علیه وسلم عشرة کلهم مثل عبد الرحمن بن الحارث بن هشام." (فتح الباری جلد۱۳، ص ۵۵) قال الحافظ اخرجه الطبرانی وفیه ابو معشر نجیح المدنی، وفیه ضعف، وقال الهیثمی رواه الطبرانی وفیه ابو معشر نجیح وهو ضعیف، یکتب حدیثه، وبقیة رجاله ثقات، مجمع الزوائد جلد ۷، ص ۲۳۸)

''میں آرزو کرتی ہوں کہ میں گھر میں بیٹھی رہتی جیسا کہ دوسری ازواج مطہرات بیٹھی رہیں تو یہ بات مجھے اس سے زیادہ محبوب تھی کہ میرے بطن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دس بیٹے پیدا ہوتے اور وہ سب عبدالرحمٰن بن حارث جیسے بیٹے ہوتے۔''

اور کبھی فرماتی:۔"ودت انی کنت غصناً رطباً ولم اسر مسیری هذا."

(ازالۃ الخفاء جلد۲، ص۲۸۰۔ مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور)

''میں آرزو کرتی ہوں کہ اے کاش میں ہری شاخ ہوتی اور اس سفر پر نہ نکلتی۔'' اسی طرح متعدد صحابہ کرام نے بھی ان کے خروج پر نکیر فرمائی (جس کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔)

اب انصاف فرمائیے کہ جس واقعہ میں حضرت ام المومنین اور ان کے رفقاء (رضی اللہ

عنہم) کے ذہن میں حکومت وامارت کا کوئی تصور ہی نہیں تھا بلکہ ام المومنین امت کی ماں کی حیثیت سے امت کے درمیان جوڑ پیدا کرنے نکلی تھیں۔ جس واقعہ پر اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم نے نکیر فرمائی اور جس پر خود حضرت ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے افسوس اور ندامت کا اظہار فرمایا، کیا اس کو ''حکومت کے لئے عورت کی سربراہی'' کے جواز کی دلیل بنانا صحیح ہے؟

اور یہاں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ اس پورے سفر میں حضرت ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہودج، میں پردہ نشین رہیں، اور آپ کے محارم آپ کے ساتھ رہے۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں ایک عجیب واقعہ لکھا ہے کہ جنگ جمل کے اختتام کے بعد اعیان و اشرف حضرت ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں اسلام کے لئے حاضر ہو رہے تھے ایک شخص نے ہودج کے اندر جھانکا، حضرت ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ارشاد فرمایا:۔

"الیک لعنک اللہ، ھتک اللہ سترک، وقطع یدک وابدی عورتک."

''پرے ہٹ، اللہ تجھ پر لعنت کرے، تیرا پردہ فاش کرے، تیرے ہاتھ کاٹ ڈالے اور تیرے ستر کو عریاں کرے۔''

یہ شخص بصرہ میں قتل ہوا، اس کے بعد اس کے ہاتھ کاٹے گئے اور اس کی برہنہ لاش ویرانے میں ڈال دی گئی۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۷، ص ۲۴۵)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہ پورا سفر اپنے محرموں کی معیت میں ہودج کے اندر ہوا اور اس ہولناک جنگ میں بھی وہ اپنے ہودج کے اندر پردہ نشین رہیں۔ کسی کو ان کے ہودج کے اندر جھانکنے کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ اور یہ بھی ذہن میں رہنا چاہئے کہ آپ کے گرد کا پورا مجمع کیا موافق اور کیا مخالف آپ کو ماں سمجھتا تھا۔ آپ کو اسی احترام وتقدس کا مستحق سمجھتا تھا جو نیک اولاد کے دل میں سگی ماں کا ہوتا ہے۔

ایک طرف اس پورے پس منظر کو ذہن میں رکھئے۔ دوسری طرف دور حاضر کی ان خواتین کے حالات پر غور کیجئے جن کی تعلیم وتربیت اور ذہنی تخلیق مغربی یونیورسٹیوں کی آزاد فضاؤں میں ہوتی ہے جو کسی پردے وردے کی قائل نہیں، جو گھر کی چاردیواری کو جیل سے تشبیہ دیتی ہیں اور چادر اور دوپٹے کو طوق وسلاسل تصور کرتی ہیں جن کے نزدیک محرم ونامحرم

کا امتیاز دقیانوسیت کی علامت ہے۔ اور جلوت وخلوت میں مردوں کے شانہ بشانہ چلنے پر فخر کرتی ہیں کیا ان خواتین کے لئے حضرت ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی مثال پیش کرنا عقل ودانش اور حق وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے؟

رضیہ سلطانہ، چاند بی بی اور بھوپال کی بیگمات

بعض حضرات عورت کی سربراہی کا جواز پیش کرنے کے لئے التمش کی بیٹی رضیہ سلطانہ، بیجاپور کے حکمران کی بیوہ چاند بی بی اور بیگمات بھوپال کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ مگر اہل فہم پر روشن ہے کہ کتاب وسنت اور اجماع امت کے مقابلے میں ان مثالوں کی کیا قیمت اور حیثیت ہے، مسلمانوں میں دین اسلام کے خلاف سیکڑوں منکرات وبدعات رائج ہیں زنا، چوری، شراب نوشی، سود وقمار اور رشوت جیسے کبائر تک میں لوگ مبتلا ہیں، مگر مسلمانوں میں ان چیزوں کے رواج ہو جانے کو ان کے جواز واباحت کی دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح اگر عورت کی حکمرانی کے شاذ ونادر واقعات پیش آئے ہیں تو انہیں قرآن وسنت اور اجماع امت کے خلاف ہونے کی وجہ سے بدعت سیئہ کہا جائے گا۔ ان واقعات کو عورت کی حکمرانی کے جواز میں پیش کرنا اہل عقل وفہم سے نہایت بعید ہے۔

چونکہ عورت کی سربراہی انسانی ونسوانی فطرت کے خلاف ہے اس لئے میں نے ان واقعات کو ان عجیب الخلقت بچوں کے ساتھ تشبیہ دی تھی جو کبھی مادہ فطرت کے نقص کی وجہ سے جنم لیتے ہیں، یا ان کی مثال ان پھوڑے پھنسیوں کی ہے جو فساد خون کی علامت کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔

ان واقعات پر غور کرتے ہوئے اہل فہم کو یہ نکتہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ خواتین کی حکمرانی کے یہ واقعات نظام شہنشاہیت کے شاخسانے تھے۔ مثلاً بتایا جاتا ہے کہ سلطان التمش کا لڑکا فیروز نالائق تھا اور اس کی بیٹی رضیہ بڑی لائق وفائق تھی۔ اس لئے سلطان نے اپنے بیٹے کے بجائے بیٹی کو تخت کی وارث بنا دیا۔ یہی صورت بیجاپور اور بھوپال کی ریاستوں میں بھی پیش آئی کہ تخت کا وارث کوئی مرد نہیں رہا تھا۔ اس لئے ان خواتین کو اس وراثت کی ذمہ داری قبول کرنا پڑی۔

کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ایک طرف پرستاران جمہوریت اٹھتے بیٹھتے شہنشاہیت کے سب وشتم کا وظیفہ پڑھتے ہیں، دوسری طرف اسی شہنشاہیت کی نہایت مکروہ اور بگڑی ہوئی

شکل کو بطور معیار پیش کر کے اس سے عورت کی حکمرانی کے جواز پر استدلال کیا جاتا ہے۔

اب دیکھئے کہ التمش کے تخت کا وارث نالائق تھا اس لئے بامر مجبوری اس نے اپنی بیٹی کو تخت کی وارث بنا دیا۔ کیا پاکستان کے حالات پر اس واقعہ کو چسپاں کرتے ہوئے ہم دنیا کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ پاکستان کے تمام مرد نالائق تھے اس لئے شہنشاہ پاکستان کو بیٹی کو پاکستان کے تخت کی وارث بنایا گیا؟

بیجاپور اور بھوپال کی ریاستوں میں شاہی خاندانوں میں کوئی مرد باقی نہیں رہا تھا اس لئے مجبوراً بے چاری خواتین کو ریاست کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لینا پڑا۔ کیا پاکستان کے حالات پر ان کی مثال چسپاں کرنے کے یہ معنی نہیں کہ اس ملک کے سارے مرد مر چکے ہیں اس لئے دختر پاکستان کو حکومت کی گدی پر بیٹھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ کہتے ہیں کہ ''غرض آدمی کی بصیرت کو اندھا کر دیتی ہے'' جو حضرات عورت کی حکمرانی کا جواز اس قسم کے واقعات میں تلاش کرتے ہیں۔ ان پر یہ مثال پوری طرح صادق آتی ہے۔

مس فاطمہ جناح

بعض حضرات عورت کی سربراہی پر یہ استدلال کرتے ہیں کہ صدر ایوب خان کے مقابلہ میں مس فاطمہ جناح کو صدارت کے لئے نامزد کیا گیا تھا اور بڑے بڑے علماء نے اس کی تائید کی تھی اس وقت یہ فتوے کہاں چلے گئے تھے؟

لیکن یہ صریح مغالطہ ہے اس لئے کہ علمائے امت اور اہل فتویٰ نے اس وقت بھی کھل کر مخالفت کی تھی کسی ایک مفتی کا نام بھی پیش نہیں کیا جا سکتا جس نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہو (اور جو شخص اجماع امت کے خلاف فتویٰ دینے کی جرأت کرے اس کو مفتی کہنا ہی غلط ہے) چنانچہ مولانا مفتی محمودؒ نے اسی بنا پر نہ ایوب خان کے حق میں ووٹ دیا اور نہ فاطمہ جناح کو انہوں نے اپنا ووٹ ہی استعمال نہیں کیا۔

اور جن سیاسی یا نیم مذہبی و نیم سیاسی تنظیموں نے محض سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر اس منصب کے لئے مس فاطمہ جناح کا انتخاب کیا تھا وہ بھی ان کی سیاسی مجبوری تھی۔ ان کے خیال میں پاکستان میں وہ واحد شخصیت تھی جو ایوب خان کا مقابلہ کر سکتی تھی اور مس فاطمہ جناح نے

ان لوگوں سے صاف کہہ دیا تھا کہ ایوب خان کے ہٹائے جانے کے بعد ان کو تین مہینے میں اپنا صدر کوئی دوسرا منتخب کرنا ہوگا۔ الغرض اہل فتویٰ کے نزدیک تو مس فاطمہ جناح کی نامزدگی بھی خلاف شرع اور ناجائز تھی۔ اور اہل سیاست کے نزدیک یہ بھی اسی طرح کی اضطراری کیفیت تھی، جس طرح اضطراری کیفیت متذکرہ بالا خواتین کے شاہی خاندانوں کو پیش آئی۔

حضرت تھانویؒ کا فتویٰ

بعض حضرات، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ایک فتویٰ کا حوالہ دیتے ہیں جو ...... امداد الفتاویٰ (جلد ۵، ص ۹۹ - ۱۰۰) میں شامل ہے۔ اس فتویٰ سے ان حضرات کا استدلال کہاں تک صحیح ہے؟ اس پر غور کرنے کے لئے چند امور کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

اول یہ کہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ امت کے اس اجماعی فیصلے کے ساتھ پوری طرح متفق ہیں کہ اسلام میں عورت کو سربراہ حکومت بنانا جائز نہیں، چنانچہ تفسیر بیان القرآن میں تحریر فرماتے ہیں:

۱:۔ "اور ہماری شریعت میں عورت کو بادشاہ بنانے کی ممانعت ہے۔ پس بلقیس کے قصہ سے کوئی شبہ نہ کرے۔ اول تو یہ فعل مشرکین کا تھا۔ دوسرے اگر شریعت سلیمانیہ نے اس کی تقریر بھی کی ہو تو شرع محمدی میں اس کے خلاف ہوتے ہوئے وہ حجت نہیں۔" (بیان القرآن جلد ۸، ص ۸۵)

۲:۔ اوپر حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی کتاب احکام القرآن کا حوالہ آچکا ہے، جو حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے زیر اشراف لکھی گئی اور جس میں خود حضرتؒ ہی کے حوالے سے ذکر کیا گیا ہے کہ عورت کا سربراہ مملکت بنانا جائز نہیں اور بلقیس کے قصہ سے اس کے جواز پر استدلال کرنا غلط ہے۔

۳:۔ اور خود اسی فتویٰ میں، جس کو عورت کی سربراہی کے لئے پیش کیا جاتا ہے حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں:

"حضرات فقہاء نے امامت کبریٰ میں ذکورۃ (مرد ہونے) کو شرط صحت اور قضا میں گو شرط صحت نہیں، مگر شرط صون عن الاثم فرمایا ہے۔" (امداد الفتاویٰ جلد ۵، ص ۱۰۰)

۴:۔اوپر شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی کی کتاب احکام القرآن کا حوالہ بھی گزر چکا ہے جس میں امامت کبریٰ وصغریٰ کو مرد کی خصوصیت قرار دیا گیا ہے،احکام القرآن کا یہ حصہ بھی حضرت حکیم الامتؒ کی نگرانی میں مرتب ہوا۔

ان حوالہ جات سے واضح ہے کہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے نزدیک بھی یہ اصول مسلم ہے کہ کسی اسلامی مملکت میں حکومت کی سربراہ عورت نہیں ہوسکتی۔

دوم:۔حضرت نے جس سوال کے جواب میں یہ فتویٰ تحریر فرمایا اس کا پس منظر پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے،صورت حال یہ تھی کہ انگریزوں کے ہندوستان پر تسلط کے بعد بعض موروثی ریاستوں کو برقرار رکھا گیا تھا۔اور ان کی حیثیت نیم خودمختار ریاستوں کی تھی۔ان میں بعض مسلم ریاستیں ایسی تھیں جن میں پردہ نشین خواتین کے سوا کوئی قانونی وارث باقی نہیں رہا تھا۔اب دو صورتیں ممکن تھیں،ایک کہ یہ پردہ نشین خواتین کو (جنہیں انگریزی قانون ریاست کی قانونی وارث سمجھتا تھا) والی ریاست تسلیم نہ کیا جاتا۔اس صورت میں ان ریاستوں کی نیم آزادانہ حیثیت ختم ہوجاتی۔اور یہ انگریزی قلمرو میں مدغم ہوجاتیں،ظاہر ہے کہ یہ ضرر عظیم تھا۔ اور دوسری صورت یہ تھی کہ محض مشیر کی حیثیت سے ان خواتین کو والی ریاست تسلیم کیا جاتا اور ریاست کا انتظام وانصرام ان خواتین کے مشورہ سے مردوں کے ہاتھ میں دے دیا جاتا۔ان ریاستوں میں عملاً یہی صورت اختیار کی گئی تھی اور سوال کرنے والے نے اسی صورت کے بارے میں سوال کیا تھا کہ آیا یہ ریاستیں اس حدیث کا مصداق ہیں یا نہیں؟

سوم:۔اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے حضرتؒ کے فتویٰ پر غور کیجئے۔حضرت لکھتے ہیں:

”حکومت کی تین قسمیں ہیں،ایک قسم وہ جو تام بھی ہو،عام بھی ہو۔تام سے مراد یہ کہ حاکم بانفرادہ خودمختار ہو یعنی اس کی حکومت شخصی ہو اور اس کے حکم میں کسی حاکم کی منظوری کی ضرورت نہ ہو،گو اس کا حاکم ہونا اس پر موقوف ہو۔اور عام یہ کہ اس کی محکوم کوئی محدود وقلیل جماعت نہ ہو۔

دوسری قسم وہ جو تام تو ہو مگر عام نہ ہو،تیسری قسم وہ جو عام ہو مگر تام نہ ہو......مثال اول کی کسی عورت کی سلطنت یا ریاست بطرز مذکور شخصی ہو۔مثال ثانی کی کوئی عورت کسی مختصر جماعت کی منتظم بلاشرکت ہو۔مثال ثالث کی۔کسی عورت کی سلطنت جمہوری ہو کہ اس میں والی صوری

درحقیقت والی نہیں بلکہ ایک رکن مشورہ ہے اور والی حقیقی مجموعہ مشیروں کا ہے، حدیث کے الفاظ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد حدیث میں پہلی قسم ہے۔'' (امدادالفتاویٰ جلد۵ ص ۹۹)

حضرت کی اس تحریر سے واضح ہے کہ صرف ایسی ریاستیں حدیث مذکور کی وعید سے مستثنیٰ ہیں جن میں والی ریاست خواتین کی حیثیت محض مشیر یا رکن مشورہ کی ہو اور احکام کے نفاذ کے اختیارات ان کے ہاتھ میں نہ ہوں۔ چنانچہ اس کی وجہ ذکر کرتے ہوئے حضرت تحریر فرماتے ہیں۔

''اور راز اس میں یہ ہے کہ حقیقت اس حکومت کی محض مشورہ ہے، اور عورت اہل ہے مشورہ کی۔'' (ص ۱۰۰)

اب دیکھنا یہ ہے کہ پاکستان میں وزارت عظمیٰ کا جلیل القدر منصب محض مشیر یا رکن مشورہ کی حیثیت رکھتا ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے (اور یقیناً نفی میں ہے) تو حضرتؒ کی تحریر سے استدلال کرنے والے حضرات خود ہی انصاف فرمائیں کہ ان کا استدلال کہاں تک صحیح ہے؟

پاکستان میں جو پارلیمانی نظام نافذ ہے اس میں وزیر اعظم کا منصب بے اختیار قسم کا محض علامتی منصب نہیں بلکہ وزیر اعظم ملک کی حکومت اور انتظامیہ کا بااقتدار و خود مختار سربراہ ہے آئین و قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے ملکی نظم و نسق پر اس کو مکمل کنٹرول حاصل ہے، وہ اپنی کابینہ کی تشکیل میں آزاد و خود مختار ہے، اور تمام شعبوں اور وزارتوں کی کارکردگی کا ذمہ دار ہے، وہ اپنی کابینہ سے مشورہ ضرور کرتا ہے لیکن کسی مشورے کا پابند نہیں وہ جس وزیر یا مشیر کو جس وقت چاہے اس کے منصب سے فارغ کرسکتا ہے۔ اس لئے اس کے تمام وزراء اور مشیران اس کی رائے اور خواہش کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کرسکتے۔ بلکہ اپنی ہر حرکت و عمل میں وزیر اعظم کے اشارہ چشم و ابرو پر نظریں جمائے رکھتے ہیں اور وہ کسی ایسے اقدام کی جرأت نہیں کرسکتے جس سے وزیر اعظم کے نازک مزاج شاہی کو خدانخواستہ گرانی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ عرف عام میں یہی سمجھا جاتا ہے کہ ملک میں وزیر اعظم کی حکومت ہے اور کہا جاتا ہے کہ فلاں وزیر اعظم کے دور حکومت میں یہ ہوا۔

جہاں تک قانون سازی کا تعلق ہے، سب جانتے ہیں کہ وزیر اعظم قانون ساز ادارے میں اکثریتی پارٹی کا لیڈر اور قائد ایوان کہلاتا ہے۔ وہ بڑی آسانی سے اپنی رائے اور خواہش کو

قانون کی شکل دے کر قانون ساز ادارے سے منظور کرالیتا ہے۔ اپنی پارٹی کے ارکان پر اسے اعتماد واطمینان ہوتا ہے کہ وہ اس کی مخالفت نہیں کریں گے۔ لیکن اگر کبھی اس قسم کا اندیشہ لاحق ہوتو اپنی پارٹی کے نام خاص ہدایت حکم جاری کرسکتا ہے اوراس ہدایت کے جاری ہونے کے بعد پارٹی کے کسی رکن کووزیراعظم کی خواہش کے خلاف چوں کرنے کی گنجائش نہیں رہتی۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ مثال ہندوؤں میں مسلم پرسنل لاء (مسلمانوں کے عائلی قوانین) کے معاملے میں پیش آئی۔ اس کی تفصیلات مولانا ابوالحسن علی ندوی کی خودنوشت سوانح کاروان زندگی حصہ سوم باب چہارم میں ملاحظہ کی جائیں۔ مختصر یہ کہ مسلمانوں کی تحریک اور انتھک محنت وکوشش کے نتیجہ میں وزیراعظم راجیو گاندھی کواس پر آمادہ کرلیا گیا کہ حکومت ان قوانین کو بل کی شکل میں اسمبلی سے منظور کرائے گی اسمبلی میں بل پیش ہونے کا مرحلہ آیا تو چونکہ ہندوستان کا متعصب پریس اس بل کے خلاف زہر اگل رہا تھا اور اسمبلی کے اندر بھی مسلمانوں کے خلاف تعصب کی فضا تھی۔ اس لئے شدید خطرہ تھا کہ ہندو اور نام نہاد مسلمان اس بل کی مخالفت کریں گے۔

مولانا ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں: "وزیراعظم نے وہپ، حکم جاری کردیا کہ پارٹی کے ہر ممبر کو اس کی تائید کرنی ہے۔ مخالفت کی صورت میں وہ پارٹی سے نکال دیا جائے گا۔ اگر بلا عذر کوئی ممبر اس دن شریک اجلاس نہیں ہوا، تو وہ بھی خارج کردیا جائے گا۔ (کاروان زندگی جلد۳ ص ۱۴۱)

وزیراعظم کے اس وہپ کا نتیجہ یہ ہوا کہ بل پر بحث وتمحیص کے بعد:

"رات پونے تین بجے بل پر ووٹنگ عمل میں آئی اور بل کی مخالفت میں ۵۴ ووٹوں کے مقابلہ میں بل کی حمایت میں ۳۷۲ ووٹ آئے بل کی کامیابی پر تھکے ہوئے کانگریسی ممبران پارلیمنٹ نے اپنی خوشی کا اظہار کیا، دوسری طرف اپوزیشن کے بل مخالف ممبران تھکے تھکائے ہال سے باہر جارہے تھے۔" (ایضاً ص ۱۴۷)

صحیح ہے کہ اسمبلی میں حزب اختلاف بھی موجود ہوتی ہے۔ اور وہ اقتدار کے مست ہاتھی کو قابو رکھنے میں مؤثر کردار ادا کرتی ہے لیکن اکثر وبیشتر ہوتا یہ ہے کہ حزب اختلاف کی دھواں دھار تقریروں اور تمام تر شوروغوغا کے باوجود وزیراعظم اپنی اکثریت کے نشہ میں

حزب اختلاف کو خاطر میں نہیں لاتا اور وہ اپنی اکثریت کے بل بوتے پر جو قانون چاہتا ہے، منظور کرالیتا ہے دور کیوں جایئے حزب اختلاف کے لائق صد احترام قائد کو ایوان سے باہر پھنکوا کر من مانے قانون منظور کرانے کا تماشا تو خود ہمارے ملک میں دکھایا جا چکا ہے۔

خلاصہ یہ کہ جمہوری حکومت میں وزیر اعظم کوئی بے اختیار نمائشی بت نہیں ہوتا بلکہ با اختیار صاحب حکومت انتظامیہ کا حاکم اعلیٰ اور پورے ملک کا بادشاہ شمار ہوتا ہے۔ اور قانون سازی کے دائرے میں بھی وہ قریب قریب مطلق العنان ہوتا ہے۔ اکثریتی پارٹی کا لیڈر ہونے کی وجہ سے جو قانون چاہے نافذ کر سکتا ہے۔ اور اگر اسے ایوان میں دو تہائی اکثریت کی حمایت حاصل ہو تو آئین کا تیا پانچہ بھی کر سکتا ہے)۔

ان حقائق کو سامنے رکھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ وزیر اعظم کا منصب محض والی صوری کا منصب ہے اس لئے حضرت تھانویؒ کے اس فتویٰ کا اطلاق اس پر بھی ہوتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

''والی صوری در حقیقت والی نہیں، بلکہ ایک رکن مشورہ ہے۔'' اور یہ کہ:

''راز اس میں یہ ہے کہ حقیقت اس حکومت کی محض مشورہ اور عورت اہل ہے مشورہ کی۔''

جن حضرات نے عورت کی وزارت عظمیٰ کے لئے حضرت تھانوی کے اس فتوے سے استدلال کی کوشش کی ہے ان کی خدمت میں اس کے سوا اور کیا عرض کیا جا سکتا ہے کہ:

سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجا است

کیا عورت قاضی بن سکتی ہے؟

بعض حضرات نے یہ استدلال فرمایا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک عورت قاضی بن سکتی ہے تو وزیر اعظم کیوں نہیں بن سکتی؟

ان حضرات کی خدمت میں گزارش ہے کہ استدلال میں دو غلطیاں ہیں ایک یہ کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے جو منقول ہے کہ حدود و قصاص کے علاوہ باقی امور میں عورت کا قاضی بننا صحیح ہے، اس کے یہ معنی نہیں کہ عورت کو عہدہ قضا پر مقرر کرنا بھی جائز ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ عورت چونکہ اہل شہادت ہے اور اسے فی الجملہ ولایت حاصل ہے۔ اس لئے اگر بالفرض اس کو قاضی بنا دیا جائے تو یا دو فریق کسی قضیہ میں اس کو حکم مان لیں تو حدود و

قصاص کے علاوہ دیگر امور میں اس کا فیصلہ نافذ ہوجائے گا۔ بشرطیکہ فیصلہ شریعت کے موافق ہو۔ یہ مطلب نہیں کہ عورت کو قاضی بنانا بھی جائز ہے نہیں بلکہ اگر کسی جگہ عورت کو قاضی بنایا جاتا ہے تو بنانے والے بھی گنہ گار ہوں گے اور منصب قضا کو قبول کرنے والی بھی گنہ گار ہوگی۔ چنانچہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی عبارت اوپر گزر چکی ہے کہ:

''حضرات فقہا نے امامت کبری ذکورۃ (مردہ ہونے (کو شرط صحت اور قضا میں گو شرط صحت نہیں مگر شرط صون عن الاثم فرمایا ہے۔'' (امداد الفتاوی جلد۵ ص۱۰۰)

حضرت حکیم الامت کے ان الفاظ سے معلوم ہوا کہ عورت کو قاضی بنانا فقہائے احناف کے نزدیک بھی گناہ ہے مگر اس کے قاضی بنادیئے جانے کے بعد اس کا فیصلہ غیر حدود قصاص میں نافذ ہوجائے گا ابوبکر بن العربی المالکی نے بھی حضرت امام کے قول کی یہی توجیہ کی ہے وہ لکھتے ہیں۔

"ونقل عن محمد بن جرير الطبرى امام الدين انه يجوز ان تكون المراة قاضية ولم يصح ذالک عنه، ولعله كما نقل عن ابى حنيفه انها انما تقضى فيما تشهدفيه. وليس ان تكون قاضية على الاطلاق ولا بان يكتب لها منشور بان فلانة مقدمة على الحكم، الا فى الدماء والنكاح وانما ذالک كسبيل التحكيم اوالاستبانة فى القضية والواحدة بدليل قوله صلى الله عليه وسلم "لن يفلح قوم ولوا امرهم امراة." وهذا هواالظن بابى حنيفة وابن جرير." (احكام القرآن جلد ۳ ص ۱۵۷)

''امام محمد بن جریر طبری سے نقل کیا گیا ہے کہ عورت کا قاضی ہونا صحیح ہے مگر یہ نقل صحیح نہیں، شاید یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ امام ابوحنیفہ سے نقل کیا گیا ہے کہ عورت جن امور میں شہادت دے سکتی ہے، ان میں فیصلہ بھی کرسکتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ علی الطلاق قاضی بن جائے، یا یہ کہ اس کے نام پروانہ جاری کردیا جائے کہ فلانی عورت کو غیر حدود نکاح میں منصب عدالت پر مقرر کیا جاتا ہے۔ عورت کے فیصلہ کے صحیح ہونے کی بس یہی صورت ہوسکتی ہے کہ کسی معاملہ میں دو فریق اس کو حکم بنالیں یا کبھی کسی قضیہ میں اس کو نائب بنادیا جائے کیونکہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جس نے امر حکومت عورت کے سپرد کر دیا۔'' امام ابو حنیفہ اور امام ابن جریر کے بارے میں یہی گمان کیا جا سکتا ہے۔

حضرت امام کے قول کی قریباً یہی توجیہ شیخ ابو حیان نے البحر المحیط (۷۔۶۷) میں کی ہے جسے صاحب روح المعانی نے بھی نقل کیا ہے۔ (روح المعانی جلد ۱۹ ص ۱۸۹۔۱۹۰)

درمختار میں ہے۔

''والمراة تقضی فی غیر حدوقودوان اثم المولی لها، لخبر البخاری لن یفلح قوم ولوا امرهم امراة.'' (ردالمختار جلد ۵ ص ۴۴۰)

''اور عورت غیر حدود قصاص میں فیصلہ کر سکتی ہے اگرچہ عورت کو قاضی بنانے والا گنہگار ہوگا کیونکہ بخاری شریف کی حدیث میں ہے وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جس نے عورت کو اپنے معاملات سپرد کر دیے۔''

علامہ ابن ہمام فتح القدیر میں لکھتے ہیں:

''قوله ''ویجوز قضاء المراة فی کل شی الافی الحدود و القصاص. وقال الائمة الثلاثة لایجوز. لان المراة ناقصة العقل. لیست اهلا للخوصومة مع الرجال فی محافل الخصوم. قال صلی الله علیه وسلم لن یفلح قوم ولوا امرهم امراة رواه البخاری...... والجواب ان ماذکر غایته مایفید منع ان تستقضی وعدم حله، والکلام فیما لوولیت واثم المقلد بذالک او حکمها خصمان فقضت قضاء موافقا لدین الله اکان ینفذام لا؟ لم ینتهض الدلیل علی نفیه بعد موافقته ما انزل الله. الا ان یثبت شرعاً سلب اهلیتها. ولیس فی الشرع سوی نقصان عقلها ومعلوم انه لم یصل الی حد سلب ولا یتها بالکلیة. الاتری انها تصلح شاهدة وانظرة فی الاوقاف، ووصیته علی الیتامی. وذالک النقصان بالنسبة والاضافةً ثم هو منسوب الی الجنس، فجاز فی الفرد خلافه. الاتری الی تصریحهم بصدق قولنا:

"الرجل خیر من المراۃ." مع جواز کون بعض افراد النساء خیر امن بعض افراد الرجال. ولذالک النقص العزیزی نسب صلی اللہ علیہ وسلم لمن یلیھن عدم الفلاح فکان الحدیث متعرضاً للمولین ولھن. بنقص الحال. وھذا حق. لکن الکلام فیما لوولیت فقضت بالحق لماذا یبطل ذالک الحق." (فتح القدیر جلد ۵ ص ۴۸۶)

مصنف فرماتے ہیں کہ "عورت کی قضا ہر چیز میں صحیح ہے، مگر حدود و قصاص میں نہیں۔" اور ائمہ ثلاثہ (امام مالک، امام شافعی امام احمد رحمہم اللہ) فرماتے ہیں کہ صحیح نہیں۔ کیونکہ عورت ناقص العقل ہے۔ وہ خصوم کی محفلوں میں مردوں کے ساتھ خصومیت کی اہل نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جس نے اپنے معاملات عورت کے سپرد کر دیئے۔ (صحیح بخاری)......اور جواب یہ ہے کہ جو دلائل ذکر کئے گئے ہیں ان سے زیادہ سے زیادہ جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ عورت کو قاضی بنانا ممنوع ہے حلال نہیں اور ہماری گفتگو اس صورت میں ہے کہ اگر عورت کو قاضی بنا دیا گیا اور بنانے والا گنہ گار ہوا ہو یا دو فریقوں نے اسے حکم بنا لیا اور عورت نے ایسا فیصلہ کر دیا جو دین خداوندی کے عین مطابق ہے تو کیا اس کا یہ فیصلہ نافذ ہو گا یا نہیں اس کی نفی پر کوئی دلیل قائم نہیں ہوئی جب کہ وہ فیصلہ ما انزل اللہ کے موافق بھی ہے اور یہ فیصلہ کا عدم نفاذ اس کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتا کہ ثابت ہو جائے کہ شرعاً اس کی اہلیت مسلوب ہے اور شرع میں صرف عورت کا ناقص العقل ہونا ثابت ہے اور سب جانتے ہیں کہ اس کا نقصان عقل اس حد تک نہیں کہ اس کی ولایت کو کلی طور پر سلب کر لے دیکھتے نہیں ہو کہ عورت گواہ بن سکتی ہے اوقاف کی نگران بن سکتی ہے، اور یتیم کی وصی بن سکتی ہے عورت کا ناقص ہونا مردوں کی نسبت سے ہے پھر یہ نقصان عقل منسوب ہے جنس کی طرف لہٰذا کسی فرد میں اس کے خلاف بھی ہو سکتا ہے کیا دیکھتے نہیں کہ اس مقولہ کو بالکل سچا سمجھا گیا ہے کہ "مرد عورت سے بہتر ہے" حالانکہ بعض عورتیں بعض مردوں سے بہتر ہو سکتی ہیں اور عورتوں کے اس فطری اور خلقی نقص کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عدم فلاح کو ان لوگوں کی طرف منسوب کیا ہے جو ان کو والی بنائیں پس حدیث نے ان والی بنانے

والوں کے حق میں عدم فلاح کا اور عورتوں کے حق میں نقص حال کا یہ فیصلہ فرمایا ہے کہ یہ فیصلہ برحق ہے لیکن اس میں ہماری گفتگو نہیں بلکہ گفتگو اس صورت میں ہے کہ عورت کو قاضی بنادیا گیا ہو پھر وہ حق کے مطابق فیصلہ کرے تو یہ حق باطل کیوں ہو جائے گا۔"

اکابر کی ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک بھی عورت کو قاضی بنانا جائز نہیں بلکہ حرام ہے اور ایسا کرنے والے گنہگار ہیں مگر چونکہ عورت اہل شہادت ہے اس لئے اگر اس نے فیصلہ کر دیا بشرطیکہ وہ فیصلہ شریعت کے موافق ہو تو نافذ ہو جائے گا۔

ان حضرات کے استدلال میں دوسری غلطی یہ ہے کہ انہوں نے قیاس کر لیا کہ عورت جب قاضی بن سکتی ہے تو حکمران بھی بن سکتی ہے حالانکہ اول تو یہ قیاس قرآن وسنت اور اجماع امت کے خلاف ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔ علاوہ ازیں ملک کی حکمرانی کے لئے ولایت مطلقہ شرط ہے جو عورت میں بوجہ نقصان عقل و دین کے نہیں پائی جاتی جب کہ قضا کے لئے صرف اہل شہادت ہونا شرط ہے۔ اس لئے امامت کبریٰ کو قضا پر قیاس کرنا غلط ہے۔ خلاصہ یہ کہ عورت کو وزیر اعظم کے منصب پر قائم کرنا صحیح نہیں۔ بلکہ اس کا عزل واجب ہے۔

سانپ گزر چکا ہے لکیر پیٹنے سے فائدہ؟

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ سانپ گزر چکا ہے، اب لکیر پیٹنے سے فائدہ؟ جو ہونا تھا، سو ہو چکا، اچھا ہوا یا برا ہوا اب علمائے کرام کا واویلا بعد از وقت ہے۔

ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ اہل علم پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دین کا صحیح مسئلہ لوگوں کو بتاتے رہیں، اور اگر کوئی غلط اور منکر رواج پائے تو اپنے امکان کی حد تک اس کے خلاف جہاد کریں۔ اور قوم کو اصلاح کی طرف متوجہ کریں کسی منکر کو دیکھ کر اس پر سکوت اختیار کر لینا ان کے لئے جائز نہیں۔ بلکہ اصول یہ ہے کہ جب دین کی ایک مسلمہ روایت سے انحراف کیا جا رہا ہو تو اہل علم پر کیا فرض عائد ہوتا ہے؟ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں غلط رسوم کے رائج ہونے کے اسباب پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اور بری رسوم کے پیدا ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کبھی وہ لوگ سردار ہوتے ہیں جن پر جزئی

رائیں غالب ہوتی ہیں اور مصالح کلیہ سے بعید ہوتے ہیں تو وہ درندوں کے سے کام کرنے لگتے ہیں...... ان کی وجاہت اور دبدبہ کی وجہ سے کوئی ان کو برا نہیں کہہ سکتا۔ اس کے بعد فاسق فاجر لوگ پیدا ہوتے ہیں وہ ان کی پیروی کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں اور ان اعمال کے پھیلانے میں بڑی کوشش کرتے ہیں اور پھر ایک قوم ایسی آتی ہے جن کے دلوں میں نہ اعمال صالحہ کا قوی میلان ہوتا ہے نہ اعمال فاسدہ کا پس اپنے رؤسا کی حالت دیکھ دیکھ کر ان میں بھی انہی امور کی آمادگی پیدا ہوجاتی ہے اور کبھی ان کو نیک باتوں کا پتہ ہی نہیں چلتا اور ایسے خاندانوں کے آخر میں ایسے لوگ باقی رہا کرتے ہیں جن کی فطرتیں درست ہوتی ہیں۔ وہ ان سے میل جول نہیں رکھتے اور غصہ کی حالت میں خاموش رہتے ہیں پس ان کی خاموشی سے بری رسمیں قائم اور مستحکم ہوجاتی ہیں۔ کامل العقل لوگوں کا فرض ہے کہ حق کے پھیلانے میں و جاری کرنے میں اور باطل کے نابود کرنے میں پوری کوشش کریں اور بعض اوقات یہ بات بغیر جھگڑے اور لڑائیوں کے ممکن نہیں ہوتی۔ پس یہ لڑائی جھگڑے تمام نیک کاموں میں افضل شمار ہوں گے۔" (حجۃ اللہ البالغہ مترجم جلد ا ص ۱۰۰)

ایک خاتون کو اسلامی مملکت میں حکومت کی سربراہ بنانا بھی ایک بری رسم ہے لیکن جو لوگ حضرت شاہ صاحب کے بقول "مصالح کلیہ سے بعید ہیں۔" وہ اس پر فخر کر رہے ہیں کہ پاکستان پہلا اسلامی ملک ہے جس نے تاریخ میں ایک خاتون کو وزیر اعظم بنانے کا شرف حاصل کیا۔ اگر ان حضرات کی نظریں دور رس ہوتیں تو ان کو صاف نظر آتا کہ یہ امر پاکستان کے لئے لائق فخر نہیں بلکہ لائق شرم ہے کہ اس نے قرآن و حدیث کی تصریحات کے خلاف اور امت اسلامیہ کے اجماعی فیصلے کے علی الرغم اسلامی تاریخ کی ایک مسلمہ روایت کو توڑنے کی جرأت کی ہے، پاکستان میں اس بدعت سیئہ کی اختراع اور منکر بری رسم کا اجرا ملت اسلامیہ کا سر شرم سے جھکا دینے کے لئے کافی ہے۔ اس بدعت کو جاری کرنے والے گنہگار ہیں اس برائی کا ازالہ ملت اسلامیہ کا فرض ہے اور اس برائی کے خلاف جہاد حضرت شاہ صاحب کے بقول افضل ترین عبادت ہے۔

ونعوذ باللہ من الحور بعد الکورومن امارۃ السفہا والنساء والغلمان وصلی اللہ تعالٰی علی خیر خلقہ سیدنا محمد النبی الامی والہ واصحبہ واتباعہ وبارک وسلم۔

انتخابات میں ووٹ کی شرعی حیثیت

از حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی

ووٹ کی اسلامی حیثیت

حمد وستائش اس ذات کے لئے جس نے اس کارخانہ عالم کو وجود بخشا اور درود وسلام اس کے آخری پیغمبر پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

پاکستان کی تیئس سالہ تاریخ میں عوام کو ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ انہیں اپنی مرضی سے اپنی حکومت منتخب کرنے کا اختیار نہیں ملا یہ شکایت بلاشبہ بجا اور برحق تھی یہ واقعہ ہے کہ قیام پاکستان سے لے کر اب تک انہیں غیر جانب دارانہ عام انتخابات کی سہولت میسر نہیں آسکی۔ دسمبر ۱۹۷۰ء کے مجوزہ انتخابات کے ذریعہ انہیں پہلی بار یہ موقع مل رہا ہے، ابھی تک الیکشن کے انتظامات میں جانب داری کا کوئی پہلو سامنے نہیں آیا لہٰذا جہاں تک ہمارا اندازہ ہے انشاء اللہ یہ انتخابات انتظامیہ کی سمت سے منصفانہ اور غیر جانبدارانہ ہی ہوں گے۔

ان حالات میں پورے ملک کی ذمہ داری عوام پر آپڑی ہے، اب اگر خدانخواستہ غلط اور نااہل قسم کے لوگ برسر اقتدار آئے تو اس کی پوری ذمہ داری عوام پر ہوگی اور اس موقعہ کے بعد حکام کا تمام تر عذاب وثواب ان لوگوں کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا جو حکام کو منتخب کر کے انہیں اقتدار تک پہنچائیں گے۔

حکومت پر تنقید ہر مہذب ملک میں عوام کا ناگزیر حق سمجھا جاتا ہے جو بہر قیمت باشندوں کو ملنا چاہئے، اس حق کی ضرورت وافادیت ناقابل انکار ہے۔ لیکن ہم نے ماضی میں اس حق کا غلط استعمال بھی کیا ہے ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اس حق کے استعمال کے بہانے خود اپنی بہت سی کمزوریوں کو چھپانے کی کوشش کی ہے اور اس پہلو سے بہت کم غور کیا ہے کہ ہمارے حکام بھی درحقیقت خود ہمارے کردار وعمل کا آئینہ ہوتے ہیں، سابق صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صاحب کا دور حکومت اپنی آمریت اور عوام کی حق تلفی کے لئے آج بہت بدنام ہے، اور

کوئی شک نہیں کہ اس کی بدعنوانیاں اسی لائق تھیں، لیکن اس دور کی بہت سی خرابیوں کی ذمہ داری خود ہم پر بھی عائد ہوتی ہے اگر ہم میں خوف، طمع اور ذاتی مفاد پرستی کے جذبات نہ ہوتے تو نہ یہ آمریت ہم پر دس سال تک مسلط رہ سکتی تھی اور نہ اپنے اقتدار کے سائے میں وہ گل کھلا سکتی تھی جنہوں نے ملک کو مادی اور اخلاقی تباہی کے کنارے پہنچا کر چھوڑا۔

وہ بلاشبہ قابلِ صد نفرین وملامت ہیں جو اپنی دولت کے سہارے ووٹ خرید خرید کر اقتدار تک پہنچتے ہیں، لیکن ان کے جرم میں وہ عوام بھی برابر کے شریک ہیں جو کھنکتے ہوئے سکوں کی آواز سن کر قوم، ملک دین اور اخلاق سب کو بھول جاتے ہیں اور پھر جب ان کے ووٹوں کے خریدار اقتدار کی کرسی پر بیٹھ کر سارے عوام کا خون نچوڑتے ہیں تو یہ اپنے گریبان میں منہ ڈالنے کے بجائے حکومت پر تنقید کے بہانے دولت کے کسی نئے سورج کی پرستش شروع کر دیتے ہیں۔

اب تک تو یہ خیر کہنے کی گنجائش بھی تھی کہ تیئس سال کی مدت میں ایسے انتخابات ہوئے ہی نہیں جن میں ملک کے تمام بالغ باشندوں کو اپنی رائے کا استعمال کرنے کا موقع ملا ہو، لیکن اگر دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات ٹھیک ٹھیک منعقد ہو گئے تو یہ کہنے کا بھی کوئی حق عوام کو نہیں رہے گا، اور اب جو حکومت بھی آئے گی اس کے تمام اعمال وافعال بجا طور پر خود ان ہی کی طرف منسوب ہوں گے، اور اب اگر حکومت نے لادینیت کو فروغ دیا، اسلام پر عمل جراحی کی، نظریہ پاکستان کو مٹایا، بداخلاقی پھیلائی، عریانی اور فحاشی کی حوصلہ افزائی کی، غریب عوام کے حقوق تلف کئے اور ملک وملت کا خون نچوڑا تو کم از کم باہر کی دنیا میں یہی سمجھا جائے گا کہ اس قوم کی اکثریت یہی کچھ چاہتی ہے، اور (حاکم بدہن) یہ پوری قوم ہی اخلاق باختہ اور قومی واجتماعی غیرت وحمیت سے خالی ہے۔

دوسری طرف اگر عوام نے اس مرحلے پر اپنی ذمہ داری کا خاطر خواہ احساس کیا، اور خوف وطمع کے محرکات کو قدموں تلے کچل کر پوری دیانت داری اور اجتماعی شعور کے ساتھ اپنے ووٹ کا استعمال کیا تو آنے والی حکومت گذشتہ تیئس سال کے نقصانات کی تلافی کر کے رفتہ رفتہ ماضی کے سرے داغ دھو سکتی ہے، اور اس صورت میں پوری دنیا پر یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ یہ قوم آزادی کی قدر پہچانتی ہے اور اس کا صحیح استعمال جانتی ہے۔

جب تک ہم پوری دنیا پر اپنے عمل سے یہ باور نہیں کرائیں گے کہ ہم ایک مکمل دین اور مستحکم نظام حیات رکھتے ہیں، اور دنیا کی کوئی طاقت ہمیں اپنے اس دین سے پھیر نہیں سکتی، اس وقت تک ہمارا ملک بیرونی سازشوں کی آماجگاہ بنا رہے گا، دنیا کی تمام طاقت ور قومیں ہمیں ایک بکاؤ مال سمجھ کر ہماری قومی تشخص، عزت اور آزادی کا نیلام کرتی رہیں گی، لیکن اگر ایک مرتبہ ہم نے اپنے عمل سے دنیا کو یہ بتادیا کہ کسی دنیوی مصیبت کا خوف یا کسی دنیوی آسائش کا لالچ ہمیں اپنے ضمیر کے خلاف زبان قلم یا قدم اٹھانے پر آمادہ نہیں کرسکتا تو یہ خارجی طاقتیں سازشوں کے جال ہزار بن لیں، اللہ کی نصرت سے ہم پر کبھی اپنا تسلط قائم نہیں کرسکیں گی۔

اس لحاظ سے آئندہ ماہ ہونے والے انتخابات عوام کے ہاتھ میں دودھاری تلوار بن کر آرہے ہیں، اگر ہم چاہیں تو اس سے اپنے دشمنوں کا خاتمہ کرکے امن وسکون حاصل کرسکتے ہیں، اور چاہیں تو اسی تلوار کو خود اپنے گلے پر چلا کر خود اپنا کام بھی تمام کرسکتے ہیں۔

ماضی کی گندی سیاست نے الیکشن اور ووٹ کے لفظوں کو اتنا بدنام کردیا ہے کہ ان کے ساتھ مکروفریب، جھوٹ، رشوت اور دغابازی کا تصور لازم ذات ہوکر رہ گیا ہے، اسی لئے اکثر شریف لوگ اس جھنجھٹ میں پڑنے کو مناسب ہی نہیں سمجھتے، اور یہ غلط فہمی تو بے حد عام ہے کہ الیکشن اور ووٹوں کی سیاست کا دین و مذہب سے کوئی واسطہ نہیں، اس سلسلے میں ہمارے معاشرے کے اندر چند در چند غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں، یہاں ان کا ازالہ بھی ضروری ہے۔

پہلی غلط فہمی تو سیدھے سادے لوگوں میں اپنی طبعی شرافت کی وجہ سے پیدا ہوئی، اس کا منشاء اتنا برا نہیں، لیکن نتائج بہت برے ہیں، وہ غلط فہمی یہ ہے کہ آج کی سیاست مکروفریب کا دوسرا نام بن چکی ہے، اس لئے شریف آدمیوں کو نہ سیاست میں کوئی حصہ لینا چاہئے، نہ الیکشن میں کھڑا ہونا چاہئے اور نہ ووٹ ڈالنے کے خرخشے میں پڑنا چاہئے۔

یہ غلط فہمی خواہ کتنی نیک نیتی کے ساتھ پیدا ہوئی ہو، لیکن بہرحال غلط اور ملک وملت کے لئے سخت مضر ہے، ماضی میں ہماری سیاست بلاشبہ مفاد پرست لوگوں کے ہاتھوں گندگی کا ایک تالاب بن چکی ہے، لیکن جب تک کچھ صاف ستھرے لوگ اسے پاک کرنے کے لئے آگے نہیں بڑھیں گے۔ اس گندگی میں اضافہ ہی ہوتا چلا جائے گا۔ اور پھر ایک نہ ایک دن یہ نجاست

خود ان کے گھروں تک پہنچ کر رہے گی۔ لہٰذا عقلمندی اور شرافت کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ سیاست کی اس گندگی کو دور دور سے برا کہا جاتا رہے عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ سیاست کے میدان کو ان لوگوں کے ہاتھوں سے چھیننے کی کوشش کی جائے جو مسلسل اسے گندا کر رہے ہیں۔

پھر آئندہ ماہ کے انتخابات محض چند انتظامی نوعیت کی تبدیلیوں کے لئے منعقد نہیں ہو رہے۔ یہ پورے ملک کی زندگی کا ایک انقلابی موڑ ہے جس میں ملک و ملت کی قسمت کا فیصلہ ہونا ہے، ان انتخابات میں دو مختلف نظریے اور دو متحارب نظام زندگی ٹکرائیں گے، ایک کا کہنا یہ ہے کہ پاکستان محض ایک معاشی ضرورت کے تحت بنا تھا، اس کا کوئی مستقل نظریہ نہیں ہے، اس کائنات پر حکومت انسانی خواہشات کی ہے، وہی اچھے برے کا فیصلہ کرے گی، اور وقت کے لحاظ سے زندگی کا جو دستور بھی سمجھ میں آجائے گا، اسی کے مطابق زندگی کو ڈھال لیا جائے گا، اور دوسرے اک دعویٰ یہ ہے کہ اس کائنات پر حاکمیت صرف اللہ کی ہے، اچھے برے کا فیصلہ کرنے والا وہی ہے، پاکستان اسی کے نام پر بنا تھا، یہاں اسی کا قانون چلے گا اسی کی بات مانی جائے گی، اور سیاست و معیشت سے لے کر پرائیویٹ زندگی تک ہر معاملے میں اسی کے احکام واجب الاطاعت ہوں گے۔

ان حالات میں جب کہ لڑائی اسلام اور لادینیت کی اور پاکستان کی بقاء وفنا کی ہے، کسی بھی باشعور شخص کے لئے غیر جانبدار رہنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، اس وقت ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنی ساری توانائیاں اسلامی قوتوں کو مدد پہنچانے میں صرف کرے، اس موقع پر خاموش بیٹھنا بھی ایسا ہی جرم ہے جیسا دشمن کو تقویت پہنچانا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔ **الناس اذاراو الظالم فلم یاخذوا علی یدیه اوشک ان یعمهم الله بعقاب** (جمع الفوائد ص ۲۵۱ بحوالہ ابوداؤد و ترمذی)

اگر لوگ ظالم کو دیکھ کر اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سب پر اپنا عذاب عام نازل فرمائیں۔

اگر آپ کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں کہ ظلم ہو رہا ہے، اور انتخابات میں سرگرم حصہ لے کر

اس ظلم کو کسی نہ کسی درجے میں مٹانا آپ کی قدرت میں ہے تو اس حدیث کی رو سے یہ آپ کا فرض ہے کہ خاموش بیٹھنے کے بجائے ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اس ظلم کو روکنے کی مقدور بھر کوشش کریں۔

بہت سے دین دار لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم اپنا ووٹ استعمال نہیں کریں گے تو اس سے کیا نقصان ہوگا؟ لیکن سنئے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں؟

حضرت سہیل بن حنیف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مسند احمد میں روایات ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من اذل عنده مومن فلم بنصره وهو يقدر على ان يصره ازله الله على رؤوس الخلائق (ایضاً ص ۵۱ ج ۲)

نصرت کرنے پر قدرت رکھنے کے باوجود اس کی مدد نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے بر سر عام رسوا کرے گا۔

شرعی نقطہ نظر سے ووٹ کی حیثیت، شہادت، گواہی کی سی ہے اور جس طرح جھوٹی گواہی دینا حرام اور ناجائز ہے اسی طرح ضرورت کے موقع پر شہادت کو چھپانا بھی حرام ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

ولا تكتموا الشهادة ومن يكتمها فانه اثم قلبه

اور تم...... گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو شخص اس گواہی کو چھپائے، اس کا دل گناہ گار ہے۔

اور جو حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من كتم شهادته اذا دعى اليها كان كمن شهد بالزور

(جمع الفوائد بحوالہ طبرانی ص ۶۲ ج ۱)

جس کسی کو شہادت کے لئے بلایا جائے پھر وہ اسے چھپائے تو وہ ایسا ہے جیسے جھوٹی گواہی دینے والا۔

بلکہ گواہی دینے کے لئے تو اسلام نے اس بات کو پسند کیا ہے کہ کسی کے مطالبہ کرنے سے پہلے ہی انسان اپنا یہ فریضہ ادا کردے، اور اس میں کسی کی دعوت یا ترغیب کا انتظار بھی نہ

19 کرے، حضرت زید بن خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا **الا اخبرکم بخیر الشهده الذی یاتی یشهادته قبل ان یسالها** (ایضاً ص ۲۶۱ ج ۱ بحوالہ مالک و مسلم وغیرہ)

کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ بہترین گواہ کون ہے؟ وہ شخص جو اپنی گواہی کسی کے مطالبہ کرنے سے پہلے ہی ادا کردے۔

ووٹ بلاشبہ ایک شہادت ہے قرآن وسنت کے یہ تمام احکام اس پر بھی جاری ہوتے ہیں، لہٰذا ووٹ کو محفوظ رکھنا دینداری کا تقاضا نہیں اس کا زیادہ سے زیادہ صحیح استعمال کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ یوں بھی سوچنے کی بات ہے کہ اگر شریف، دیندار اور معتدل مزاج کے لوگ انتخابات کے تمام معاملات سے بالکل یکسر ہوکر بیٹھ جائیں تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ وہ یہ پورا میدان، شیریروں، فتنہ پردازوں اور بے دین افراد کے ہاتھوں میں سونپ رہے ہیں، ایسی صورت میں کبھی بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ حکومت نیک اور اہلیت رکھنے والے افراد کے ہاتھ میں آئے، اگر دین دار لوگ سیاست سے اتنے بے تعلق ہوکر رہ جائیں تو پھر انہیں ملک کی دینی اور اخلاقی تباہی کا شکوہ کرنے کا بھی کوئی حق نہیں پہنچتا، کیونکہ اس کے ذمہ دار وہ خود ہوں گے اور ان کے احکام کا سارا عذاب وثواب ان ہی کی گردن پر ہوگا اور خود ان کی آنے والی نسلیں اس شر وفساد کسی طرح محفوظ نہیں رہ سکیں گی جس پر بند باندھنے کی انہوں نے کوئی کوشش نہیں کی۔

انتخابات کے سلسلے میں ایک دوسری غلط فہمی پہلی سے زیادہ سنگین ہے، چونکہ دین کو لوگوں نے صرف نماز روزے کی حد تک محدود سمجھ لیا ہے، اس لئے سیاست ومعیشت کے کاروبار کو وہ دین سے بالکل الگ تصور کرکے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سارے معاملات دین کی گرفت سے بالکل آزاد ہیں۔ چنانچہ بہت سے لوگ ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جو اپنی نجی زندگی میں نماز روزے کے اور وظائف واوراد تک کے پابند ہوتے ہیں، لیکن نہ انہیں خرید وفروخت کے معاملات میں حلال وحرام کی فکر ہوتی ہے، نہ وہ نکاح وطلاق اور برادریوں کے تعلقات میں دین کے احکام کی کوئی پروا کرتے ہیں۔

ایسے لوگ انتخابات کو بھی ایک خالص دنیاوی مواد سمجھ کر اس میں مختلف قسم کی بدعنوانیوں کو گوارا کر لیتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ ان سے کوئی بڑا گناہ سرزد ہوا ہے، چنانچہ بہت سے لوگ نہ ووٹ اپنی دیانتدارانہ رائے کے بجائے محض ذاتی تعلقات کی بنیاد پر کسی نااہل کو دے دیتے ہیں، وہ دل میں خوب جانتے ہیں کہ جس شخص کو ووٹ دیا جارہا ہے وہ اس کا اہل نہیں یا اس کے مقابلے میں کوئی دوسرا شخص اس کا زیادہ حق دار ہے لیکن صرف دوستی کے تعلق، برادری کے رشتے یا ظاہری مروت سے متاثر ہو کر وہ اپنے ووٹ کا غلط جگہ استعمال کر لیتے ہیں اور کبھی خیال بھی نہیں آتا کہ شرعی و دینی لحاظ سے انہوں نے کتنے بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے، جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، ووٹ ایک شہادت ہے۔

واذ قلتم فاعدلوا ولو کان ذاقربیٰ (اور جب کوئی بات کہو تو انصاف کو خواہ وہ شخص جس کے خلاف بات کہی جارہی ہے) تمہارا قرابت داری کیوں نہ ہوں۔

جب کسی شخص کے بارے میں ضمیر اور دریافت کا فیصلہ یہ ہو کہ وہ ووٹ کا مستحق نہیں ہے، یا کوئی دوسرا شخص اس کے مقابلے میں زیادہ اہلیت رکھتا ہے تو اس وقت محض ذاتی تعلقات کی بنا پر اسے ووٹ دے دینا ''جھوٹی گواہی'' کے ذیل میں آتا ہے قرآن کریم میں جھوٹی گواہی کی مذمت اتنی شدت کے ساتھ کی گئی ہے کہ اسے بت پرستی کے ساتھ ذکر فرمایا گیا ہے ارشاد ہے۔

''**فجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور**

پس تم پرہیز کرو بتوں کی نجاست سے اور پرہیز کرو جھوٹی بات کہنے سے وعیدیں اور حدیث میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع پر جھوٹی گواہی کو اکبر الکبائر میں شمار کر کے اس پر سخت وعیدیں ارشاد فرمائی ہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اکبر الکبائر (بڑے بڑے گناہ) نہ بتاؤں؟ (۱) اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا اور والدین کی نافرمانی اور خوب اچھی طرح سنو! جھوٹی گواہی، جھوٹی بات، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے تھے، جب جھوٹی گواہی کا ذکر آیا تو اٹھ کر بیٹھ گئے۔ اور ''جھوٹی گواہی'' کا لفظ بار بار ارشاد فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ ہم دل میں کہنے لگے کہ

کاش آپ خاموش ہو جائیں۔ (بخاری و مسلم جمع الفوائد ص ۱۶۲، ج ۲)

یہ وعیدیں تو صرف ووٹ کے اس غلط استعمال پر صادق آتی ہیں جو محض ذاتی تعلقات کی بناء پر دیا گیا ہو، اور روپے پیسے لے کر کسی نا اہل کو ووٹ دین میں جھوٹی گواہی کے علاوہ رشوت کا عظیم گناہ بھی ہے۔

لہٰذا ووٹ ڈالنے کے مسئلہ کو ہرگز یوں نہ سمجھا جائے کہ یہ ایک خالص دنیوی مسئلہ ہے اور دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں، یقین رکھئے کہ آخرت میں ایک ایک شخص کو اللہ کے سامنے کھڑا ہونا ہے، اور اپنے دوسرے اعمال کے ساتھ اس عمل کا بھی جواب دینا ہے کہ اس نے اپنی اس شہادت کا استعمال کس حد تک دیانت داری کے ساتھ کیا۔

بعض حضرات یہ بھی سوچتے ہیں کہ اگر نا اہل کو ووٹ دینا گناہ ہے تو ہم کون سے پاک باز ہیں؟ ہم صبح سے لے کر شام تک بے شمار گناہوں میں ملوث رہتے ہیں، اگر اپنے گناہوں کی طویل فہرست میں ایک اور گناہ کا اضافہ ہو جائے تو بھی کیا حرج ہے؟

لیکن خوب سمجھ لیجئے کہ یہ نفس و شیطان کا سب سے بڑا دھوکہ ہے، اول تو انسان اگر ہر گناہ کے ارتکاب کے وقت یہی کچھ سوچا کرے تو وہ کبھی کسی گناہ سے نہیں بچ سکتا، اگر کوئی شخص تھوڑی سی گندگی میں ملوث ہو جائے تو اس کو اس سے پاک ہونے کی فکر کرنی چاہئے نہ یہ کہ وہ غلاظت کے کسی تالاب میں چھلانگ لگا دے۔

دوسرے گناہ گناہ کی نوعیتوں میں بھی بڑا فرق ہے جن گناہوں کے نتائج بد پوری قوم کو بھگتنے پڑیں، ان کا معاملہ پرائیویٹ گناہوں کے مقابلے میں بہت سخت ہے، انفرادی نوعیت کے جرائم، خواہ اپنی ذات میں کتنے ہی گھناؤنے اور شدید ہوں، لیکن ان کے اثرات دو چار افراد سے آگے نہیں بڑھتے۔ اس لئے ان کی تلافی بھی عموماً اختیار میں ہوتی ہے، ان سے توبہ استغفار کر لینا بھی آسان ہے، اور ان کے معاف ہو جانے کی امید بھی ہر وقت کی جا سکتی ہے، اس کے برخلاف جس گناہ کا برا نتیجہ پورے ملک اور پوری قوم نے بھگتا ہو، اس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں، یہ تیر کمان سے نکلنے کے بعد واپس نہیں آ سکتا اس لئے اگر کسی وقت انسان اس بدعملی سے آئندہ کے لئے توبہ کر لے تو کم از کم ماضی کے جرم سے عہدہ برا

ہونا بہت مشکل ہے، اور اس کے عذاب سے رہائی کی امید بہت کم ہے۔

اس حیثیت سے یہ گناہ چوری، ڈاکہ، زنا کاری اور دوسرے تمام گناہوں سے شدید تر ہے۔ اور اسے دوسرے جرائم پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

یہ درست ہے کہ ہم صبح و شام بیسیوں گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں، لیکن یہ سب گناہ ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی وقت توبہ کی توفیق بخشے تو معاف بھی ہو سکتے ہیں اور ان کی تلافی بھی کی جا سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہم اپنی گردن ایک ایسے گناہ میں بھی پھنسا لیں جس کی تلافی ناممکن اور جس کی معافی بہت مشکل ہے۔

بعض لوگ یہ بھی سوچتے ہیں کہ لاکھوں ووٹوں کے مقابلے میں ایک شخص کے ووٹ کی کیا حیثیت؟ اگر وہ غلط استعمال بھی ہو جائے تو ملک و قوم کے مستقبل پر کیا اثر انداز ہو سکتا ہے؟

لیکن اول تو اگر ہر شخص ووٹ ڈالتے وقت یہی سوچنے لگے تو ظاہر ہے کہ پوری آبادی کوئی ایک ووٹ بھی صحیح استعمال نہیں ہو سکے گا۔ پھر ووٹوں کی گنتی کا جو نظام ہمارے یہاں رائج ہے۔ اس میں صرف ایک ان پڑھ جاہل شخص کا ووٹ بھی ملک و ملت کے لئے فیصلہ کن ہو سکتا ہے، اگر ایک بے دین، بدعقیدہ اور بدکردار امیدوار کے بیلٹ بکس میں صرف ایک ووٹ دوسروں سے زیادہ چلا جائے تو وہ کامیاب ہو کر پوری قوم پر مسلط ہو جائے گا۔ اس طرح بعض اوقات صرف ایک جاہل اور ان پڑھ انسان کی معمولی سی غفلت، بھول چوک یا بددیانتی بھی پورے ملک کو تباہ کر سکتی ہے اس لئے مروجہ نظام میں ایک ایک ووٹ قیمتی ہے اور یہ ہر فرد کا شرعی، اخلاقی، قومی اور ملی فریضہ ہے کہ وہ اپنے ووٹ کو اتنی ہی توجہ اور اہمیت کے ساتھ استعمال کرے جس کا وہ فی الواقعہ مستحق ہے۔ محمد تقی عثمانی

اسلامی مملکت میں حکومت الٰہیہ

از مولانا محمد متین الخطیب صاحب رحمہ اللہ

خطبہ ماثورہ کے بعد فرمایا!!!

آج دنیا میں اسلامی حکومتوں کی تعداد کافی ہے لیکن ایسی حکومت کوئی نہیں ہے جسے حکومت الٰہیہ کا نام سے جانا چاہئے اس لئے میں نے گزشتہ شمارہ میں ''البلاغ'' میں مملکت اسلامیہ کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اور جسے البلاغ والوں نے ازراہ کرم پورا کا پورا شائع کردیا جس کے بعد مختلف حضرات نے وضاحت طلب کی ہے جس کی وجہ سے اپنی ضعیفی اور کمزوری کے باوجود یہ وضاحت پیش کررہا ہوں۔

دراصل آج کل جب سے پاکستان کی موجودہ حکومت نے نفاذ اسلام کا بیڑہ اٹھایا ہے لوگوں میں کچھ ذہنی الجھنیں پیدا ہوگئی ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ انتظامی ادارے مختلف تضادات کا شکار ہیں اور جب عملی صورت سامنے آتی ہے تو لوگ حیران ہوکر پوچھتے ہیں کہ کیا یہی اسلام ہے جس کا ڈھنڈورا پیٹا جارہا ہے اب ذرا سمجھئے بنیادی بات یہ ہے کہ اس کائنات کا حقیقی خالق ومالک خدا ہے اسی کی مطلق حکومت ہے جس کے دو طریقے ہیں ایک تکوینی حکومت دوسرے تشریعی حکومت تکوینی حکومت کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کو بنانے اور پیدا کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے جس نے اپنی مخلوق اور کائنات کی فطرت بنیادی امور اور ایک ایسا مکمل نظام جاری فرمایا جس میں بال برابر کمی بیشی یا تبدیلی نہیں ہوئی اس کی حاکمیت کی باگ ڈور بھی حق تعالیٰ نے اپنے دست قدرت میں رکھی ہے اور ساری کائنات اس کی محکوم ہے انسان بھی اس کی مخلوق ہے جو اس لحاظ سے اشرف المخلوقات ہے کہ اس میں چند ایسی خوبیاں رکھی گئی ہیں جو دوسری مخلوقات میں نہیں ہیں مثلاً علم وحکمت اور قوت ارادی اور خیر وشر کی تمیز وغیرہ جس کے نتیجے میں وہ کائنات کے راز معلوم کرسکتا ہے اور اس میں اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر بڑے بڑے کام انجام دے سکتا ہے۔ اور خلافت الٰہیہ کا فریضہ بہ حسن وخوبی انجام دے سکتا ہے جس کے لئے اسے خدا نے چند قواعد وضوابط کا پابند کررکھا ہے جن کے تحت وہ جو کچھ کرتا ہے اسے حکومت تشریعی کہتے ہیں یہ نظام حکومت وحی الٰہی کے ذریعہ حق تعالیٰ نے انسان کے سپرد فرمایا ہے جو ہر دور میں انبیائے کرام

اور رسولان عظام لوگوں کو وحی الٰہی کی صورت میں بتلاتے رہے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں خداوند قدوس نے انسان کو زندگی بسر کرنے کے جو طور و طریقے بتلائے ہیں ان پر چلنا انسانی سعادت ہے اور ان کی خلاف ورزی کرنا شقاوت و نافرمانی ہے اسلام ایک نظریاتی اساس ہے مثلاً کائنات کے ہر حصے میں فرمانبرداری و تابعداری کارفرما ہے یہی مفہوم اسلام کا مفہوم ہے پھر انسان کو بھی اپنے تمام کاموں میں تابعداری اور فرمانبرداری کا عملی مظاہرہ کرنے کا حکم ہے یہ حکم انفرادی و اجتماعی طور پر دیا گیا ہے اور فرمان الٰہی ہے۔

وله اسلم من فی السموات والارض طوعا و کرھا (آل عمران:۸۳)

یعنی اسی خدا کی فرمانبرداری واطاعت آسمانوں اور زمین کے اندر سب پر ہے خواہ خوشی سے کریں یا زبردستی سے کریں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شرعی قوانین وہ ہیں جنہیں خدا نے نازل کیا ہے اور جن پر عمل کر کے اس کے آخری رسول نے دکھلا دیا ہے۔ یہ ہی قرآن وسنت کا مفہوم ہے، اس لحاظ سے اسلامی مملکت میں کسی کی رائے اور نظر حجت ہوسکتی ہے اور نہ اسے لوگوں کے لئے نافذ کیا جاسکتا ہے۔ اور نہ ہی اسلامی حکومت کا سربراہ ایسا کرنے کا مجاز ہے قرآن کریم میں واضح الفاظ میں حکم ہے **ان الحکم الا للہ** (سورہ یوسف آیت ۴۵) یعنی قانون اور حکم و فرمان صرف خدا کا چلے گا اس واضح حکم کے بعد بھی اگر کوئی عام آدمی یا سربراہ حکومت اپنی من مانی کرنا چاہتا ہے تو وہ کان کھول کر سن لے **من لم یحکم بما انزل اللہ فاؤلٓئک ھم الکافرون** (مائدہ آیۃ ۴۴) **ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاؤلٓئک ھم الظالمون** (مائدہ آیۃ ۴۷) **ومن لم یحک بما انزل اللہ فاؤلٓئک ھم الفاسقون** (مائدہ آیۃ ۴۷) ان آیات میں حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ہمارے نازل کردہ قوانین کے خلاف قانون جاری کرنے والا کافر۔ ظالم۔ فاسق ہی ہوسکتا ہے مسلمان نہیں ہوسکتا دراصل اللہ کی حاکمیت کے تحت انسان کی حاکمیت ہوسکتی ہے ورنہ نہیں۔ آپ یہ کہیں گے کہ دنیا میں تو سینکڑوں حکومتیں ایسی ہیں جو خدا کی حاکمیت کے خلاف ہیں یا انکار کرتی ہیں۔ مگر یہ بھی سوچئے کہ ایسی حکومتیں خود کو اسلامی حکومت شمار نہیں کراتیں اس لئے وہ اسلامی احکام کی پابند نہیں ہیں۔

الغرض حکومت الٰہیہ یا اسلامی حکومت کی کچھ ذمہ داریاں ہیں اور اس حکومت کے باشندوں کے کچھ فرائض ہیں اس طرح اسلام نے حقوق فرائض کے نام سے کچھ احکامات

بھی دیئے ہیں میرے خیال میں ہمارے معاشرے میں تمام خرابیوں کی بنیاد صرف یہ ہے کہ ہمیں اپنے حقوق تو یاد آتے ہیں لیکن ذہن کے کسی گوشے میں کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ ہم پر اسلامی مملکت کے کچھ فرائض اور ذمہ داریاں بھی ہیں ہر طبقہ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے انتہائی چابک دست ہے اس کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔ نعرہ بازی اور جلسے جلوس سے کام لیتا ہے مگر فرائض اور اپنی ذمہ داریوں سے چشم پوشی یا کنارہ کشی کر لیتا ہے یہ ہی وہ خرابی ہے جس کی طرف ہم توجہ نہیں دیتے، اس خرابی اور خطرناک ذہنیت کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے اس کش مکش کے لئے ایک متوازن حل یہ ہے کہ اسلام نے ہر شخص اور ہر طبقے کی ذمہ داریاں طے کر دی ہیں اب کام صرف یہ ہے کہ ہر ایک کو اس کی ذمہ داریوں اور فرائض کا احساس دلایا جائے اور بتلایا جائے کہ اسلام کی حکیمانہ تعلیم یہ ہے کہ فرائض کی ادائیگی کے بغیر حقوق ملنے کی توقع رکھنا غلط ہے مثلاً اسلام نے حاکم اور محکوم کے تعلقات پر واضح احکامات دیئے ہیں تا کہ دونوں کے تعلقات کو استوار رکھا جائے دونوں میں خوشگوار فضا پیدا کی جائے تا کہ مملکت کے نظام کو اندرونی خلفشار فتنہ وفساد اور ظلم وزیادتی آپس میں رسہ کشی وغیرہ سے محفوظ رکھا جا سکے حق تعالیٰ نے اسی لئے ہر فریق کو اس کے حقوق وفرائض بار بار یاد دلائے ہیں اور ساتھ ہی صبر وشکر کی تلقین بھی فرمائی ہے۔ مثلاً

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے خدا کی نافرمانی کی یہ ہی صورت حاکم وقت کی ہے وہ تو ایک ڈھال ہے جس کے زیر سایہ دشمن سے جنگ کی جاتی ہے اور مملکت کے لوگوں کا بچاؤ کیا جاتا ہے وہ اگر انصاف کرے گا تو ثواب کا مستحق ہوگا ورنہ عذاب الٰہی اس کے لئے تیار ہے، ایک اور حدیث میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نے فرمایا کہ اگر رعایا اپنے حاکم اعلیٰ سے کوئی ناپسندیدہ بات دیکھے تو اسے مطلع کرے اور صبر سے کام لے کیونکہ اس کے ذمہ اس کا فریضہ ہے اور تمہارے ذمہ تمہارا فریضہ ادا کرنا ہے اس قسم کی بہت سی آیات واحادیث ہیں جن میں معاملگی کا حکم ہے رعایا کے دکھ درد اور شکایات دور کرنے کی تلقین ہے اور واضح الفاظ میں بتلایا گیا ہے کہ جس حاکم کو حق تعالیٰ نے

کرسی عطا فرمائی ہے اگر وہ خیر خواہی کے ساتھ لوگوں سے پیش نہیں آتا تو اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے اور وہ جہنم کا حقدار ہے ایک اور حدیث میں حضرت عوف بن مالک سے روایت ہے تمہارے بہترین حکام وہ ہیں جنہیں تم پسند کرتے ہو اور وہ تم سے خوش ہیں اور بدترین وہ ہیں کہ تم جسے پسند نہ کرو اور وہ تم سے خوش نہ ہو اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ حاکم اور رعایا عدل وانصاف سے کام لیتے ہوں اسلامی حکومت کی بنیاد ہی عدل وانصاف پر قائم ہے قرآن حکیم میں جگہ جگہ عدل وانصاف پر زور دیا ہے اسی خوبی کی وجہ سے نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت وسیرت کو اسلامی نظام کا مستند حصہ تسلیم کیا ہے پھر رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جانشین خلفاء کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کو ضروری قرار دیا ہے حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں فرمایا ہے، دین وعبادت کا نظام وانتظام سنت رسول کی پیروی کے بغیر نہیں ہو سکتا اور سیاست کبریٰ (حکومت اسلامیہ) کا نظام خلفائے راشدین کی پیروی واتباع کے بغیر نہیں چلایا جا سکتا۔" (باب الاعتصام) ان حوالوں سے یہ معلوم ہوا کہ قیامت تک جو مسلم حاکم اولوالامر کے منصب پر فائز ہوں گے ان کا یہ فریضہ منصبی ہوگا کہ وہ شرعی قوانین اور حدود وتعزیرات اسلامی کو قائم کریں اگر وہ اس میں کوتاہی کریں گے تو لوگ انہیں نکال باہر کر دیں گے اور وہ آخرت کے مواخذہ سے نہ بچ سکیں گے غرض قرآن وسنت کے احکام کا جس قدر احترام ہو سکتا ہے وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور بعد میں آپ کے صحیح جانشین حضرات نے بھی اس کا خیال رکھا اصل بات یہ ہے کہ کرسی اقتدار پر قرآن جلوہ افروز ہوتا ہے تو بے لاگ عدل وانصاف کی کارفرمائی ہوتی ہے قرآن کے عادلانہ نظام کے سامنے سب شاہ وگدا برابر ہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی قرآنی احکام اور حدود اللہ کی بے حرمتی کی ہو اس کا تو خیال ہی نہیں آ سکتا اس کے برخلاف حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذاتی معاملات میں بھی اس کے احترام کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہے یہ ہی حال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا۔ حضرت کرم علی کرم اللہ وجہہ نے احکام شرعیہ میں فرمایا ہے اگر ضرورت پڑے تو مسلم حکمرانوں پر حدود قائم کرنا جہاد فی سبیل اللہ کے برابر ہے فقہاء نے لکھا ہے کہ حکومت اسلامیہ پر بغیر کسی دوسرے کے دعویٰ کئے حدود اللہ جاری کرنا واجب ہے اسی طرح جرائم پر شہادتیں قائم کرنا واجب ہے یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ حکومت اسلامیہ دراصل حکومت الٰہیہ ہوتی ہے البتہ اس حکومت کا اجراء اللہ

تعالیٰ اوراس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں اور اطاعت گزاروں کے ہاتھ سے کرایا جاتا ہے چند ضوابط واصول اور شرائط اس کے لئے قرآن وسنت میں مقرر ہیں جن کا احترام اور لحاظ رکھنا ضروری ہے اس طرح حاکمیت کو اس کے خالق و مالک اور صاحب اختیار وقدرت کی صورت میں روشناس کراتا ہے اور انسانوں کی حاکمیت کو خدا کے تابعداروں اور ماننے والوں کی خلافت و حکومت الٰہیہ کے رنگ میں پیش کرتا ہے کسی شاعر نے کہا ہے

درحقیقت مالک ہر شے خدا است　　　　ایں امانت چند روزہ نزد ما است

اور یہ ہمارا دینی عقیدہ بھی ہے کہ حکومت اسلامیہ ہمارے پاس خدا کی امانت ہے اور امۃ اسلامیہ کو آزادانہ طور پر حکومت چلانے کا حق ہے بشرطیکہ ان حقوق وفرائض کا خیال رکھا جائے جو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لئے مقرر فرمادیئے ہیں اسلامی حکومت میں کسی فرد کسی گروہ کسی پارٹی ڈکٹیٹر کو یہ حق ہرگز ہرگز نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی مرضی سے آئے دن قوانین نافذ کرتے رہیں بلکہ قرآن وسنت کو بنیاد بنا کر فقہاء اور اسلامی قوانین کے جاننے والے لوگ دلائل شرعی کے ساتھ کوئی قانون بنا سکتے ہیں جسے ہر دور میں پرکھا جائے گا کہ اس سے عوام کو کس قدر فائدے حاصل ہوتے ہیں اور کہیں وہ اسلام کی بنیادی اساس کے لئے نقصان دہ تو نہیں ہورہا ہے اگر ایسا ہے تو علماء اور فقہائے دین اسلام اس پر غور کرکے قیاس و اجتہاد سے اس قانون کو مسترد کرسکتے ہیں مختصر یہ ہے کہ حاکمیت مسلم بھی ایک حاکمیت الٰہیہ ہوسکتی ہے اگر ایسا نہیں ہے تو وہ ایک خطرناک صورت ہوسکتی ہے جو ڈکٹیٹر شپ میں تبدیل ہوجائے گی جس کی وجہ سے کچھ علماء سو نے خائن وظالم سلاطین کی ہمنوائی کرکے پچھلے زمانوں میں اسلام کو ایسا نقصان پہنچایا ہے کہ آج تک اس کی تلافی نہیں ہوسکی اس کے نتیجے میں غیر مسلم طبقے اور خود اسلام سے ناواقف مسلم طبقات بھی اسلامی احکام کا مذاق اڑاتے ہیں آج بھی ہمارے وہ نوجوان جو اسلام سے بے بہرہ ہیں پوچھتے ہیں کہ کیا عوام اور نوجوان نسل موجودہ دور میں اسلامی قوانین سے مستفیض ہوسکتے ہیں آج ہم اس کا جواب صحیح اور موثر طریقہ پر اسلامی قوانین کو نافذ کرکے ہی دے سکتے ہیں جس کے لئے مسلمانوں کو آگے بڑھ کر قرآن وسنت پر خود عمل کرکے دکھانا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

اسلامی حکومت کا بنیادی اصول شوریٰ

یہ مقالہ حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے

نفاذ شریعت کے بین الاقوامی سیمینار منعقدہ اسلام آباد میں پڑھا

اسلامی حکومت کے اصول و مبادی بہت سے ہیں اس مختصر وقت میں ان سب کے بارے میں کچھ کہنا دشوار ہے دوسرے اصولوں کے متعلق دیگر فضلاء گرامی اپنے خیالات پیش کریں گے میں اس موقعہ پر اسلامی حکومت کے اصول شوریٰ کے بارے میں عرض کرنا چاہتا ہوں اور وہ بھی اختصار کے ساتھ کیونکہ عام مشاہدہ ہے کہ اس طرح کے اجتماعات میں کسی طویل مقالہ کا پڑھنا ممکن نہیں ہوتا۔

شوریٰ درحقیقت رائے عامہ کے اظہار کا نام ہے مفردات القرآن میں امام راغب اصفہانی نے تصریح کی ہے کہ شوریٰ کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کی رائے معلوم کی جائے اور یہی اصول ہے جو موجودہ زمانے کے پارلیمانی نظام کی بنیاد ہے اور جس کی داغ بیل اسلام نے اس وقت ڈالی تھی جب کہ یورپ جمہوریت اور پارلیمنٹ کے مفہوم سے بھی ناآشنا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا **وشاورھم فی الامر** (یعنی حکومت کے معاملات میں نظام شوریٰ اختیار کیجئے) اور مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے بارے میں یہ اصول طے کر دیا گیا کہ **امرھم شوریٰ بینھم** یعنی ان کے تمام کام شوریٰ کے ذریعہ انجام پاتے ہیں۔

اسلامی قانون کے ماہرین اور علماء اسلام کے نزدیک یہ بات طے ہو چکی ہے کہ شوریٰ اسلامی حکومت کی اساس اور اس کے فیصلوں کی بنیاد ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نقل کرتے ہیں کہ جب شوریٰ کا حکم آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ شوریٰ سے مستغنی ہے مگر یہ حکم امت کے لئے رحمت ہے اور جو اس حکم پر عمل کرے گا وہ اعلیٰ درجہ کی راہ نمائی سے محروم نہ ہوگا۔ اور جو شوریٰ کو ترک کرے گا وہ غلط روی سے بچ نہ سکے گا۔ (روح المعانی)

ابن جریر کی روایت ہے۔ قتادہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی نازل ہونے کے باوجود اپنے اصحاب سے مشورے کا حکم ملتا تھا اور یہ اس لئے تھا کہ قوم کو پورا اطمینان حاصل ہوجائے اور یہ کہ شوریٰ امت کے لئے قانون بن جائے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جو اپنے رفقاء سے مشورہ کرنے میں اتنا زیادہ سرگرم ہو جس قدر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ (ترمذی)

اسی مفہوم کی حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بھی مروی ہے ایک مرتبہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تحریری طور پر ہدایت کی کہ رسول اللہ صلعم قانون شوریٰ پر عامل تھے تم بھی لازماً اس پر عمل کرنا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ حضرت عمر کے تعامل سے یہ بات ثابت ہے کہ وہ عورتوں سے بھی مختلف معاملات میں رائے لیتے تھے۔ (تفسیر مظہری جلد دوم ص ۱۶۱)

مولانا ثناء اللہ پانی پتی نے ضحاک کا ایک بیان نقل کیا ہے کہ فاروق اعظم نے عورتوں کو بھی حق رائے دہی دیا تھا۔ ان امور کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ امیر کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے لئے ایک مجلس شوریٰ بنائے کیونکہ ایک شخص ہر معاملہ میں اتنی واقفیت اور معاملہ مہارت نہیں رکھتا جتنا معاشرہ کے دوسرے افراد رکھتے ہیں مکی دور میں اجتماعی مشوروں کے لئے دارارقم کو مجلس شوریٰ کا ایوان بنایا گیا تھا۔ مدنی دور میں حضور کے زمانہ تک کھلے میدانوں کو بھی اس مقصد کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ اور مسجد نبوی میں اس طرح کے اجتماعات ہوتے تھے خلافت راشدہ میں سب سے پہلے سقیفہ بنی ساعدہ سے ایوان شوریٰ کا کام لیا گیا۔

جب اسلامی حکومت کے اصول اور اساس کی حیثیت سے شوریٰ کا مسئلہ زیر بحث آتا ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امیر حکومت یا خلیفہ وقت یا امام المسلمین شوریٰ کے فیصلے کا پابند ہے یا نہیں۔ ہم اپنے اس مقالہ کو اس بحث پر مرکوز کرنا چاہتے ہیں اور یہ اس لئے کہ اسلامی نظام حکومت میں امیر کی حیثیت کے نزدیک آمر مطلق یعنی ڈکٹیٹر کی ہوجاتی ہے۔ اور شوریٰ کی حیثیت اور اہمیت صفر کے درجہ میں پہنچ جاتی ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے اسلامی حکومت شوریٰ حکومت اور امام اس کا بااختیار رہنما اور صاحب تنقید قوت ہے۔ اس لئے

قدرتاً امام شوریٰ کے اختیارات کے نمائندہ ہے۔ اور انتظامی معاملات میں مجلس شوریٰ کے فیصلوں کا ترجمان۔ قرآن کریم میں ہے۔ **امرھم شوری بینھم** یعنی مسلمانوں کے معاملات اور انتظامی امور آپس کے مشورہ سے انجام پاتے ہیں یہ حکم عام ہے اور حکومت کے صدر نشیں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مجلس شوریٰ کے فیصلہ دینے کے بعد اپنی کسی ذاتی رائے پر عمل کرے جو مجلس شوریٰ کے فیصلہ کے خلاف ہو حکومت کے امیر اور سربراہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ ارباب حل وعقد سے مشورہ لے اور اس مشورہ کی پابندی کرے۔

بہت سے حضرات کو قرآن مجید کی ایک دوسری آیت سے غلط فہمی ہوتی ہے اور انہوں نے اس سے غلط نتیجہ نکالا ہے وہ آیت یہ ہے **وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ** یعنی معاملات میں اپنے اصحاب سے مشورہ کرلیا کیجئے اور جب معاملہ متعلقہ میں عزم کرلیں تو اعتماد خدا ہی پر رکھئے۔

ان الفاظ سے بہت سے لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوگیا کہ مشورہ کرنا تو امام کے لئے ضروری ہے مگر مشورے کی پابندی ضروری نہیں ہے۔ آیئے غور کریں کہ عزم سے پیدا ہونے والی رائے شوریٰ کے فیصلے کی پابند ہے یا نہیں۔ غور فرمایئے کہ قرآن میں شوریٰ کو پہلے ذکر کیا گیا ہے اور عزم کو بعد میں اس لئے منشاء اور مقصد یہ ہے کہ کسی معاملہ کو طے کرنے کے لئے مجلس شوریٰ کو طلب کیا جائے۔ اور مجلس جو فیصلہ کردے وہ عزم کی بنیاد بن جائے ظاہر ہے کہ اگر امیر یا امام شوریٰ کے فیصلہ کو نظر انداز کردیا کرے گا اور ذاتی وشخصی رائے پر عمل کرتا رہے گا تو یہ بات مجلس شوریٰ کے لئے ازالہ حیثیت عرفی کے مترادف ہوگی۔ اور ایسے امیر اور ایک ڈکٹیٹر کے درمیان کیا فرق رہ جائے گا دوسری بات یہ ذہن میں رکھنے کی ہے اس آیت میں خطاب بطور خاص رسول کریم صلعم سے ہے اور پیغمبر کے احکام شوریٰ کے باوجود بھی واجب التعمیل ہوتے ہیں۔ کیونکہ پیغمبر کی ایک حیثیت تو یہ ہوتی ہے کہ اس زمین پر خدا کی آواز ہوتی ہے اس آیت کی رو سے کسی صدر حکومت کو وہ اختیارات حاصل نہیں ہوتے جو آپ کی ذات کو مخاطب کرکے آپ کے ساتھ مخصوص کردیئے گئے ہوں۔ ہمارا مقصد اس بحث سے یہ ہے کہ اس بات سے اگر کسی کو انکار ہے کہ عزم کا تعلق مجلس شوریٰ کے فیصلہ سے

بھی ہے تو بھی یہ بات نظر انداز کرنے کی نہیں ہے کہ یہ حکم پیغمبرانہ حیثیت کی وجہ سے آپ کے ساتھ مخصوص ہے۔ **امرھم شوریٰ بینھم** یعنی مسلمانوں کے کام شوریٰ سے طے پاتے ہیں قرآن میں یہ الفاظ ایک مستقل دفعہ کی صورت میں موجود ہیں اور اس کے خلاف کسی حکومت کا کوئی امیر حرکت نہیں کرسکتا۔ چنانچہ ابن کثیر نے آیت عزم کی تشریح کرتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کیا گیا کہ عزم سے کیا مراد ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا۔

مشاورۃ اھل الرای ثم اتباعھم

یعنی اہل الرائے کا باہمی مشورہ اور اس کے بعد شوریٰ کے فیصلہ کی پیروی تو عزم حقیقت میں وہ ارادہ ہے جو امام کے دل میں شوریٰ کے فیصلہ پر کاربند ہونے کے لئے پیدا ہوتا ہے۔ اسی آیت عزم کے سلسلہ میں احکام القرآن میں امام ابوبکر الجصاص نے واضح طور پر لکھا ہے **وفی ذکر العزیمۃ عقیب المشاورۃ دلالۃ علی انھا صدرت عن المشورۃ** یعنی قرآن میں عزم کا ذکر شوریٰ کے بعد آیا ہے۔ اور یہ اس کی دلیل ہے کہ فیصلہ اور عزم وہی معتبر ہے جو شوریٰ کے فیصلہ کا نتیجہ ہو اور شوریٰ سے صادر ہوا ہو۔ حافظ ابن کثیر نے بھی یہی لکھا ہے۔ ان تمام تصریحات کے بعد امام کے شخصی فیصلہ کو شوریٰ کے فیصلہ پر ترجیح دینا درست نہیں ہوگا۔

اگر کسی کا ذہن ان تصریحات سے مطمئن نہیں ہوتا ہے اور اس کا یہ اصرار قائم رہتا ہے کہ امام کے شوریٰ کے فیصلہ کے پابند ہونے پر کوئی صراحۃ النص موجود نہیں ہے تو وہ اس بات کا اقرار کم سے کم کریں گے کہ اس دائرہ خاص میں کوئی واضح اور متعین حکم موجود نہیں ہے۔ ان اصحاب کے لئے اکیلے سوچنے کی بات یہ ہے کہ نبوت اور خلافت راشدہ کے عہد کو چودہ سو سال گزر چکے ہیں۔ خلفائے راشدین کا درجہ تو بہت اونچا ہے اب جو لوگ مسلمانوں میں ہیں وہ تقویٰ، خوف خدا اور احساس ذمہ داری میں ان کے خاک پا کے برابر بھی نہیں۔ کیا ایسے معاشرہ میں کسی فرد واحد کو بے لگام اور مطلق العنان بنا دینا درست ہوگا کیا تنہا ایک فرد کو ارباب حل وعقد کے فیصلوں سے آزاد اور مسلمانوں کے معاملات کا تنہا ذمہ دار بنا دینا مناسب ہوگا۔

بعض لوگوں کو اس معاملہ میں جو غلط فہمی ہوتی ہے اور انہوں نے سربراہ حکومت کو مختار

مطلق مان لیا ہے۔ اس کی وجہ سیرت و تاریخ کے تین واقعات ہیں جنہیں صحیح ڈھنگ سے نہیں سمجھا گیا ایک صلح حدیبیہ کا واقعہ دوسرے حضرت ابوبکر کا جیش اسامہ کو رخصت کرنا تیسرے مرتدین زکوٰۃ کے بارے میں آپ کا عمل۔

اس سے پہلے کہ ان تینوں واقعات کی صحیح تصویر پیش کی جائے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علماء اسلام کی ایک تصریح کا پھر سے ذکر کر دیا جائے کہ پیغمبر اسلام صلعم اور دنیا میں دو قسم کی ذمہ داریوں پر فائز تھے۔ نمبر ایک منصب رسالت، دوسرے منصب امامت، یہی ذمہ داریاں ہیں جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز میں فرق پیدا ہو جاتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم منصب رسالت کا کام خدا کے حکم کے مطابق ادا کرنے کے لئے آپ مشورہ تو کر لیتے تھے لیکن یہ مشورہ لینا صرف تعلیم امت کے لئے تھا۔ مشورہ طلب کرنا اور اس پر عمل کرنا ضروری نہ تھا۔ یہاں صرف خدا کا حکم واجب التعمیل ہوتا تھا۔ البتہ اس متعین شکل کے علاوہ آپ نے کبھی اپنے عزم کو شوریٰ کے خلاف استعمال نہیں کیا۔ شوریٰ کی پابندی کرنے کی مثالیں سیرت میں بہت سی ہیں مثال کے طور پر آپ کا اپنی خواہش کے علی الرغم مدینہ سے باہر نکل کر ۳ھ میں جنگ کرنا جو غزوہ احد کے نام سے مشہور ہے اور غزوۂ بدر کے موقعہ پر بھی آپ نے اپنی خواہش کے خلاف دوسروں کے مشورہ پر ایک دوسری جگہ محاذ قائم کیا۔

اب صلح حدیبیہ کے واقعہ کو لیجئے یہ ان واقعات میں سے ہے جن کو امام کے اختیار مطلق کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ صلح عام رائے کے خلاف صرف پیغمبرانہ ذمہ داری کے ماتحت ہے چنانچہ رائے عامہ بڑی چیز ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی مرضی ہر چیز سے بلند و بالا ہے جب عام لوگوں نے یعنی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس صلح پر اپنی ناراضی کا اظہار کیا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں خدا کا رسول ہوں میں اس کے حکم کے خلاف کچھ نہ کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ خدا میرے ثمرے کو ضائع نہیں کرے گا۔ ان الفاظ سے یہ بات ظاہر ہے کہ رائے عامہ کے احتجاج کو آپ نے کس لئے نظر انداز کر دیا۔

دوسرا واقعہ جیش اسامہ کا ہے جو ہجری ۱۱ میں پیش آیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ صدیق اکبر

رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت اسامہ کی فوج کو شام کے محاذ پر روانگی کا حکم دیا۔ حالانکہ اسلامی حکومت کا پایہ تخت مدینہ قبائل کی بغاوت کی وجہ سے سخت خطرات سے دوچار تھا۔ اور صحابہ کا مشورہ یہ تھا کہ اس وقت اس فوج کو باہر نہ روانہ کیا جائے۔ اس واقعہ سے امیر وقت کو آمر مطلق قرار دینا تاریخ کے واقعہ کی غلط تعبیر ہوگی اس معاملہ میں صدیق اکبر نے جو کچھ بھی کیا۔ اس میں مطلق العنانی کو ذرا بھی دخل نہیں تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ یہ وہ فوج ہے جس کو محاذ پر جانے کے لئے حکم خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے۔ اور اس لشکر کو بھیجنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری وصیت اور آخری حکم پر عمل کرنا ہے اور صحابہ کے مشورہ کے مقابلہ میں پیغمبر کا حکم زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

تیسرا واقعہ مانعین زکوٰۃ کے خلاف حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عملی جہاد ہے آنحضرت کی وفات کے بعد مدینہ کے اطراف میں زکوٰۃ کی ادائیگی کے خلاف بغاوت پھیل گئی لوگوں کا کہنا تھا کہ نماز تو ہم پڑھیں گے لیکن زکوٰۃ نہیں ادا کریں گے۔ لوگوں نے یہ مشورہ دیا کہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ تحمل سے کام لیا جائے اور مانعین زکوٰۃ سے کوئی تعرض نہ کیا جائے صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس مشورہ کو رد کر دیا اور انہوں نے شوریٰ کے ارکان کو یاد دلایا کہ زکوٰۃ خدا کے حکم سے واجب ہے اور خدائی احکام میں شوریٰ کو کمی بیشی کا اختیار نہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تقریر کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی شرح صدر ہو گیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے صحیح ہے۔ اور اللہ نے ان کا دل جہاد کے لئے کھول دیا ہے اس بارے میں علامہ نووی نے شرح مسلم میں بحث کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تقریر کے بعد صحابہ ان کی دلیل کے قائل ہو گئے تھے۔

یہ بڑی نادانی ہوگی کہ صدیق اکبر لوگوں کے سامنے شریعت کے اصول پیش کر رہے ہوں اور اس واقعہ کو سامنے رکھ کر کچھ یہ بات دماغوں میں بٹھانے کی کوشش کریں کہ خلیفہ اول شوریٰ کے فیصلوں کو رد کر کے اپنی شخصی عزم پر عمل کرنے کے عادی تھے اور مطلق العنان آمر کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔

اسلام نے جمہوریت کا جو مزاج بنایا ہے، وہ آج بھی دنیا کی قوموں کے لئے نمونہ اور نشان راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آج مدتوں کے بعد دنیائے اسلام میں اسلامی نظام کو اپنانے اور غیر اسلامی نظاموں کو رد کرنے کی خوش آئند اور خوشگوار لہر چل پڑی ہے اس لئے اسلامی نظام کے مطابق دستور سازی کے مرحلے پیش آئیں گے اور دستور سازی میں یہ مسئلہ یقیناً اہمیت رکھتا ہے۔ کہ سربراہ حکومت اپنی شوریٰ کا پابند ہے یا شوریٰ کے فیصلہ سے آزاد ہے یہ باتیں جو گوش گزار کی گئی ہیں امید ہے کہ بہت سے دماغوں پر دستک دیں گی اور اہل الرائے اس کے بارے میں غور و فکر سے کام لیں گے۔ وما علینا الا البلاغ۔

تمت بالخیر

بحمد اللہ